مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com
ذات کا سفر
قیصرہ حیات

تعارف

یہ ناول ''بارش کے بعد'' (افسانوں کا مجموعہ) میری دوسری کاوش ہے مگر حقیقت میں یہ میری پہلی کتاب ہے کیونکہ اسی سے میں نے باقاعدہ طور پر لکھنے کا آغاز کیا چونکہ موضوع بہت منفرد اور وسیع تھا اس لیے اس ضمن میں تحقیق بھی کرنا پڑی جس نے کافی وقت لے لیا اور تقریباً تین سال اسے مکمل ہونے میں لگ گئے اور اسی دوران میں نے ''بارش کے بعد'' لکھی چونکہ وہ مکمل طور پر تخلیقی مواد پر مشتمل تھی اس لیے جلد مکمل ہو گئی۔

ہر تخلیق کے پیچھے کچھ ایسے ٹھوس حقائق و واقعات وحوادث کارفرما ہوتے ہیں جو تخلیق کار کے ذہن اور اس کی سوچ پر کچھ اس طرح حاوی ہوتے ہیں کہ بعض اوقات نادانستہ طور پر وہ ایسے مواد کی صورت میں جمع ہوتے رہتے ہیں جو بعد میں کسی تخلیق یا تخلیقی عمل میں بہت بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیا جائے کہ کائنات اور اس کی اشیاء و واقعات کا انسانی سوچ پر اثر انداز ہونا، قدرت کی اس زبردست منصوبہ بندی کا حصہ ہے جس کی وضاحت کے لیے شاید الفاظ کم پڑ جائیں مگر اس عظیم تخلیق کار کی کاریگری و کرشمہ سازی کو بیان نہ کیا جا سکے جس نے نہایت باریک بینی سے ان کا تانا بانا بُنا ہے۔

اس کتاب کا محرک میری ایک روحانی بزرگ سے ملاقات تھی جو اب وفات پا چکے ہیں اور جن کی ذومعنی باتیں، مشاہدہ اور روحانی اندازِ بیان بہت متاثر کن تھا جس نے میرے اندر سوچ کے نجانے کتنے در وا کر دیئے اور میں ایسے دوراہے پر کھڑی ہو گئی جہاں سے خدا، کائنات اور انسان کی طرف حیران کن نگاہوں سے دیکھنے لگی اور نادانستہ طور پر وہ مواد میرے ذہن میں جمع ہوتا رہا جو اس تخلیق کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس کے اہم کردار میاں جی، کی صورت میں ان بزرگ کی گوناگوں شخصیت مجتمع ہوتی گئی۔

چونکہ اس ناول کا موضوع قدرے منفرد اور وسیع تھا اس لئے آغاز میں قلم اٹھاتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا تھا ایک تو میں ادبی میدان میں بالکل نووارد تھی دوسرا موضوع جہاں منفرد تھا وہاں مشکل بھی تھا لیکن اللہ کا شکر ہے جس نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور یہ ناول پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

اس ناول کا موضوع درحقیقت انسان کی ذات ہے کہ کس طرح اس کے اندر شعور، احساسات اور جذبات کا ایک جہان آباد ہے جو لحہ بہ لحہ باہر کی کائنات، اس میں رونما ہونے والے واقعات اور اس کے حوادث سے متاثر ہوتا رہتا ہے نہ صرف یہ بلکہ ہر انسان اپنے اندر اپنی ایک کائنات رکھتا ہے جو اس کی اپنی سوچ پر مبنی ہے اور جو دوسرے انسان سے اتنی ہی مختلف ہے جتنا کہ وہ خود۔ چنانچہ انسان کی ذات کو جب موضوع تحریر بنایا تو ان ادوار کا تذکرہ بھی بہت ضروری تھا جو ایک تاریخ کی صورت میں آج کے انسان میں محفوظ ہیں۔ آج کا انسان صرف گوشت پوست، شخصیت، ڈیل ڈول اور نفسیات و احساسات و جذبات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کے اندر ذہنی، نفسیاتی و روحانی ارتقاء ان تمام عوامل و عناصر کے مرہون منت ہیں جنہوں نے رفتہ رفتہ اس کی سوچ پر اثر ڈالا اور آج کے انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنے شعور، ان ادوار اور کائنات کے تمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی ذات کی حقیقت کے بارے میں سوچے اور اپنے لیے ٹھیک اور واضح راستہ متعین کرے۔

اسی لیے اس ناول کو میں نے دو حصوں میں لکھا ہے۔

پہلا حصہ استعاراتی طور پر لکھا گیا ہے جس میں چیدہ چیدہ ان ادوار اور ان طاقتوں کا ذکر ہے جنہوں نے انسانی شعور کو پختگی عطا کی چنانچہ حصہ اول میں تمام ابواب کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

پہلا باب، انسانی زندگی کی ابتداء کے بارے میں ہے جب وہ ایک پرسکون مثالی زندگی گزارتا تھا۔ دوسرا باب، زمین پر انسانی زندگی کے ظہور کے بارے میں ہے جب انسان کو حیوان سے منسوب کیا جاتا رہا۔ تیسرا باب، آگ کی زبردست قوت کے بارے میں ہے جو بیک وقت تحفظ کی علامت بھی ہے اور تباہی و بربادی کی بھی۔ چوتھا باب، انسانی وجود کے ارتقاء کے بارے میں ہے کہ اس کے اندر قدرت نے ایسی مخفی قوتیں

رکھی ہیں جس سے وہ خود بھی نا آشنا تھا مگر جب رفتہ رفتہ ان قوتوں کا سراغ لگایا تو اس پر ترقی کے راستے کھلنے لگے۔ پانچواں باب، اس عظیم مادی طاقت کے بارے میں ہے جو انسانی تاریخ میں ترقی کا سب سے بڑا مخزن ثابت ہوا یعنی ''لوہا'' قدرت کی ایسی کارآمد و قیمتی دھات جس سے انسان جابجا نت نئی ایجادات میں مصروف ہوگیا اور ابھی تک تمام ایجادات میں یہ دھات استعمال ہوتی آرہی ہے۔

چھٹا باب، انسان جسے اشرف المخلوقات کے درجے سے نوازا گیا ہے اس کو اس کائنات میں اپنے مقام اور حیثیت کا اندازہ بھی ہونا چاہیے چنانچہ انسان کو تنبیہاً یاد دلایا گیا ہے کہ وہ اپنی ابتداء کو نہ بھولے۔ وہ کہاں سے آیا ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔

ساتواں باب، انسان کے اندر موجود شر کی ایک زبردست قوت کے بارے میں ہے۔ انسان چونکہ شر و خیر کا مجموعہ ہے اور شر کا زبردست اظہار اس درندگی اور حیوانیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب ایک انسان دوسرے انسان کو ناحق قتل کرتا ہے اور جس کا انجام ہمیشہ ہی ذلت و رسوائی کی صورت میں نکلتا ہے۔ مگر جس کا مادہ بدرجہ اتم انسان میں موجود ہے۔

آٹھواں باب، شر کی دوسری صورت یعنی جعلسازی، دھوکہ دہی پر مبنی ہے جس میں انسان دوسرے انسان کو ناحق نقصان پہنچاتا ہے اور جس کا انجام بھی نقصان و خسارے کی صورت میں نکلتا ہے، چنانچہ شر کی دونوں صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حصہ دوم، میں ان تمام واقعات اور حوادث کا ذکر کیا گیا ہے جو رفتہ رفتہ انسان کی سوچ، نفسیات و احساسات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بالآخر اس روحانی ارتقاء کی طرف انسان سفر کرتا ہے جس کے لیے قدرت نے کائنات کے اس عظیم شاہکار ''انسان'' کو تخلیق کیا ہے۔ یعنی انسانی نفس کے تین مراحل نفسِ امارہ، نفس لوامہ اور نفسِ مطمئنہ کا بلاواسطہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو اسی روحانی ارتقاء کے زمرے میں آتے ہیں۔ گو کہ ان کا واضح ادراک اور ان کی حقیقت کا شعور دونوں ہی ناممکنات میں سے ہیں۔ میرے اندر یہ شدید خواہش تھی کہ خدا، انسان اور کائنات کو موضوع بنا کر کچھ تحریر کروں کیونکہ میرے خیال میں ان تینوں میں جب ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے تو انسان، انسانیت کے اس درجے پر فائز ہوتا ہے جس درجے پر خدا انسان کو دیکھنے کا خواہاں ہے اس درجے کو پانے کے لیے انسان کو

اپنے نفس کے شعور کا ادراک ہونا بہت ضروری ہے اور جب یہ شعور حاصل ہوتا ہے تو انسان ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور یہ مراحل تب ہی طے کیے جا سکتے ہیں جب انسان کے اندر منزل تک پہنچنے کی جستجو ہو اور جب وہ جستجو کا یہ سفر مکمل کر لیتا ہے تو خاک کے ذروں سے آسمان کی وسعتوں تک ہر طرف ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور جب یہ ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تو انسان کو مثلث کی اس تکمیل کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جس کے ایک کونے میں خدا، دوسرے میں انسان اور تیسرے میں کائنات ہے اور جب وہ جستجو کے اس سفر میں کائنات کا مشاہدہ کر کے لوٹتا ہے تو برملا کہتا ہے کہ میں نے یہ راز پالیا ہے کہ

''خدا تو انسان میں ہے اور انسان خدا میں ہے۔''

میرا مقصد یہ بھی تھا کہ انسان کے اندر کے ان موسموں کا بھی ذکر کر سکوں جو لمحہ بہ لمحہ بدلتے رہتے ہیں اور ان سے کس طرح انسان کی سوچ، خیالات، جذبات اور احساسات میں تغیر و تبدل رونما ہوتا رہتا ہے کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی نئی شخصیت منظر عام پر آتی رہتی ہے چونکہ اس کائنات کا براہِ راست تعلق انسان کے ساتھ ہے اور اس کے اہم موضوع جو انسان کی زندگی پر بلواسطہ یا بلا واسطہ اثر انداز ہوتے ہیں وہ مذہب، فلسفہ، سائنس، ادب اور نفسیات ہیں۔ چنانچہ ان کو میں نے اس ناول میں سمونے کی کوشش کی ہے اس لیے موضوع کے مطابق فلسفیانہ انداز اپنانا بہت ضروری تھا۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اسے منفرد بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اب یہ قارئین پر مبنی ہے کہ وہ اسے کیسا پاتے ہیں۔

قیصرہ حیات

حصہ اوّل

ہم نے انسان کو احسن ترین صورت میں پیدا کیا ہے(۴)
پھر ہم نے اسے پستیوں کی جانب دھکیل دیا(۵) (اَلتِّین)

(1)

چہار سو خوشبو ہی خوشبو تھی مہک ہی مہک، عجیب سی بھینی بھینی جو نہ صرف دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی بلکہ پورا ماحول اور فضا بھی اس خوشبو سے معطر تھی۔ ہر طرف ہم آہنگی تھی۔ یکسوئی تھی۔ سب ایک ہی سوچ، ایک ہی دھارے میں بہتے چلے جا رہے تھے اور جب ہر جانب اتنا توازن، اتنا تناسب، اتنی ہم آہنگی ہو جائے تو سکون آپ ہی آپ جنم لیتا ہے۔ محبت کے دھارے اسی شانتی، اسی سکون سے پھوٹتے ہیں جو دلوں کو اطمینان بخشتا ہے۔ وہ خوش تھے مسرور تھے، ایک دوسرے کی سنگت میں، ایک دوسرے کی صحبت میں کیونکہ دونوں کے اندر جو الاؤ روشن تھا وہ صندل کی خوشبودار لکڑی سے روشن تھا اور جو آگ تھی وہ محبت کے آتش دان میں دہک رہی تھی جس نے ان کو پیکرِ محبت بنا دیا تھا۔

ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا سرسراتی ہوئی درختوں سے گزرتی تو ان میں جان پیدا کر دیتی۔ وہ اپنی جگہ جھومنے لگتے، اپنی شاخیں ہلا ہلا کر دوسروں کو بھی زندہ ہونے کا احساس دلاتے۔ ایک ٹہنی دوسری کو جھولتی اور دوسری، تیسری کو، پھر سب کے سب ایک ہی لے میں جھومنے لگتے اور جب وہ جھومتے تو پرندے بھی چہچہانے لگتے۔ طرح طرح کی آوازیں نکالتے اور خوشی کا اظہار کرتے کوئی پرندہ ایسا نہ تھا جو دوسرے کی خوشی میں شریک نہ ہوتا۔

اپالو[1] (Appolo) جیسا مجسم دیوتا، مردانہ وجاہت، خوبصورتی اور نغمگی کا مکمل شاہکار اس کی سنگت میں میں یوں براجمان تھا جیسے کبھی زیوس[2] (Zeus) اور لیٹو[3] (Leto) ایک دوسرے کی سنگت میں بیٹھا کرتے تھے، اور دنیا پر حکمرانی کرتے تھے۔ محبت اور وفا کی اس وادی میں کچھ بھی ایسا نہ تھا جو ان کو رلا سکے یا دکھ ہی دے سکے۔ ان کے پاس الفاظ نہ تھے مگر احساسات کی پوری دنیا ان پر عیاں تھی۔ وہ ایک دوسرے کو محسوس کر

سکتے تھے، چھو سکتے تھے۔ ایک دوسرے کو بھرپور نگاہوں سے دیکھ سکتے تھے، ایک دوسرے کے اندر کی حدت، توانائی اور حرارت کو جانچ سکتے تھے۔ ایک دوسرے کے لمس کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے تھے۔ اس کا دیوتا مجسم حسن تھا تو اس کا اپنا پری پیکر بھی کسی سے کم نہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایسے محبت ٹپک رہی تھی جیسے کبھی (Venus) وینس[4] مکمل خوبصورتی اور محبت کا شاہکار تھی۔ مونا لیزا جیسی معصوم اور پر اسرار مسکراہٹ، قلوپطرہ کا سا حسن...... چہرہ ایسے تاباں جیسے ماہتاب کی گول ٹکیہ سے مسلسل نرم نرم ٹھنڈی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ چاند کا سا حسن کہ لونا[5] (Luna) اور (Cynthia) سنتھیا[6] بھی پلکیں جھپکانا بھول دیتیں۔ پاکیزگی، تقدس اور دانشمندی میں منروا[7] (Minerva) اور ایتھینا (Athena) سے بڑھ کر۔ ڈیانا[9] (Diana) سے زیادہ خوبصورت چال کے ساتھ، شاہانہ انداز میں سارا دن گھوما پھرا کرتی۔ (Midas)[10] کی طرح جس چیز کو ہاتھ لگاتی وہ اپنی ہیئت کھو دیتا۔

باغ کے جس کونے میں وہ بیٹھے تھے وہاں درختوں کے گہرے جھنڈ تھے اور جس درخت کے سائے تلے بیٹھتے تھے وہ ان کی مخصوص نشست تھی۔ ہمیشہ اس کے گھنے سائے میں وہ بیٹھتے اور لطف اندوز ہوتے۔ اس کی ٹہنیاں بل کھاتے رینگتے سانپوں کی طرح ایک دوسرے کو یوں جکڑے ہوئے تھیں کہ ان کو علیحدہ کرنا کسی بشر کا کام نہ تھا۔ اس کی جڑیں جا بجا زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں کچھ تو ابھر کر بہت اوپر آ گئی تھیں اور انتہائی موٹی اور سخت ہو گئی تھیں جیسے نوخیز پودوں کے گرد اونچی نیچی اینٹوں کی کیاریاں لگی ہوں۔ اس کا سایہ ٹھنڈا اور گھنا تھا اس جیسا کوئی درخت وہاں نہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے خاص ان کی پسند کے مطابق اس کو وہاں لگایا گیا ہو۔ تھوڑے سے فاصلے پر آڑو، خوبانی، لیچی اور انگور کے پھلدار درخت جا بجا نظر آ رہے تھے اور پھلوں کی ملی جلی خوشبو سے سارا باغ مہک رہا تھا۔ کبھی کبھی ہلکا سا قہقہہ گونجتا اور اس کی کھنک سے سارے ماحول میں جھنکار سی پیدا ہو جاتی۔

وہ اٹھی تو وہ بھی اس کے ہمراہ اٹھ گیا۔ دونوں باغ میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔ اسے بھوک محسوس ہو رہی تھی وہ سیبوں کے ایک درخت کے پاس رک گئی ایسے خوبصورت گولڈن سیب جیسے ہسپر یڈ[11] (Hesperides) کے باغات میں ہوتے تھے اور کسی کو انہیں ہاتھ لگانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس نے سیب کو پکڑنا چاہا مگر وہ اس کے ہاتھ سے بار

بار چھوٹ جاتا۔ کئی بار اس نے کوشش کی مگر سیب نہ توڑ سکی۔ وہ خود آگے بڑھا اور سیب توڑ کر اسے دیا۔ اس نے جلدی سے سیب منہ میں ڈالا مگر اگلے ہی لمحے رک گئی اور جلدی سے سیب اپنے دیوتا کو پیش کیا وہ مسکرایا اور ایک اور سیب توڑا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے محبت کے اس لمس کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے زور سے دبایا۔ دونوں کے ہاتھوں کی لکیریں ایک دوسرے میں مدغم ہوگئیں، یوں جیسے ایک دوسرے کے اندر کھب گئی ہوں۔ خون کی گردش یوں رک گئی جیسے سارا زمانہ اپنی جگہ ساکن ہوگیا ہو۔ خون کے اس دباؤ سے آہستہ آہستہ حرارت پیدا ہونے لگی اور ہتھیلیوں میں آہستہ آہستہ پانی سا جمع ہونے لگا۔ دونوں کے ہاتھ گیلے ہو گئے۔ محبت کے اس جوش و جذبے سے دونوں مسرور ہو رہے تھے تب دونوں نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا جس کی گونج سے درو دیوار گونج اٹھے ساکت ماحول زندہ ہو اٹھا، پرندوں نے بھی حیرانگی سے دیکھا، سنا اور جواباً وہ بھی زور زور سے چہچہانے لگے۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی اور سکون ہی سکون تھا۔

دونوں باغ میں گھومنے لگے اور ہمیشہ کی طرح وہ اس ٹیلے کی جانب بھاگنے لگی جو ہمیشہ خوشی میں اس کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ ٹیلہ ایسے سیاہ تھا جیسے بجھی راکھ میں پانی ملا کر اس کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہو۔ وہ پُر اشتیاق نگاہوں سے کبھی دیوتا کی طرف دیکھتی تو کبھی اس کی طرف...... دیوتا نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے سرزنش کی اور اسے روکنے کی کوشش کی وہ رکی...... اس کی جانب دیکھا اور پھر اس تیز رفتاری سے بھاگنے لگی جیسے کبھی اٹلانٹا (Atlanta) اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے مشہور تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے بھاگا مگر وہ اس سے کہیں زیادہ آگے تھی۔ اس نے جلدی سے اس ٹیلے کے اوپر پاؤں رکھا مگر ٹیلہ تو سراب تھا۔ بھربھری ریت کی مانند اس کا پاؤں دھنستا ہی گیا اور وہ دھڑام سے نیچے گری۔ دیوتا نے حسرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اس جگہ قدم رکھا اور اس کی جانب اپنے ہاتھ بڑھائے مگر وہ...... وہ کہاں تھا......؟ دور اسفل السافلین جیسی گہرائیوں میں، وہ گھٹنے پر سر رکھ کر اس کے پاس پریشان بیٹھا تھا...... اور سوچ رہا تھا...... وہ خواب تھا...... سراب...... یا حقیقت......؟

......❁......

بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ (ا۔ اَلدّھر)

(2)

ہر طرف ابلتے لاوے کا شور ہی شور تھا اتنا شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ آگ کے شعلے آسمان کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر طرف لاوا ہی لاوا تھا۔ آگ ہی آگ...... تاریکی میں آگ...... روشن...... تانبے کی طرح...... کبھی نارنجی...... کبھی سرخ...... کبھی آتشیں...... کبھی ست رنگی شعاعیں لئے ہوئے شاید تاریکی کو روشن کرنے کی تگ و دو میں تھیں۔ مگر تاریکی تھی کہ نکس[13] (Nyx) کی طرح بال کھولے ہر طرف اڑتی پھر رہی تھی۔ یوں جیسے آگ اور تاریکی میں چوکھی کھیل ہو...... وہ آگ کو بھڑکانے کے لیے اپنے اندر کی اور تاریکی باہر نکالتی اور آگ اس کو نیچا دکھانے کے لیے اور بھڑک اٹھتی...... عجیب سماں تھا۔ کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھا...... تب ایری بس[14] (Ere Bus) نکس کی مدد کو پہنچا اور آگ کو ہار ماننا پڑی...... دونوں نے مل کر اسے ہرا ہی دیا...... آگے کے شعلے دبنے لگے...... آگ آہستہ آہستہ بہہ کر ٹھنڈی ہونے لگی...... مسلسل لاوے کے پھوٹنے سے جو گھن گرج اور گڑگڑاہٹ تھی اب آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ ہر مرتعش چیز کو سکون سا میسر آنے لگا۔ کپکپاہٹ کم ہوگئی ہر چیز تھم گئی، پرسکون ہوگئی۔

ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ کہیں سیاہ، گدلا...... شفاف، کڑوا، میٹھا، نمکین...... کھارا...... تعفن سے بھرپور تو کہیں میٹھا صاف شفاف، دو ننگ دھڑنگ وجود پانی کی تلاش میں سرگرداں تھے، کہیں سے میٹھا پانی مل جائے تو وہ اپنی پیاس بجھا سکیں اور جب اچانک ابلتے ہوئے آتش فشاں کو دیکھا تو سہم کر، دبک کر بیٹھ گئے اور اندر باہر بے چینی ہی بے چینی تھی، بے انتہا اضطراب...... بے پناہ شور...... ایسی سراسیمگی، ایسی پریشانی...... ایسا خوف......، جس کو وہ کوئی نام نہ دے سکے، بس نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کی

طرف دیکھتے رہے۔ خوف ان کے چہروں پر ابھرے ہوئے نقوش سے صاف جھلک رہا تھا...... وہ اپنی پیاس بھول گئے...... دور پانی نظر آ رہا تھا...... مگر اب کس کو طلب تھی...... کوئی جائے پناہ...... کوئی ٹھکانہ...... ازحد ضروری تھا۔ جہاں وہ اپنے وجود کو تحفظ کو دے سکیں مگر کہاں......؟ ہر طرف خوف ہی خوف تھا۔ تاریکی ہی تاریکی تھی...... ہوا میں خنکی سی تھی کچھ اندر کا خوف...... اور خنک ہوا...... دونوں نے جھرجھری لی...... جسم کپکپانے لگے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگے، ہوا تیز تیز چلنے لگی...... جنگل بیابان میں پتوں کی سرسراہٹ انہیں اور دھمکانے لگی...... جو آج دیکھا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جن آوازوں سے کان آج آشنا ہوئے تھے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ وہ خوف کے مارے جہاں کھڑے تھے وہیں دبک کر بیٹھ گئے وہ اس کے ساتھ چمٹ گئی، اس کے پاس الفاظ نہ تھے کہ اپنے خوف کو بیان کر سکتی اپنے اندر کے ڈرے سہمے جذبوں کو کس نام سے پکارتی وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ان جذبوں کو سمجھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا مگر نہ کہہ سکتا تھا، نہ دلاسہ دے سکتا تھا۔ اندر ہی اندر کچھ کھول رہا تھا جیسے باہر آنے کو بے تاب ہو مگر زبان تک آتے آتے رک جاتا تھا۔ گلے میں اک پھانس سی تھی جیسے اندر ہی اندر مسلسل رونے سے لگ جاتی ہے۔ وہ شوں شوں کی عجیب وغریب آوازیں نکال رہا تھا اور ساتھ ہی غصے میں اپنا ہاتھ زور زور سے زمین پر مار رہا تھا تب اس کا ہاتھ ایک نوکیلے پتھر پر جا پڑا۔ اس نے اس کو پکڑ کر زور زور سے زمین پر مارنا شروع کر دیا۔ زمین کے اندر سوراخ ہونے لگا جیسے جیسے زمین کھدنے لگی اس کے اندر کے جنوں کو...... خوف کو، سکون سا ملنے لگا...... زمین پھٹ چکی تھی اور اس کے اندر گڑھا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے اندر کسی مخفی طاقت کا احساس سا ہونے لگا وہ اور زور وشور سے اسے کھودنے لگا......

تب ایوس[15] (Eos) نے اپنے پر پھیلائے اور تاریکی چھٹنے لگی...... ہر چیز عیاں ہونے لگی...... گڑھا کتنا گہرا ہو گیا تھا وہ دیکھ کر خوش ہوا۔ زمین کے اندر اتنا سوراخ گیا تھا تھا کہ عورت آسانی سے اس کے اندر بیٹھ سکتی تھی...... اس نے اسے اندر بٹھایا اور خود باہر کھڑا ہو کر دیکھنے لگا...... تحفظ کا نیا احساس...... پچھلے خوف کو لے اڑا۔ وہ مسرور تھا...... اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی...... ایسی فاتحانہ جیسے ایک جہاں فتح کر لیا ہو...... وہ خوش خوش

اس کے گرد یوں چکر کاٹنے لگا جیسے رقص کر رہا ہو...... وہ خوش تھا اور مطمئن بھی...... اندر کی ایک مخفی طاقت کا راز اس نے پالیا تھا وہ کیا تھی......؟ کہاں سے آئی تھی اور اس نے کیسے جنم لیا تھا...... ان تمام باتوں سے بے نیاز......صرف اور صرف وہ خوش تھا...... اسی خوشی میں الٹی سیدھی قلابازیاں کھا رہا تھا...... جیسے بندر ناچ رہے تھے اور وہ ان کی سنگت میں اچھل کود رہا تھا......مگر ان سے بے نیاز......

۞

سو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کر دیا۔

(۱۴۔ الیّل)

(3)

بچے مل کر کنکریوں اور پتھروں سے کھیل رہے تھے۔ کبھی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کو ہوا میں اچھالتے اور انہیں پکڑنے کے لیے ایک دوسرے کے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ان کے ننگ دھڑنگ وجود مٹی سے اٹے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے مٹی کے بطن سے لتھڑے ہوئے وجود باہر نکل کر گھومنا شروع ہو گئے ہوں۔ ان کی رنگت بھی ایسی ملگجی تھی جیسی زمین کی گدلی رنگت۔ ان گی آوازیں ایسی تھیں جیسے بندر آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ ایسی بولی بولتے جیسے پرندے آپس میں بولتے ہیں۔ ان کی ہنسی بھی ان کی ہنسی معلوم نہ ہوتی تھی جانوروں، درندوں کے اندر رہ کر وہ بھی ان کی طرح نیم وحشی درندے ہو گئے تھے، انہی کے قبیلے کا حصہ۔

یکدم ایک بچے کے پاؤں میں نوکدار پتھر چبھا۔ شدید چبھن اور کرب کے باعث وہ وہیں بیٹھ گیا۔ انتہائی غصے میں پتھر کو دیکھا اور اس کو اٹھا کر اس زور سے دوسرے پتھر پر مارا کہ اس سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ ان چنگاریوں نے پاس بکھری سوکھی گھاس کو آناً فاناً اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قریب ہی دو سوکھی ٹہنیاں درخت سے ٹوٹ کر گری تھیں۔ آگ نے ان کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا تو اک جہاں سا روشن ہو گیا۔ آگ جل اٹھی تو سب سہم گئے۔ بچے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئے آگ روشن ہوتی جا رہی تھی اور وہ زیادہ خوفزدہ ہوتے جا رہے تھے ہر ایک کے لیے یہ ایک اچنبھے کی بات تھی۔ ماں باپ بھی آگ کی تابناکی دیکھ کر سراسیمگی کے عالم میں بچوں کی طرف دیکھ رہے تھے ماں نے دھیان سے سب کی طرف دیکھا سب سے چھوٹا بچہ غائب تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا اور مرد کو اشاروں سے سمجھایا۔

درختوں کے پیچھے کھڑکھڑاہٹ سی ہو رہی تھی مرد نے پیچھے مڑ کر دیکھا بچہ شیر کے

پنجے میں تھا اور وہ اس کا نازک بازو منہ میں دبائے اسے گھسیٹ رہا تھا۔ دونوں نے خوفناک نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ غصے سے ان کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنا شروع ہو گئیں اور رال بہنے لگی...... چہروں پر کئی رنگ آئے اور بکھر گئے...... سہمے ہوئے بچے...... آگ...... شیر...... خوف...... سراسیمگی اور پریشانی...... سب نے مل کر اندر ہیجان سا پیدا کر دیا...... ایک تلاطم سا برپا ہو گیا...... ایسے ایسے جذبے سر اٹھانے لگے جن سے پہلے وہ بالکل ناآشنا تھے۔

یکدم اس نے بھڑکتی آگ کی طرف دیکھا۔ عجیب سا احساس بیدار ہوا۔ آگ سے ڈرنے کی بجائے نادانستہ وہ اس کی جانب لپکا اور جلتی ہوئی ٹہنی اٹھا کر زور سے شیر کی جانب پھینکی شیر ہراساں ہو کر بھاگ نکلا...... بچہ وہیں درد سے بلبلا رہا تھا سب بھاگ کر بچے کی طرف گئے...... ماں نے اسے آغوش میں لیا...... اور اسے سینے سے چمٹا کر پیار کرنے لگی...... مرد نے شکرانہ نگاہوں سے آگ کی طرف دیکھا...... اس کی آنکھوں میں عقیدت اور محبت تھی وہ اس کے آگے جھکا...... اس کی طاقت کو سلام کیا مگر اندر کی طاقت کا بھی جائزہ لیا...... تلاطم...... ہیجان، طوفان اب تھم چکا تھا۔ اک نرم گرم احساس کے ساتھ آگ سے خوف کا احساس بھی بیدار ہو چکا تھا...... ٹھنڈے میٹھے جذبات سے اس نے بچوں کو دیکھا...... بھڑکتی آگ نے اس کے وجود کے اندر ایک جگہ بنا لی...... اور اس نے اس کے ہمراہ شعور کے دروازے پر قدم رکھا۔ آگ جہاں روشن بھی کرتی ہے وہاں بھسم بھی کر سکتی ہے۔

......❁......

خدا ہی تو ہے جس نے تم کو (ابتداء) میں کمزور حالت
میں پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد طاقت عطا کی۔
(۵۴۔ اَلرُّوْم)

(4)

اس کو شدید بھوک لگ رہی تھی مگر کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ غار کے اندر نہ باہر۔ غار ایسا تاریک اور کھوکھلا تھا جیسے اس کا پیٹ۔ وہ اندر بیٹھی کتنی دیر گیلی مٹی سے غار کی دیواروں پر کچھ بناتی رہی پھر باہر آ گئی۔ بچے دور آگ کے گرد کھیل رہے تھے اس نے ان پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر درختوں کے پیچھے گھومنے لگی بالآخر وہ اسے ایک کونے میں بیٹھا مل ہی گیا۔ وہ اسے غار کے اندر لے گئی اور ایک ہاتھ پیٹ پر رکھا دوسرے سے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں الٹی سیدھی جانور کی شکل بنی تھی۔ وہ کونوں کھدروں میں کچھ ڈھونڈنے لگ پڑا اور پھر باہر نکل آیا......

باہر آ کر اس نے چار گول گول پتھروں کو ایک موٹی سی ڈوری کے ساتھ باندھا اور دور چوکڑیاں بھرتے ہرن کی جانب پھینکا۔ پتھر اس کی ٹانگوں کو لگے وہ وہیں بلبلا کر گر پڑا...... خون اس کی ٹانگوں سے بہنے لگا وہ بھاگتا ہوا اس کی جانب گیا اور خون آلود زندہ ہرن کو آگ میں پھینک دیا...... آگ سے پٹاخے نکلنے لگے۔ بچے خوشی سے چلانے لگے اور قلابازیاں مارنے لگے......

فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی سوندھی سوندھی سی مہک پھیلنے لگی...... انہوں نے ٹہنیوں کی مدد سے اس کو باہر نکالا اور سب اس پر یوں ٹوٹ پڑے جیسے مردار کے اوپر گدھ۔ جو جس کے ہاتھ میں آیا وہ اسے چیرنے پھاڑنے لگا۔ بچے، مرد، عورت سب اس چھینا جھپٹی میں مصروف تھے یہ عمل انہیں بہت خوش کن اور اچھا لگا...... اتنا لطف کہ پہلے کبھی انہیں اس کا اندازہ نہ تھا......

گوشت ختم ہو گیا تو وہ ایک دوسرے پر جھپٹنے لگے...... بچے ایک دوسرے پر، مرد، عورت سب ایک دوسرے کو زد و کوب کرنے لگے۔ یہ سب ان کو بہت مسحور کن لگ رہا تھا۔ ہی میں وہ ایک دوسرے کو زور زور سے پیٹنے لگے...... یوں جیسے اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہے ہوں...... ایسی طاقت ایسی قوت جس کا مظاہرہ انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا...... اچھلنا...... کودنا...... چھینا...... جھپٹنا...... سب ذات کا حصہ لگنے لگا...... پنہاں رازوں میں سے ایک راز۔

اور ہم نے ہی لوہا پیدا کیا ہے اس میں اسلحہ جنگ کے لحاظ سے خطرہ بھی شدید ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں۔ (۲۵۔ اَلْحَدِیْد)

(5)

دونو عمر لڑکے دریا کے کنارے پانی میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے تھے۔ وہ کبھی پانی میں کنکر پھینکتے کبھی دریا کے کنارے اگی گھاس اور جڑی بوٹیوں کو نوچ نوچ کر پانی میں پھینکتے...... ٹھنڈے یخ پانی میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنا انہیں بہت اچھا لگ رہا تھا...... وہ اٹھ کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جا کر بیٹھ جاتے۔ جب اچانک کوئی چیز دریا کے اندر عین ایک کے پاؤں کے نیچے ایڑھی کے ساتھ زور سے ٹکرائی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی...... چیز ایسی سخت اور نوکیلی تھی کہ اس کے پاؤں پر خراش آ گئی۔ اس نے پاؤں کھینچ کر باہر نکالا تو پاؤں سے خون رِس رہا تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں...... اس نے جلدی سے پاؤں دوسرے کو دکھایا اس نے بھی آزمانے کے لیے پاؤں آہستہ آہستہ پانی کے اندر ڈالا اور ڈرتے ڈرتے ڈوبے کنارے کی سطح سے اس کو مسلنے لگا اس کے پاؤں پر بھی ویسی ہی خراش آئی جیسی پہلے کے پاؤں پر تھی۔ دونوں ڈر گئے اور سہم بھی گئے...... یونہی لنگڑاتے ہوئے ماں باپ کے پاس پہنچے...... دونوں ان کے ہمراہ آئے...... مرد نے آہستہ آہستہ پانی کے اندر اپنا ہاتھ ڈالا اور اس نوکیلی بھی چیز کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ بہت تگ و دو کے بعد لوہے کی لمبی سی سلاخ باہر نکالی۔ اس نے باہر نکال کر اس کو اس زور سے زمین پر پھینکا جیسے کوئی زہریلا سانپ ہو......

زنگ آلود...... سیاہ سلاخ کسی سانپ سے کم نہ لگی...... سب خوف کے مارے پیچھے ہٹ گئے اور حیرت سے مسلسل اس کو دیکھتے رہے۔ لوہے کی سلاخ بے حس و حرکت پڑی تھی اور سب اس کو گھور رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ مرد اس کی جانب بڑھا، اس کو ہاتھ میں پکڑا...... اس کو ہاتھ میں چبھویا تو ہلکا سا خون نکل آیا...... سب اس کو ساتھ لے آئے اور درمیان میں رکھ کر سب سوچ میں پڑ گئے...... اور اٹھا اٹھا کر اس کو زمین پر مارتے اس

کے گرنے سے فضا میں گونج کی آواز پیدا ہوتی...... ایک دم گرنے پر بھاری آواز اور پھر آہستہ آہستہ کم...... کیسی آواز تھی کیسی گونج...... کیسی کھنک...... اور پھر نہ اس میں خم آ رہا تھا نہ وہ ٹوٹ رہی تھی کیسی چیز تھی...... لکڑی کی ٹہنی تو ٹوٹ جاتی ہے، یہ کیا تھی......؟ وہ سب سوچ رہے تھے۔ اتنے میں چھوٹا سا بچہ آیا اور اس کو اٹھا کر کھیلنے لگا۔ سب حیرت سے اس کو دیکھ رہے تھے کہ اس نے اس کو اوپر کی جانب پھینکا وہ زمین پر گرنے سے پہلے نیچے کھڑے بکری کے بچے پر زور سے پڑی وہ وہیں بلبلانے لگا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ اس کی ٹانگوں سے خون رسنے لگا۔ سب کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی اور وہ حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے...... اور ایک دم وہ سیٹیاں بجانے لگے...... دور انہیں بھیڑیا نظر آیا...... مرد نے خوشی میں زور سے نوکیلی سلاخ اس کی طرف پھینکی جو عین اس کے سر میں لگی۔ خون کا فوارہ سا پھوٹ نکلا اور وہیں تڑپنے لگا...... سلاخ ویسی کی ویسی تھی مگر جانور تڑپ رہا تھا۔ سب بھاگتے ہوئے گئے اور حیرت سے سلاخ کی طاقت کا مظاہرہ دیکھا...... وہ خوش تھے، ایسی چیز ہاتھ لگی تھی جو ٹوٹتی بھی نہ تھی اور طاقتور بھی تھی...... وہ ایسی اور سلاخوں کی تلاش میں سرگرداں نکل گئے...... جو انمول بھی تھی اور طاقت ور بھی اور جس کی مدد سے وہ پورے جنگل میں حکمران بن سکتے تھے۔ سب جانور درندے ان کو کم حیثیت محسوس ہونے لگے...... برتری کے احساس سے ان کے دلوں میں کچھ کچھ ہونے لگا...... ان کی سیٹیوں میں زیادہ سے زیادہ جوش و خروش آتا جا رہا تھا...... وہ سب کچھ کر سکتے تھے اگر ایسی چیزیں اور مل جائیں...... تلاش کا سفر شروع ہوا۔ وہ زمین کھودتے جو سوراخ نظر آتا...... کوئی کھوہ...... پانی کے اندر کوئی گڑھا، وہ ہاتھ ڈال کر نکالنے کی کوشش کرتے کہ ویسی ہی چیز مل جائے جس سے ان کی طاقت کو اور تقویت مل جائے...... وہ سارا سارا دن سلاخ کو لیے گھومتے پھرتے، اس کو ہوا میں اچھالتے، ان کے دل خوشی سے ایسے اچھلتے جیسے ہوا میں بل کھاتی، لہراتی سلاخ۔ قدرت کے خزانوں میں سے ایک ناقابلِ تسخیر خزانہ ان کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ اس سے ایک جہاں فتح کر سکتے تھے اس احساس نے لاشعوری طور پر انہیں مضبوط اور طاقت ور بنا دیا۔ اندر کی قوتوں میں ایک اور قوت کا اضافہ ہوگیا۔

اور تم نے پہلی پیدائش تو جان ہی لی ہے پھر تم سوچتے کیوں نہیں۔

(۶۲۔ اَلوَاقِعَة)

(6)

قبیلے کے سب مرد و زن پوری جانفشانی سے کام میں جتے ہوئے تھے۔ کھلی زمین پر ہر طرف گارا ہی گارا تھا وہ سب مٹی کی دیواریں بنانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ کدالوں سے زمین سے مٹی کھود رہے تھے۔ کچھ ان کو نکال کر ایک جگہ ڈھیر کر رہے تھے۔ کچھ اس میں پانی ملا رہے تھے اور کچھ مٹی کے سخت ڈھیلے بنا بنا کر انہیں ایک دوسرے پر رکھ کر دیواروں کی شکل میں انہیں کھڑا کر رہے تھے...... کئی دنوں سے وہ اسی کام میں مصروف تھے اس بیابان ویران جگہ کو آباد کرنے نجانے کہاں سے کیا کیا صعوبتیں اٹھاتے اب یہ لوگ یہاں جمع تھے۔ بہت زمینیں دیکھیں مگر پڑاؤ یہیں ڈالا...... یہ دل کو ایسی بھائی کہ سب یہیں رک گئے...... نئے گھر، نئی بستی، نئے آشیانے بنانے کے شوق نے ان کی راتوں کی نیند بھی خراب کر دی تھی...... ذہن اب سوچنا شروع ہو گئے تھے اور ہر دم وہ تصورات میں اپنی کچی بستی کو ہی دیکھتے...... ہر ایک کی آنکھ کا یہ خواب تھا...... اور ہر دل کی یہ آواز اور ہر چھوٹا بڑا اس آواز پر لبیک کہنے کو تیار تھا۔ بھوک لگنے پر بچے اور عورتیں پھل اور کچی سبزیاں لاتے، وہ انہیں کھاتے، سائے تلے ستاتے اور پھر کام میں لگ جاتے۔

کئی ایک نامکمل گھر بن گئے تھے اور یہ دیکھ کر وہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔ مٹی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی اور وہ پوری تندہی اور جذبے سے گڑھے کھودتے جا رہے تھے کہ زمین کی عمیق گہرائی سے عجیب وغریب چیزیں نکلنا شروع ہو گئیں...... ڈر کر سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھے اور ڈرتے ڈرتے ان کو پکڑ کر باہر نکالا۔ قبیلے کے جوانوں کی مدد حاصل کی گئی۔ کافی کچھ نکلا سب لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو گئے اور حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے...... لمبی، چھوٹی، موٹی اور خم دار مٹی کے رنگ کی ٹیڑھی میڑھی سلاخیں، عجیب و غریب نہ سمجھ آنے والی ہیئت کی عجیب مڑی ہوئی

ہڈیاں...... بوسیدہ...... کھنکتی ہوئی......، پنجر...... پنجے اور پھر ایک کھوپڑی...... سب ہراساں اور خوف زدہ تھے...... یہ کیا تھا...... ان کو سمجھ نہ آ رہا تھا...... وہ ذہن پر زور ڈالتے...... سوچتے کہیں نہ کہیں کڑیاں ملانے کی کوشش کرتے مگر بے سود...... رات کی تاریکی نے ہر جانب ڈیرا جما لیا...... آگ کا الاؤ روشن تھا اور آگ پہلے سے زیادہ روشن تھی...... وہ ساری ہڈیاں بھی قریب پڑی تھیں اور تاریک رات میں الاؤ کے پاس وہ قدرے خوفناک لگ رہی تھیں۔ تب ایک نے چھوٹی سی ہڈی اٹھا کر آگ میں پھینکی ہر کوئی نتیجے کا منتظر تھا...... ہڈی سے پٹاخے سے نکلے۔ گندی سی بدبو پھیلی اور پھر وہ راکھ بن گئی...... نہ اس کا وجود رہا نہ اس کی ہیئت...... سب مزید حیران ہونے لگے۔ دوسرے دن بھی کوئی کام پر نہ لگا...... درمیان میں ان کو رکھ کر وہ سوچ رہے تھے کہ ان کا کیا کیا جائے...... کہاں سے آئی ہیں...... کہاں رکھا جائے...... ہر ایک اپنی سی سعی کر رہا تھا۔

ایک عورت آگے بڑھی...... کھوپڑی کو الٹا سیدھا کر کے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سوراخوں میں انگلیاں ڈال ڈال کر دیکھا۔ وہاں کچھ نہ تھا...... اس نے سارے مجمع کو بغور دیکھا...... ہر ایک کے پاس آہستہ آہستہ چلتی جاتی...... ایک دفعہ ہاتھ میں پکڑی کھوپڑی کو دیکھتی اور ایک دفعہ اس شخص کو پھر آگے چل دیتی...... مجمع میں ایک نہایت نحیف و نزار ڈھانچہ نما آدمی بیٹھا تھا...... جو ہمیشہ بیمار رہتا تھا...... کھانس کھانس کر اس کی ہنسلی کی ہڈی باہر کو نکل آئی تھی...... وہ اس کے قریب جا کر رک گئی...... ایک ٹک کھوپڑی کو دیکھا اور ایک بار اس کی طرف...... کھوپڑی اس نے اس کے سر پر رکھ دی...... کھوپڑی میں اور اس شخص میں بے حد مماثلت تھی...... اتنی مشابہت کہ دونوں ایک ہی معلوم ہو رہے تھے...... سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ خوش اور حیران ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے جیسے ایک گہرا راز پا لیا ہو......

وہ باری باری ہڈیوں کو ماپنے لگے...... کوئی اس کو بازو پر رکھ کر دیکھتا...... کبھی ٹیڑھی میڑھی ہڈیوں، پنجوں کو ہاتھوں اور پاؤں پر رکھ کر دیکھتا۔

ڈھانچے کو سینے کے ساتھ سب باری باری لگا کر دیکھنے لگے۔ ہر ہڈی، ہر ڈھانچہ زندہ انسانوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے جا رہے تھے...... تجسس کا نیا احساس پیدا ہونے لگا۔ وہ مسرور تھے اور شاداں بھی...... اندر ایک جہاں آباد ہے جس کو انہیں دریافت

ہے...... جس کو فتح کرنا ہے...... وہ جوش و خروش سے کودنے لگے...... نئی نئی چیزیں نکلنے لگیں...... عجیب و غریب اینٹیں، پتھر، ان پر کندہ لکھائیاں...... ڈھانچے، مورتیاں...... خوفناک کھوپڑیاں، پنجر، زیورات، اتنا سب کچھ وہ اب اور متجسس ہو گئے......شعور کا دروازہ ایک بار پھر کھلنے لگا...... وہ ذہنوں پر دباؤ ڈالنے لگے...... ہم آہنگی...... مماثلت...... مشابہت تلاش کرنے لگے...... کس کو کس سے ملانا ہے......؟ کس کڑی کو کہاں جڑنا ہے......؟ ہر ایک کے اندر پوشیدہ راز کو پانا تھا...... وہ سارا سارا دن ہتھیار لیے کبھی زمین کو کھودتے۔ کبھی کسی ٹیڑھی میڑھی چٹان کو، کبھی پانی کے اندر کچھ تلاش کرتے...... کچھ تھا جو ان کو چین نہ لینے دے رہا تھا...... ہر نئی چیز پاکر کبھی پریشان ہوتے کبھی خوش تو کبھی خوف زدہ مگر تجسس کے جذبے کو چین نہ مل رہا تھا...... تمام کیفیات سے مبّرا صرف وہ ایک چیز میں سرگرداں تھے...... بس انہیں ماضی...... حال اور مستقبل کو ملانا تھا کسی نہ کسی طرح...... کسی نہ کسی قیمت پر...... یقیناً...... تسخیر فطرت کا خاصہ تھی...... اور انہیں اسے سرکرنا تھا۔ ہڈیوں اور پنجر کو زندہ انسانوں کے ساتھ ملا کر دیکھتے تو اندر ہی اندر ایک سوچ جنم لیتی...... آغاز اور انتہا...... ابتداء اور انجام...... انسان اور مردار...... اس سوچ نے انہیں دہلا کر کے رکھ دیا...... اور وہ قدرت کی طرف حیران کن مگر خوفزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

....

مگر اس کے نفس نے اس کو بھائی کے قتل ہی کی ترغیب دی تو اس نے اسے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ (۳۰۔ اَلْمَآئِدَۃ)

(7)

لوہار بھٹی سے لوہا نکال کر اس پر زور زور سے ضربیں لگا رہا تھا۔ لوہا آگ میں تپ تپ کر آگ بن گیا تھا۔ اس کی سرخ تپتی رنگت اس کی ہیئت کو بدلنے کے لیے کافی تھی اور لوہار بھی پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کی شکل بدل دے۔ لوہے میں کام کرنے سے اس کا اندر بھی لوہے جیسا مضبوط اور توانا ہو گیا تھا۔ موسموں کا تغیر و تبدل اس پر کوئی اثر نہ کرتا۔ وہ بات کا پکا اور کھرا بندہ تھا۔ بہت کم بولتا مگر بہت پُر اثر...... اس کو یاوہ گوئی سے سخت نفرت تھی۔ قدرت نے اس کو زبان دی تھی مگر وہ اس کو بے دریغ استعمال نہ کرتا۔

وہ اس تحفے کی قدر کرتا تھا بہت کم بولتا مگر بہت باوزن کہ سننے والا بار بار اس کو کرید کر مفہوم جاننے کی کوشش کرتا مگر وہ تب بولتا جب ضروری سمجھتا...... وہ گاؤں کا دانش مند آدمی سمجھا جاتا تھا...... لوگ بھی آہستہ آہستہ بولنا سیکھ گئے تھے۔ وہ سوچتے زیادہ تھے اور بولتے کم کیونکہ ہر شے کے لیے لفظ ڈھونڈنے کی تگ و دو میں رہتے۔

وہ آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا...... لوہار نے دھیان نہ دیا۔ وہ مسلسل اس کو دیکھتا رہا...... اور وہ اپنا کام کرتا رہا پھر وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ دوپہر تپ رہی تھی اس کی بھٹی کی طرح اور اب وہ کہیں جانے کی سوچ رہا تھا۔

''بھیا اجّت کیا ہووے ہے؟'' اس نے اس کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

لوہار نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور پھر بولا۔

''سیپ میں موتی''...... سیپ ٹوٹ جاوے، گم ہو جاوے مگر اجّت کو کچھ نہ ہووے اور اجّت کو بڑے کڑیل شیر جوان سنبھالے ہیں...... وہ اٹھ کر جانے لگا۔

''منّے ایک کھنجر چاہئے''

''کاہے کو......؟''

''کوئی موتی لینے کو دوڑے ہے''

''جا...... جو چاہئے لے لیجیو...... پر الٹا کام نہ کیجیو کہ مونہے پر کوئی تھوئی تھوئی ہووے۔''

اور اس نے اٹھ کر ایک تیز دھار خنجر اپنے تہہ بند کی ڈھب کے اندر اڑسا اور کھیتوں کی طرف چل دیا۔ اس کے اندر نفرت کا الاؤ روشن تھا...... وہ بار بار پانی پیتا مگر کسی طرح بھی ٹھنڈک نہ پڑ رہی تھی۔ اس کو یقین نہ تھا کہ اس کے بھائی اس کے بارے میں یوں سوچتے ہیں۔ اس نے تو ساری زمینیں ان کے حوالے کر رکھی تھیں۔ بغیر کسی نفع ونقصان کی سوچ کے...... اس نے اپنا سب کچھ ان کو دے رکھا تھا اور وہ نہ صرف اس کی زمینیں ہڑپنے کی سوچ رہے تھے بلکہ سب بیٹھ کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اس کو بے وقوف، کم عقل...... احمق اور نجانے کیا کیا کہہ رہے تھے...... بات یہیں پر ختم نہ ہوئی تھی جب وہ اس کی گھر والی کے بارے میں الٹا سیدھا ہانک رہے تھے...... اس کے بعد اس پر بھی قبضہ کرنے کی سوچ رہے تھے۔ کیسے کمینے تھے وہ...... کتنے گھٹیا، کتنی خباثت تھی ان کے اندر...... وہ وہیں پر ہی دل مسوس کر رہ گیا اور تب ہی اس نے ان کو ختم کرنے کی ٹھان لی۔

وہ کھیتوں میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرتا رہا...... رات کی تاریکی، گہری ہونے لگی...... چاند بھی مدھم تھا۔ کہیں کہیں بادل ٹکڑیوں کی صورت میں نمودار ہونے لگے...... جب چاند کے آگے بادل آ جاتے تو تاریکی میں مزید اضافہ ہو جاتا...... ہوا میں خنکی بڑھنے لگی۔ جب آدھی رات کے قریب دو سائے کھیتوں میں چلتے نظر آئے، ایک، ایک طرف کو چل دیا تو دوسرا دوسری جانب...... وہ ایک کے پیچھے گیا اور ڈھب سے خنجر نکال کر اس پر پے در پے وار کیے یہ نہ دیکھا کہ کیا ہوا ہے کیا نہیں...... وہ دوسرے کے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے لگا جب وہ کنویں کے قریب پہنچا تو اس نے اسے اس میں دھکا دے دیا اور خود ڈیرے پر آ کر پرسکون سو گیا۔ اس کے اندر کے جنوں کو کچھ سکون ملا تھا...... اس کے بھائی اسے ہمیشہ سے بزدل اور کم ہمت سمجھتے تھے اور اب اس نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے...... اب ساری رقابت، عناد، حسد، دشمنی ختم ہو گئی۔

نور کے تڑکے ہر طرف شور ہی شور تھا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا...... لبوں پر مسکان سی پھیلی...... شور کی جانب بڑھا...... تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا...... اس کا اپنا بیٹا ہی ٹکڑے

ٹکڑے کھیتوں میں پڑا تھا اور دوسرا کہاں تھا......؟ اس کی تلاش جاری تھی اس کی بیوی رو پیٹ رہی تھی اور دوسرے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ پر یہ تو صرف وہی جانتا تھا کہ وہ کہاں تھا......

وہ ڈیرے تک گیا اور خنجر نکال کر لوہار کی دکان کی طرف چل دیا۔

سارا راستہ اندر ہی اندر روتا رہا، دہائی دیتا رہا...... ''انسان گھاٹے میں ہے...... انسان خسارے میں ہے......قسم زمانے کی......قسم کائنات کی......قسم خدا کی...... انسان خود اپنا ہی دشمن ہے...... انسان نقصان میں ہے...... خسارے میں ہے...... وہ خسارہ...... جو اندر ہے...... جو باہر ہے...... جو ہر طرف ہے اور جس پر ہر مہر ثبت ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ہ''

......۞......

اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کیے کہ ان میں مکاریاں کرتے رہیں اور جو مکاریاں کرتے ہیں ان کا نقصان انہیں کو ہے اور وہ اس سے بے خبر ہیں۔ (۱۲۴۔ اَلْاَنْعَام)

(8)

جوں جوں انسان پر مختلف ادوار گزرتے گئے، جیسے جیسے تاریخ کی دھول اس پر جمتی گئی وہ اپنے اندر کے مخفی رازوں سے آشنا ہوتا گیا...... وہ چھوٹے چھوٹے جذبے...... اور سوچیں جن سے کبھی خود ہی ڈرتا تھا اور جن کو کوئی نام دینے سے خوف زدہ تھا اب بانگ دہل ان کا پرچار کرنے لگا...... اور ان جذبوں کی تسکین کے لیے نت نئے سہارے ڈھونڈنے لگا...... ان کو تقویت پہنچانے کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے لگا...... جہاں نفرت...... رقابت...... حسد...... عناد...... دشمنی پنپنے لگی...... وہاں دولت کی ہوس و لالچ...... تعیش اور منفی قوتیں اتنی ہی تیزی سے برسرپیکار ہونے لگیں۔ خیر وشر کے جھنجھٹ میں پڑ کر انسان نفسیاتی طور پر مفلوج ہونے لگا...... کبھی شر کے پردے میں ستم توڑنے لگا تو کبھی خیر کا سہارا لے کر...... مقصود تو صرف انا کی تسکین تھی اور اس جھوٹی انا کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔

یہی وہ آج کر رہے تھے۔ یہی وہ ماضی میں کرتے آئے تھے...... ہر طرف ریت ہی ریت تھی...... ریت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر...... تپتی ریت جو شعلے برساتے سورج کی سنگت میں مسلسل جل رہی تھی...... صحرا کی گرم ہوا...... نہ کوئی سایہ...... نہ ابر کا ٹکڑا...... نہ کوئی بندہ بشر...... نہ کوئی چرند پرند...... نہ کوئی قطرہ و بوند...... بس ریت کا کھلا میدان...... دور کہیں اونچے نیچے ٹیلے...... دور کہیں کہیں جھاڑیاں وہ بھی جل جل کر خاکستر ہو گئی تھیں...... ایسے میں دو وجود مسلسل آگ میں جل رہے تھے...... ان کو اونٹوں کی ٹانگوں کے ساتھ رسیاں ڈال کر باندھا گیا تھا...... بات کچھ بھی نہ تھی اور تھی بھی بہت کچھ...... دونوں نے محبت کی تھی...... صاف ستھری پاکیزہ و مقدس محبت، محبت کیا تھی؟...... کیا ہے؟...... سزا دینے والے خود نہ جانتے تھے...... وہ تو قبیلوں کی عزت اور ناموس کے لیے مرے جا رہے

تھے۔ کم ذات کے لڑکے نے اپنے سے اونچی ذات کی لڑکی سے تعلق بڑھایا تھا اور اب دونوں کو سارے قبیلے کے سامنے رسوا کیا گیا تھا۔ دونوں خاندانوں کو بلایا گیا...... دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی دھمکیاں دیں...... جب نہ مانے تو ان کو سفید چادریں اوڑھا دیں گئیں ان کے سروں پر خاک ڈالی گئی اور پھر دونوں کو رسیوں کے ساتھ باندھ کر تپتے صحرا میں اونٹوں کے ساتھ کھنچوایا گیا...... تاکہ ان کی کھال ادھڑ جائے۔ دور کھڑے وہ تماشا دیکھتے رہے فاتحانہ انداز سے مسکراتے رہے۔ دو وجود ان کے سامنے پڑے تڑپ رہے تھے۔ سسک رہے تھے...... مگر وہ ان کو سزا دے کر اپنی انا کو سکون پہنچا رہے تھے...... وہ خوش تھے کہ گنہگار اپنے انجام کو پہنچ رہے تھے۔

سورج بھی کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہا...... تپتی ریت پر ان کے جسم چھل چکے تھے...... جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ سفید چادروں پر جگہ جگہ خون کے دھبے لگنے لگے...... مگر وہ ہر احساس سے عاری بس دیکھتے رہے۔

اونٹ بوجھل قدم اٹھا رہے تھے...... شاید گناہ کے احساس سے...... جو انسانوں نے ان کے کندھوں پر ڈال دیا تھا اور اس کے بوجھ تلے ان سے چلنا محال تھا۔

یک دم ریت کے جھکڑ چلنے لگے...... ہر طرف ریت کا طوفان شور مچاتا، سیٹیاں بجاتا ہر چیز کو تہس نہس کرنے کے درپے تھا۔ اونٹ رک گئے...... سورج کی شعلہ برساتی آنکھوں میں ٹھنڈک سی پڑنے لگی...... جابجا بادل اس کے سامنے آنے لگے...... سب حیران رہ گئے، یہ بدلی کہاں سے آ گئی...... صرف ایک ٹکڑا...... پورا آسمان صاف شفاف...... جیسے دھلی چادر نہ کوئی دھبہ نہ داغ...... ریت کا طوفان آہستہ آہستہ ان کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا...... ان پر ریت کی تہیں جمتی گئیں...... ان کا وجود ناپید ہو گیا، کبھی وہ تھے ہی نہیں...... وہ مٹ گئے...... آسمان رویا، چند قطرے ان کی ڈھیری پر برسے اور ٹیلہ سا بن گیا...... اونٹ کہاں چلے گئے...... سارا جہاں پیوست ہو گیا...... کہاں......؟ عدم میں...... تصور میں...... اک خواب سا بن گیا...... اک کہانی نے جنم لیا اور اس سے بہت سی داستانیں بننے، مٹنے لگیں...... انسان سخت ہوتا گیا...... محبت مفقود ہوتی گئی...... جذبے ختم ہونے لگے اور انسان بکھرنے لگا...... ٹوٹنے لگا...... اندر ہی اندر مگر باہر سے مضبوط ٹیلہ...... جس پر جھکڑ چلتے ہیں...... جہاں وہ طواف کرتا ہے...... مگر بے سود۔

حصہ دوم

ہم عنقریب ان کو اطراف عالم میں بھی اور خود
ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں
تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہی حق ہے۔
(۵۳۔ حٰمٓ السجدۃ)

(9)

''آج کا انسان ذات کے شعور کی کشمکش میں مبتلا ہو کر ذہنی طور پر شدید ہیجان کا شکار ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس کا ذہن مثلث کے تین کونوں کے ساتھ بری طرح بندھا ہوا ہے۔ اس کے پاؤں میں لاشعور، نیم شعور اور شعور کی تین زنجیریں بندھی ہیں جو بیک وقت ماضی، ماضی قریب اور حال سے منسوب ہیں۔ انہوں نے اس کے ذہن کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا ہے۔ جیسے فرائڈ شخصیت کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے:

(1) لاذات: **(Id)** یہ ابتدائی حیوانی جبلت ہے جب کبھی وہ **(Stone Age)** میں رہنے والا خوفناک انسان کم، حیوان زیادہ تھا۔ انسان کی تاریخ کا یہ حصہ اس کے لاشعور میں ہے جہاں اس کا ماضی پنہاں ہے اور اب بھی وہ **(id)** لاذات کی کسی نہ کسی صورت میں تسکین چاہتا ہے۔

(2) انا **(Ego)**: جب حیوانیت سے نکل کر اس نے اپنے آپ کو انسان سمجھنا شروع کیا...... وہ فوقیت اور برتری کے احساس سے دو چار ہوا۔ اس کی ارتقاء کا عمل شروع ہوا...... اس نے اپنی حقیقت کو سمجھنا شروع کیا...... وہ حیوانیت کے درجے سے نکل آیا اور اس نے مہذب دنیا کی طرف سفر شروع کیا یہ اس کی نیم شعوری کیفیت ہے۔

(3) **Super Ego**: اس کا حال ہے، شعور ہے، اس کو اب احساس ہے کہ وہ مہذب دنیا کا ناقابل تسخیر انسان ہے اور **Super Ego** اس کو اخلاقی اقدار کی طرف مائل کرتا ہے۔ اور اس کو بار بار باشعور ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

اب ہیجان کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اضطراب کہاں ہے؟ پریشانیاں کہاں سے جنم لیتی ہیں؟ تو اس کا مختصراً جواب یہی ہو گا کہ انسان کے لاشعور **(id)** اور **(Ego)** میں

مسلسل کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ حیوانیت اس کی جبلت میں ہے وہ اپنے ماضی کو نہیں بھولا وہ اس کے لاشعور میں محفوظ ہے اور جب موقع ملتا ہے لاشعور سے وہ جبلت تقویت پکڑتی ہے اور انسان درندگی، غاصبیت کا شکار ہو جاتا ہے وہ تشدد پر اُتر آتا ہے۔ حیوانیت اس پر غالب آجاتی ہے اور یہ حیوانیت تباہی و بربادی، کبھی جنسی تشدد اور کبھی ویسے ہی تناسب کو بگاڑ کر تسکین پاتی ہے۔ انسان ہر ممکن طور پر اس کو دبانے کی عام حالات میں کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی **Ego** نیم شعور، اس کو احساس دلاتا ہے کہ وہ انسان ہے۔ حیوانیت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کو **Super Ego** کی فکر کرنی چاہئے۔ کیونکہ وہ اس مہذب دنیا کا شاہکار ہے۔ اب وہ اشرف المخلوقات ہونے کا دعویدار ہے۔ یہیں سے کشمکش جنم لیتی ہے جس کے نتیجے میں انسان ذہنی طور پر مفلوج ہو رہا ہے۔ مادی ترقی کے لحاظ سے جس طرح وہ آگے جا رہا ہے ذہن بھی اتنی ہی تیزی سے الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہو رہا ہے۔ اب وہ مہذب بھی کہلانا چاہتا ہے۔ ترقی یافتہ بھی اور ساتھ ہی ساتھ حیوانیت کا لیبل بھی مٹانا چاہتا ہے مگر وہ کیا کرے کیونکہ تینوں حقیقتیں ہیں...... اٹل...... نہ جھٹلائی جا سکنے والی......'' پروفیسر نسیم احمد درانی نے ہر چیز واضح کرنے کی کوشش کی...... ساتھ ہی ساتھ وہ سنہرے فریم والی عینک کو کھینچ کر نتھنوں تک لے جاتے اور عینک کے اوپر سے بغور سب کا جائزہ لینا شروع کر دیتے...... پھر عینک کو آنکھوں کے ساتھ لگا لیتے۔

وہ لیکچر بالکل دھیان سے نہ سن رہی تھی...... وہ تو صرف ان کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہی تھی...... کبھی وہ ان سے آنکھیں پھیر لیتی اس انداز سے کہ اس کی آنکھوں میں طنز تھا۔ اب یہ طنز کس کے لیے تھا پروفیسر درانی کے لیے یا لیکچر کے لیے اور اس بات کو پروفیسر درانی لیکچر کے دوران بری طرح محسوس کر رہے تھے۔ اس کلاس کو شروع ہوئے چند دن ہوئے تھے اور اس کا یہ ردِعمل۔ خاص طور پر پروفیسر درانی کے لیے یہ طرز عمل، جن کو سٹوڈنٹس پسند بھی کرتے تھے اور توجہ سے بھی سنتے تھے۔ ناقابل برداشت تھا۔

''مس ضحیٰ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کے یوں **Indifferent** (عدم دلچسپ) ہونے کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' پروفیسر درانی نے تنگ آ کر پوچھا۔

وہ ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لیس سر...... میں یہ لیکچر نہیں سننا چاہتی...... کیوں کہ مجھے آپ سے اختلاف

ہے۔ انسان کبھی مہذب نہیں ہوا ہے وہ کل بھی وحشی درندہ تھا، آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا...... یہ Crust of Civilization اسے تبدیل نہیں کر سکتی۔'' اور بیگ اٹھا کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر آ گئی۔

ہر کوئی حیران تھا...... اس کے اس رویے نے سب کو کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

وہ کلاس کی غیر اہم شخصیت تھی، دبلی پتلی، لمبی سی، سانولی مگر صاف اور نکھری نکھری جلد کے ساتھ ہمیشہ وہ دوسروں کو متاثر کرتی...... چندھی چندھی آنکھیں مگر گھنی اور لمبی پلکوں کے سائے تلے بہت پرکشش لگتیں۔ وہ ہمیشہ لڑکیوں سے الگ تھلگ بیٹھتی...... لڑکوں میں سے ایک دو کے ساتھ صرف ہیلو ہائے تھی۔ پروفیسر درانی پہلے دن ہی اس کو دیکھ کر چونکے تھے اور اپنے اچھے حافظے میں اس کے نام کو محفوظ کر لیا تھا۔ سب لوگ کلاس سے باہر آئے تو صرف وہی موضوع سخن تھی......

کیفے ٹیریا میں اپنی مخصوص کونے والی ٹیبل پر وہ بیٹھی تھی اور بڑے انداز سے سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہی تھی۔ اس کی مخروطی انگلیوں میں بے شمار چھوٹے چھوٹے نگینوں اور نایاب پتھروں کی انگوٹھیاں تھیں ایک ایک انگلی میں دو دو تین تین...... کسی انگلی میں لوہے کی لمبی کوئی مخروطی اور کوئی گول...... ہر شکل کی انگوٹھیاں اس نے پہن رکھی تھیں۔ اس کے دائیں ہاتھ پر پٹی بندھی تھی۔ بال بکھرے تھے......شولڈر کٹ اسٹیپس میں کٹے بالوں کو اس نے یونہی باندھ رکھا تھا بغیر کسی کنگھی اور ترتیب کے جس سے کئی لٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں...... اس نے ٹراؤزرز پہن رکھا تھا اور لمبی سی بلیک اور سفید ڈاٹس والی شرٹ، بلیک چادر نما دوپٹہ دوہرا کر کے گلے میں ڈال رکھا تھا...... ہائی ہیل کے کورٹ شوز...... وہ پہلی نظر میں ہی بہت پرکشش لگتی تھی...... دو تین لڑکیاں، لڑکے اس کی ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ ان کو آتا دیکھ کر خاموشی سے اٹھ کر چل دی۔

''یہ کیا چیز ہے...... اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی نہیں سمجھتی؟......'' تانیہ نے کچھ کچھ اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر اور کچھ حسد کے مارے کہا۔

''مگر ہے کوئی گہری چیز'' فیض بولا۔

''خاک گہری چیز ہے...... بات کرنے کی تمیز نہیں'' فضہ نے لقمہ دیا۔

''ایسے لوگ بلا کے خطیب ہوتے ہیں'' فیض پھر بولا۔

''تم بڑے متاثر لگتے ہو اس سے......'' عزیز نے نظریں گھما کر کہا۔

''یہ تو وقت ہی بتائے گا فی الحال چائے منگواؤ...... ایسے زبردست لوگوں کو دیکھ کر تو ویسے ہی طلب شدید ہو جاتی ہے'' فیض مسکرا کر بولا۔

''دیکھ لو...... وہ پہلے ہی وحشی بول کر گئی ہے...... اس سے مار نہ کھا لینا...... اگر تم نے اپنے آپ کو واقعی ایسا ثابت کر دیا تو......؟'' تانیہ ہنس کر بولی۔

وہ گیٹ تک پہنچے تو وہ پجیرو ریورس کر رہی تھی

''اب تو کچھ سوچنا ہی ہوگا......'' عزیز نے مسکرا کر فیض کی طرف دیکھ کر کہا۔

یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا...... وہ روز نت نئی گاڑیاں لے کر آتی تو یہ ان کے نمبرز نوٹ کرتے...... وہ کیا پہن کر آتی ہے...... خوب ڈسکشن کرتے...... وہ کس وقت کہاں بیٹھی ہے...... کس کے ساتھ، سب نظر میں ہوتا...... کلاس میں کب آتی ہے...... کس کے پاس بیٹھتی ہے...... کس سے بات کرتی ہے...... سب کچھ ڈائری میں درج ہوتا اور پھر اس پر بحث ہوتی...... کیفے ٹیریا میں بھی اس کے قریب بیٹھنے کی کوشش کی جاتی......

کئی دنوں سے وہ کلاس میں نہ آ رہی تھی...... اور پروفیسر درانی نے بھی اس کا کوئی ذکر نہ کیا تھا...... وہ صبح سے کیفے ٹیریا میں جا کر بیٹھ جاتی...... سگریٹ پیتی رہتی...... یا چائے پیتی۔ اس وقت بھی وہ کیفے ٹیریا میں تھی، چائے کا خالی کپ سامنے تھا اور وہ کوئی کتاب دیکھ رہی تھی سب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا...... سوائے فیض کے باقی سب ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھ گئے...... وہ اس کی طرف چلا گیا۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو بیٹھ سکتا ہوں''

''Sure''...... اس نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر جانے لگی۔

''اگر آپ مائنڈ کرتی ہیں تو میں دوسری ٹیبل پر چلا جاتا ہوں''

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کتاب دیکھتی رہی۔

''آپ چائے پئیں گی......؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ایز یو وِش'' اس نے کندھے اچکائے۔

دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے...... اس نے بیگ سے سگریٹ کیس نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

''تھینک یو...... میں سموکنگ نہیں کرتا۔''

جواباً اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی اور وہ اٹھ کر چل دی۔ وہ اٹھ کر ان کے ٹیبل کے پاس آ گیا۔

''جناب فیض صاحب خوب رہی...... اس نے خوب بہتی گنگا میں ہاتھ دھویا......''

تانیہ نے قہقہہ لگایا۔

''اور جاتی دفعہ تھینک یو تک نہیں کہا'' عزیز نے دکھی لہجے میں کہا۔

''تم سب لوگ بہت بے صبرے ہو، ہر بات کا فوری اور حتمی نتیجہ چاہتے ہو۔ ابھی تو مل بیٹھے ہیں...... پھر آگے دیکھیں گے...... سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے...... وہ ہر لفظ چبا چبا کر بول رہا تھا اور سب ہنس رہے تھے۔

......❁......
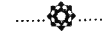
(10)

پورے ہفتے کے بعد وہ کلاس میں جیسے ہی داخل ہوئی سب نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... آج اس کے تراشیدہ بال خوبصورت انداز میں کندھوں پر جھول رہے تھے...... اور اس نے سفید کاٹن کے سوٹ پر سرخ اور سفید پھولوں والی چادر اوڑھی ہوئی تھی...... آج آنکھوں میں بھی قدرے سکون تھا اور طمانیت کی ایک لہر چہرے پر بھی رقصاں تھی...... اس میں ٹھہراؤ اور سلجھا پن خصوصاً نمایاں تھا...... ہر ایک نے مڑ کر دیکھا...... وہ سب سے آخر میں جا کر بیٹھ گئی۔

پروفیسر درانی بھی اس کو دیکھ کر چونکے اور پھر لیکچر شروع کر دیا۔

''انسان کی ارتقاء تب ہی شروع ہو گئی تھی جب اس نے اس زمین پر قدم رکھا اگرچہ ارتقاء کا عمل بہت سست تھا مگر اس کا اثر دیرپا تھا۔ جیسے جیسے اس نے اپنے حواس کو سمجھا اور ان کو عمل میں لانا شروع کیا وہ شعور کے درانے پر قدم رکھتا گیا اور مختلف ادوار میں کامیابی کے ساتھ داخل ہوتا گیا کہیں ایسا نہیں ہوا کہ اس نے اپنی عقل اور ذہن کو استعمال کیا ہو اور اس کو ناکامی ہوئی ہو...... یہاں تک کہ اس کی عقل عرفان کے درجوں تک پہنچ گئی اور حیوان کی عقل وہیں رہی کیونکہ حیوان کی عقل صرف اسے حواس کا علم دیتی ہے...... آج کے انسان کے پاس ہزاروں سالوں کی تہذیب، ثقافت اور ان کا تجربہ ہے۔ آج وہ تنہا نہیں اس کے پاس ہزاروں سالوں کے تجربات کا نچوڑ ہے اگر ان کو وہ بروئے کار نہیں لاتا تو اس کے اور ماضی کے حیوان میں کوئی فرق نہیں۔''

''سر کیا آپ Darwin کی Theory of Evolution سے متفق ہیں۔ اگر ایسا ہے تو انسان کے پھر اسی شکل میں لوٹنے کی چانسز ہیں کیونکہ ہر چیز تو اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے'' کلاس میں ایک نیا سٹوڈنٹ حسن آیا تھا۔ اس نے سوال کیا۔

''یہ کچھ سائنس دانوں کے خیالات ہیں کیونکہ ان کے نزدیک روح ارتقائی ماہیت جماداتی، نباتاتی اور حیوانی مراحل سے گزرتی ہوئی بالآخر انسان کے شعور جذبے اور خواہش میں اپنا ظہور کرتی ہے اور ارتقاء کی یہ منزل ختم نہیں ہوتی بلکہ چلتی رہتی ہے۔ یہ عمل انسان تک آ کر رک نہیں جاتا بلکہ اس سے آگے اعلیٰ تر مخلوق کا امکان موجود رہتا ہے۔ نفس بشری ترقی کی منازل طے کرتا ہوا ملائکہ کی صف میں جگہ پاتا ہے۔ لیکن ہمارا اصل موضوع کہ واقعی انسان بندر تھا۔ میں بذات خود اس سے متفق نہیں ہوں۔ صرف اس بنا پر کہ انسان اور بندر میں ظاہراً کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کا ماضی، بندر سے جوڑنا درست نہیں۔ اگر دونوں کی پیدائش سے لے کر ترقی کی منازل تک کے تمام مراحل کا بغور جائزہ لیا جائے تو فرق خود ہی سامنے آ جاتا ہے۔ پیدائش کے وقت انسان بہت ہی کمزور و نحیف ہوتا ہے کہ نہ بیٹھ سکتا ہے نہ کھڑا ہو سکتا ہے نہ اس کو خوراک کی تمیز ہوتی ہے۔ نہ آگ، ہوا پانی...... کسی چیز میں وہ امتیاز نہیں کر سکتا نہ اس کو نفع کا پتا ہوتا ہے نہ نقصان کا اور بعد میں جیسے جیسے شعور اور ادراک کی منازل طے کرتا ہے تو اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے وہ ہر وقت کائنات کو تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس بندر کا بچہ دوسرے حیوانات کے بچوں کی طرح ایک مخصوص قوت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کافی حرکت کرنے پر قادر ہوتا ہے وہ ماں کی خوراک میں بھی مدد کرتا ہے۔ نفع و نقصان سے بھی باخبر ہوتا ہے۔ اور جبکہ انسان کا بچہ ابھی بیٹھنے کے قابل ہوتا ہے، بندر کا بچہ اپنا رزق تلاش کرنے کے لیے دوڑیں لگاتا ہے۔ اگر دونوں کا اصل ایک ہی ہے تو انسان کا بچہ پیدائش کے وقت عقل اور قوت میں اس سے کم تر کیوں ہے۔ اور پھر انسان ترقی کر کے اتنے عروج پر پہنچ گیا مگر بندر وہیں کا وہیں رہ گیا۔

اور پھر قرآن کا دعویٰ کہ ''ہم نے انسان کو اچھی شکل وصورت میں پیدا کیا اور ہم نے بنی آدم کو عزت و تکریم دی۔'' اس مفروضے کو غلط ثابت کرتا ہے۔

اور دوسرا یہ کہ اس کا بلڈ گروپ انسان کے بلڈ گروپ سے کسی بھی دور میں میچ نہیں کیا۔ اب صرف ظاہری مماثلت کی بنا پر دونوں کے ایک دوسرے کی بنیاد قرار دینا انتہائی غلط ہے۔ یہ دنیا تو عجائب خانہ ہے ہر دم حیران کرنے والی چیزیں ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اب کئی ایسے درخت ہیں کسی پر روٹی کی صورت میں پھل لگتا ہے کسی میں

سے دودھ نکلتا ہے کسی سے لیموں کا رس۔ ہند اور افریقہ میں ایسا درخت ہے کہ اس کے پھل کے اندر کا گودا قوام اور ذائقے میں بالکل بالائی کی طرح ہوتا ہے۔ دریائے گنگا کے کنارے ایک ایسی گھاس دیکھی گئی ہے جس کی پتیاں اسی طرح ہر منٹ میں ساٹھ مرتبہ حرکت کرتی ہیں جیسے کہ نہ بند ہونے والی گھڑی ہو۔ اب کس کو کس کی بنیاد کہا جائے اور کس کو کس سے منسوب کیا جائے۔''

''سر انسان کو آپ آخر کس درجہ میں رکھیں گے جبکہ اس میں حیوانیت بھی موجود ہے اور انسانیت بھی...... یعنی کہ بیک وقت وہ Beast بھی ہے اور god بھی۔ وہ اشرف المخلوقات تو کبھی نہیں ہو سکتا۔'' حسن پھر بولا۔

وہ سخت بور ہو رہی تھی مگر خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔

''انسان کیا ہے؟ اس کو سمجھنا واقعی بہت مشکل ہے۔ اشرف المخلوقات جیسے رتبے کا تعین کرنے کے لیے دوسری مخلوقات کے بارے میں مکمل آگاہی ہونا ضروری ہے اور یہ واقعی بہت مشکل کام ہے۔ البتہ مولانا رومی کہتے ہیں۔ یہ خلاصہ کائنات مجموعہ اوصاف عالم، کوزے میں بند دریا ہے اور راس کے مختصر سے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کہوں ہاں میرے ذہن میں ٹیگور کی ایک اچھی بات آئی ہے'':

**The fish in the water is silent, the animal on the earth is noisy, the bird in the air is singing.
But man has in him the silence of the sea, the noise of the earth and the music of the air.**

''تھینک یو سر'' حسن مسکرا کر بولا۔

ساری کلاس باہر چلی گئی اور وہ وہیں سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگاتی رہی۔

بہت دنوں بعد وہ خوشگوار موڈ میں آئی تھی اور ہمیشہ پروفیسر درانی ایسی ہی گفتگو شروع کر دیتے تھے جس سے اس کو سخت چڑ تھی...... اب ان کے اس لیکچر نے پھر اس کی حالت غیر کر دی تھی...... وہ کافی دیر وہیں بیٹھی رہی جب اچانک حسن کلاس میں داخل ہوا اس کی نوٹ بک اس کی سیٹ پر رہ گئی تھی...... وہ اسے دیکھ کر چونکا اور حیرت سے دیکھتا ہی رہا...... اردگرد کے ماحول سے بالکل بے خبر وہ کیسے سگریٹ سلگائے بیٹھی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

''ایکسکیوزمی آر یو آل رائٹ کوئی پرابلم ہے؟'' وہ حیران ہوئے جا رہا تھا۔ اس نے اپنی انگارہ آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور اٹھ کر باہر چلی گئی وہ مزید حیران ہو گیا۔

(11)

انڈر گراؤنڈ فیز کو رنگ برنگے پھولوں اور برقی قمقموں سے اس قدر خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا کہ اس نے جیسے ہی اندر قدم رکھا اس کے ہوش اڑنے لگے۔ اس کے گھر میں پارٹیز ہمیشہ لاجواب ہی ہوا کرتی تھیں مگر اب کی بار تو سارے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیئے گئے تھے۔ منسٹر (Minister) بننے کے بعد اس کے پاپا کی یہ پہلی پارٹی تھی جس میں ملک کی بڑی بڑی شخصیات مدعو تھیں اور جس شان وشوکت سے اہتمام کیا گیا تھا وہ حیران رہ گئی۔ کباب سے شراب تک سارا انتظام تھا...... اور اس کی ماں جو دو دن پہلے ہی انگلینڈ سے لوٹی تھیں کس طرح سج دھج سے تیار ہوئی تھی وہ حیران ہی رہ گئی وہ خاموشی سے اوپر چلی گئی...... ان کی Hypocrisy (منافقت) پر ہمیشہ اس کا دل کڑھتا تھا۔ دو اجنبی جن کو وہ ماں باپ کہتی تھی۔ دنیا کی نظر میں آئیڈیل کپل تھا...... اسکی ماں اعلیٰ طبقے کی فیشن ایبل خاتون ملک کے نامور سیاست دان کے ہمراہ قدم سے قدم اٹھاتی چلتی تھی تو وہ اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ جاتی تھی...... اور جب دونوں آپس میں کسی موضوع پر بات کرتے تو ہمیشہ توں تکرار کرتے یا پھر گالی گلوچ پر ایک دوسرے سے بات چیت ختم کرتے یا پھر کچھ توڑنے پھوڑنے پر...... اس کا باپ گاؤں سے جب آیا تھا تو سیدھا سادھا انسان تھا اور اب اس میں وحشت ہی وحشت تھی...... اس کے کمرے میں ڈیکوریشن کی بجائے رنگ برنگی مدہوش کرنے والی بوتلیں سجی ہوتیں۔ ہر رات کچھ نہ کچھ ٹوٹتا...... ہر رات وہ کان لگا کر کچھ نہ کچھ سننے کی کوشش کرتی اور اسی طرح سو جاتی...... ہمیشہ کی طرح ہر صبح پرسکون ہوتی...... وہ رات کے نقش ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاتی...... مگر کچھ سراغ نہ ملتا...... نہ کوئی سرا ہاتھ آتا۔ جب زیادہ ٹوٹنے لگتی تو چند گھونٹ وہ بھی پی لیتی۔ پھر سارا سارا دن پڑی رہتی۔

اس کے ماں باپ بہت خوش تھے خوب لائف انجوائے کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک Enjoyment ایسا لفظ تھا جس میں دنیا کی تمام رعنایاں اور خوبصورتیاں سمٹی ہوئی تھیں اور زندگی کا مفہوم ہر لحاظ سے جس طرف سے بھی دیکھو...... دائیں سے بائیں...... پچھم سے پورب سے ایک ہی نقطے پر آ کر ختم ہوتا، دنیا کی اس ڈکشنری سے انہوں نے صرف ایک ہی لفظ منتخب کیا تھا ''انجوائے منٹ'' جس کو وہ بار بار دہراتے رہتے تھے۔

اس کی ماں بوتیک رَن (Run) کرتی تھی ہر دو ماہ بعد وہ بیرون ملک ضرور جاتی تھی اور اس دفعہ تو وہ ایسے ایسے کپڑے لے کر آئی جو ہوش اڑانے کے لیے کافی تھے۔ وہ ہمیشہ ضحیٰ کے لباس پر تنقید کرتی اس کو Ill-mannered ہونے کا طعنہ دیتی...... بلکہ وہ اس کی ذہنی حالت کے بارے میں آہستہ آہستہ مشکوک ہوتی جا رہی تھی۔

''ضحیٰ آج تم میرے ساتھ پارٹی پر چلو گی......'' اس کی ماں اس کے کمرے میں آ کر بولی۔

''ماما...... میری طبیعت ٹھیک نہیں......'' اس نے سستی سے کہا اور ایک نگاہ ماں کیطرف ڈالی تو حیران ہی رہ گئی۔

''سارا بلاؤز Net کا تھا گلے اور بازوؤں کی فرل کے ساتھ ساتھ موتیوں کی جھالر سی لہرا رہی تھی۔ جسم کے سارے حصے اس طرح نمایاں تھے جیسے شفاف پانی کے نیچے بہتے بیل بوٹے...... پتھر اور تمام بل کھاتے ہوئے...... سانس لیتے...... ہانپتے ہوئے جاندار...... وہ حیرت سے دیکھتی رہ گئی...... اتنے میں اس کے پاپا اتنے ہی زیادہ ٹھاٹ سے اندر آ گئے۔ اس نے ایک ٹک باپ کی طرف دیکھا۔

''پاپا آپ جائیں میں ٹھیک نہیں'' وہ آہستہ سے بولی۔

''توفیق میں پہلے ہی کہتی تھی یہ ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہے۔ آپ اس کو کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں۔'' ماں نے رائے دی۔

''تو تم لے جاؤ نا'' باپ نے قدرے برہمی سے کہا۔

''کیوں آپ کو لے کر جاتے ہوئے کیا ہوتا ہے...... آپ کو خود کوئی احساس ذمہ داری نہیں......'' اس کی ماں زبان کی بہت تیز تھی۔

''شٹ اَپ'' وہ غصے سے بولا......

"میں خود چلی جاؤں گی۔ آپ لوگ جہاں جارہے ہیں، پلیز جائیں......" وہ کہہ کر باتھ روم میں گھس گئی۔

ہمیشہ سے ان کی بحث وتکرار اسی طرح سے ختم ہوتی...... وہ تنگ آچکی تھی۔ زمانہ بدل گیا تھا...... ان کے وجود بدل گئے تھے مگر وہ خود نہ بدلے تھے...... ہمیشہ کی طرح کھوکھلے...... دنیا کے سامنے کتنے مہذب...... اور اندر سے اتنے ہی وحشی درندے...... ہر وقت پھاڑ کھانے کو تیار رہتے۔

آہستہ آہستہ وہ زیادہ ڈرنک کرنے لگی تھی اور اب ہر وقت اس کی آنکھوں میں خمار سا چھایا رہتا۔ کلاس میں کبھی کبھار جاتی۔ مگر نیم مدہوشی کی حالت میں حسن نے جب سے اس کو اس حالت میں دیکھا تھا تب سے وہ اس کے بارے میں جاننے کے لیے متجسس تھا۔ ہرایک سے کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ جاننے کی کوشش کرتا مگر ہر کوئی اتنا ہی بے بہرہ تھا جتنا وہ خود۔

"اس نے کبھی اپنے آپ کو ایکسپوز نہیں کیا...... ہمیشہ ڈبیا کی طرح بند رہتی ہے...... خوشنما ڈبیا کی طرح...... جس کو ہر کوئی پکڑنا چاہتا ہے...... چھونا چاہتا ہے، کھولنا چاہتا ہے اور شاید......؟" تانیہ نے کنکھیوں سے فیض کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم تو خواہ مخواہ اس سے حسد کرتی ہو......" فیض غصے سے بولا۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے...... حسد اور وہ بھی اس سے......" وہ منہ پھلا کر بولی۔

وہ باتیں کرتے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے تو وہ سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی...... حسن اس کے برابر جا کر بیٹھ گیا...... لیکچر کے دوران وہ مسلسل اس کا جائزہ لیتا رہا...... اس کا جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا...... وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی...... کبھی ہاتھوں کو زور سے دباتی...... پسینے کی بوندیں تیزی سے اس کے ماتھے پر نمودار ہو رہیں تھیں......

"آپ ٹھیک تو ہیں......" حسن نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"نہیں مجھے ایک گلاس پانی چاہئے......" وہ پانی لینے دوڑا، کلاس میں بھگدڑ سی مچ گئی...... ہر کوئی سرگوشیاں کرنے لگا۔ اس کی ذات موضوع سخن بن گئی کہ جب بھی یہ آتی ہے کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑتی ہے۔

وہ پانی لے کر آیا...... اسے پانی پلایا اور پھر لڑکیاں اسے سِک روم میں لے گئیں جہاں وہ کافی دیر پڑی سوتی رہی۔ سب لوگ اردگرد جمع تھے...... اسے کیا ہوا تھا...... کسی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا...... وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی تھی...... سکون اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا اور وہ اس سکون اس طمانیت کو دیکھ کر حیران بھی ہو رہے تھے اور متجسس بھی۔

......۞......

(12)

''آج کا انسان Nihilism[16] کی طرف مائل ہے۔ اسے کسی کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ مادی ترقی نے اس کے ذہن پر اس قدر قبضہ کیا ہے کہ اس کو کسی بھی چیز کی تمیز نہیں رہی...... اپنے اندر کے Complexes کو دبانے کے لیے نئے نئے کام کرتا ہے۔ اور اسے سائنس کی ترقی کا نام دے کر دل کو تسکین پہنچاتا ہے۔ جب Complexes بہت زیادہ ہو جاتے ہیں تو پھر ذہن کو بروئے کار لا کر انقلابات کے ذریعے دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں...... آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں......؟ ان کا مسئلہ کیا ہے......؟ یہ ایک جگہ نہ ٹک کر کام کرتے ہیں...... نہ ایک نہج پر سوچتے ہیں...... بکھرے بکھرے، پریشان پریشان...... اپنے حواسوں میں پریشان، سوچوں میں پریشان...... بس یہی کچھ رہ گیا ہے''...... فیض چائے کا کپ سامنے رکھ کر اونچی آواز میں بول رہا تھا اور سب اس کے گرد بیٹھے تھے......

حسن کی بھی ان لوگوں سے کافی دوستی ہو گئی تھی اور ضحیٰ کے بھی وہ کافی قریب آ چکا تھا...... دونوں اکثر اکٹھے گھومتے...... اور کیفے ٹیریا میں اکٹھے چائے پیتے، کبھی ان لوگوں سے گپ شپ کے موڈ میں ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتے، ضحیٰ حسن کے ساتھ گھومتی پھرتی ضرور تھی، وہ اکٹھے بھی بیٹھتے تھے، مگر وہ ہمیشہ ایک فاصلہ رکھتی۔ ضرورت کے تحت جواب دے دیتی ورنہ خاموش رہتی۔

''مائی ڈیئر جب Complexes بہت زیادہ ہو جائیں تو انقلابات تو رونما ہوں گے۔ یہ تو فطری عمل ہے...... اس میں حیرانگی کی بات نہیں۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ انسان کے ساتھ پرابلم کیا ہے، تو میرے خیال میں آج کے انسان کا مسئلہ اس کی ''بقا'' کا ہے۔ اس کے وجود کا ہے وہ Survive کرنا چاہتا ہے، بھرپور طریقے سے۔ مکمل حقوق اور اجارہ داری کے ساتھ...... کہیں پہ بھی کمی یا نقص نہ رہے...... جہاں کمی رہ

جاتی ہے وہاں Complexes شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان Nihilist ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے جو وہ کر سکتا ہے کرتا چلا جاتا ہے'' حسن نے اپنی رائے دی۔

''مگر Existentialist[17] بھی تو یہی کہہ چکے ہیں۔ انہوں نے بھی انسان کو نظریات دے دیے پھر بھی اس کو سکون نہیں۔ انہوں نے تو یہاں تک کہا کہ اپنے وجود کی بقا کے لیے جاؤ، جو کچھ ہو سکتا ہے کر لو...... پر دنیا کو کہیں بھی چین نہیں، ایک نظریے کو کیوں نہیں اپناتے......'' عزیز غصے سے بولا۔

''انسان اور ایک نظریے کو مانے...... تم نے کبھی ہماری بات نہیں مانی...... پوری دنیا کہاں اکٹھی ہو گی...... یونہی ہوائی قلعے نہ تعمیر کیا کرو۔'' ثانیہ نے عزیز کو ڈانٹ کر کہا۔

''مس ضحیٰ آپ بھی تو کچھ بولیں......'' حسن نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔

''میں مختلف Concepts کے بارے میں تو نہیں جانتی مگر مجھے ہمیشہ Zola[18] کا Naturalism[19] متاثر کرتا ہے، Naturalist کہا کرتے تھے کہ جب تک انسان دکھ تکلیف، بھوک، سیکس، غربت جیسی بنیادی ضروریات سے بہرہ مند نہیں ہوتا تب تک ذہنی اور روحانی ترقی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا''...... وہ آہستہ سے بولی۔

اس نے پہلی بار بحث میں حصہ لیا تھا اور اس کے لہجے میں ٹھہراؤ پن نے سب کو متاثر کیا۔

''بہت خوب...... بات جہاں تھی وہیں پہ اب بھی ہے...... کہ آخر انسان کیا چاہتا ہے...... اس کو کدھر جانا ہے...... وہ جو سوچتا ہے وہ کیونکر اس پر عمل درآمد نہیں کر پاتا......'' فیض نے جواب دیا۔

''اس میں Mismatch Theory چلے گی کہ آج کا انسان سوسائٹی میں مس فٹ ہے۔ اس کا اندر کچھ اور چاہتا ہے اور باہر کچھ اور۔ اس کے لاشعور میں وہی پرانا حیوان چھپا بیٹھا ہے اور باہر سے وہ مہذب دنیا کا باسی ہے......'' جیسے ہی حسن نے کہا سب نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ضحیٰ کی طرف...... کہ اب اس کا کیا رد عمل ہو گا...... مگر نہ تو آج وہ بھڑکی اور نہ کچھ کہا...... خاموشی سے سنتی رہی۔

''اسی لیے میں بھی کہوں...... انسان کھنڈرات میں اتنی دلچسپی کیوں لیتا ہے...... کہیں کوئی غار نما کھنڈر دیکھ لے...... لپک لپک کر اس کی طرف جائے گا...... پرانی چیزوں

کو منہ مانگے دام دے کر خریدے گا اور پھر فخریہ بتائے گا کہ وہ ان چیزوں کا کتنا شیدائی ہے..... باوجود مہذب ہونے کے کتنا قدیم ہے..... اصل میں وہ اپنے لاشعور کے جذبے کو تسکین پہنچانا چاہتا ہے۔'' فضہ نے بات بدلنے کے لیے اپنی رائے دی۔

''ہاں..... چلو اسی سے کسی کھنڈر پر جانے کا پروگرام بناتے ہیں، انجوائے کریں گے''..... حسن نے رائے دی تو سب نے شور مچانا شروع کر دیا۔ صرف وہی خاموش تھی۔

''ضحیٰ تم کیوں نہیں بول رہی.....؟'' فیض نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔

''میرا موڈ نہیں.....'' وہ آہستہ سے بولی۔

''تمہارا موڈ کیوں نہیں؟..... ہمیں گاڑیوں میں بھر کر کس نے لے کر جانا ہے.....'' عزیز نے صاف گوئی سے کہا۔

جواباً وہ کھلکھلا کر ہنسی..... شاید زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح ہنسی تھی..... اس کی کھنک دار ہنسی کو سب نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

سب لوگ تیار کھڑے تھے جب پروفیسر درانی پاس سے گزرے، انہوں نے حیرت سے سب کو دیکھا اور سب سے زیادہ اس کو..... اس کو ہمیشہ پروفیسر درانی کی ان نگاہوں سے خوف آتا تھا..... ہمیشہ معنی خیز انداز میں ایک نگاہ اس پر ڈالتے اور چلے جاتے..... آج بھی انہوں نے ایسا کیا..... تو اس نے فوراً نگاہیں پھیر لیں۔

''پروفیسر درانی کو بھی نہ لے لیں.....'' فضہ نے رائے دی۔

''رنگ میں بھنگ نہ ڈالا کرو..... معلوم بھی ہے..... کس کے ساتھ جانا ہے۔'' ثانیہ نے اس کو گھورا۔

حسن راستہ بتاتا جاتا اور وہ ڈرائیو کرتی رہی..... دوسری گاڑی کو فیض ڈرائیو کر رہا تھا..... ثانیہ اور عزیز اس کے ساتھ تھے۔ فضہ اور حسن، ضحیٰ کے ساتھ۔

''حسن کہاں لے آئے ہو.....؟'' اتنا خطرناک راستہ..... جگہ جگہ کھڈ..... چھوٹی سی تنگ سی سڑک کہ ایک ہی گاڑی مشکل سے گزر سکتی ہے۔'' ضحیٰ منہ بنا کر بولی۔

''جناب غاروں کی طرف ایسے ہی راستے جاتے ہیں..... اب جی ٹی روڈ تو جانے سے رہی۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''تھک گئی ہو تو میں ڈرائیو کرتا ہوں۔'' حسن مسکرا کو بولا

''چیلنج مت کرو''..... اور اس نے غصے میں ایکسیلیٹر پر دبا کر پاؤں رکھا۔

''آرام سے..... دوسری طرف خطرناک موڑ ہیں..... کیوں غاروں سے سیدھا اوپر پہنچانے کا پروگرام ہے۔''

چار گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچے۔ ہر طرف ٹوٹی پھوٹی شکستہ عمارتیں تھیں..... بالکل ہی کھنڈر..... کہیں کہیں غار نما سے گھر بنے تھے..... سب لوگ حیرانگی سے ان عمارتوں کو دیکھتے رہے..... اور ان میں گھومتے رہے..... ساتھ ہی نہر تھی..... وہ اس کے کنارے بیٹھ گئی.....

''تم نہیں چلو گی.....'' حسن نے ضحیٰ سے پوچھا۔

''نہیں..... مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''کیا کہا..... اور اتنا سفر تم نے کس کھاتے میں کیا؟'' حسن برہم ہو رہا تھا۔

''وقت گزارنے کے لیے۔''

''اچھا چلو..... میں کچھ نہیں سننا چاہتا..... اٹھو اور سب کے ساتھ مل کر گھومو پھرو۔''

''پلیز حسن مجھے یہیں رہنے دو.....'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے..... میں ابھی آتا ہوں۔''

اور وہ وہیں سر گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ گئی، وہ کہیں بھی چلی جائے..... ویرانے میں..... گھر میں..... کسی محفل میں وہ خوش کیوں نہیں ہوتی..... اس کا اندر ہر وقت کیوں اتنا سنسان رہتا ہے..... وہ ہر وقت تنہائی کیوں چاہتی ہے..... ہر وقت دکھ سا رگ و پے میں کیوں سرایت کرتا رہتا ہے۔ جیسے خون گردش کرتا رہتا ہے۔ کیا اس کے اندر اتنے زیادہ Complexes ہیں..... اور جب Complexes زیادہ ہو جائیں تو انقلاب رونما ہوتا ہے۔ کیا کوئی انقلاب اس کی زندگی میں بھی آئے گا..... جو اس کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا..... نہیں گیلی لکڑی میں کبھی آگ نہیں لگتی وہ ہمیشہ آہستہ آہستہ سلگتی رہتی ہے اور وہ بھی تو گیلی لکڑی تھی..... جو لمحہ بہ لمحہ سلگ رہی تھی..... بلکہ جل رہی تھی..... مگر وہی نہیں سمجھتے تھے جن کے وجود سے اس نے جنم لیا تھا..... کبھی کیکر پر بھی پھول لگتے ہیں.....؟ کبھی ببول سے بھی خوشبو نکلتی ہے.....؟ وہ کیا سوچ رہی تھی..... اس نے پتھر اٹھا کر پانی میں زور سے پھینکا اور اٹھ کر چلی آئی۔

......❁......

(13)

نیو ائیر کی آمد آمد تھی اور اس کے والدین بے حد مصروف تھے۔ پروگرام مرتب کیے جا رہے تھے۔ پلاننگز ہو رہی تھیں۔ اس کی ماں ہر وقت کپڑوں کی سلیکشن میں ہی مصروف رہتی...... ان کے گھر میں زبردست پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا مگر وہ ایسے ہنگاموں سے دور بھاگتی تھی...... اس کا منفی رویہ دیکھ کر اس کی ماں بھڑک اٹھی۔

''توفیق اس اکلوتی اولاد کو تم خود ہی سنبھالو...... کل کو اس کی کہیں شادی نہ ہوئی تو مجھے مت کہنا۔'' مسز توفیق نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ضحیٰ تم آخر چاہتی کیا ہو......؟ یہ ہمارا سیٹ اپ ہے اور اس میں اسی طرح Move کرنا پڑتا ہے، باہر نکل کر دیکھو تو پھر تمہیں پتا چلے کہ اس دنیا کے کیا کیا تقاضے ہیں...... اپنے آپ کو اس دنیا کے فریم میں فٹ کرنے کے لیے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ اور بعض اوقات تو اتنی کوشش کے باوجود انسان پھر بھی اس میں اپنے آپ کو فٹ نہیں کر پاتا، تم تو خوش قسمت ہو کہ سب کچھ بنا بنایا تمہارے پاس ہے۔'' اس کے باپ نے اسے سمجھایا۔

''پاپا آپ کیا چاہتے ہیں......؟'' اس نے اداسی سے کہا۔

''یہی کہ تم گھوم، پھرو، لائف انجوائے کرو...... پارٹی ہو رہی ہے اس میں شرکت کرو...... تم ہنسا بولا کرو...... ہر وقت چپ چاپ نہ رہا کرو......'' اس کے باپ نے بہت پیار سے اسے سمجھایا تو اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔

''ٹھیک ہے پاپا...... میں جاؤں گی......'' وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

اس کے باپ کے بہت قریبی دوست آفتاب قریشی کے بیٹے عمیر نے شہر سے باہر ریسٹ ہاؤس میں پارٹی کا اہتمام کیا تھا...... اوپن ائیر میں رنگا رنگ لائٹنگ...... چمکیلے

بھڑکیلے لباس...... مہکتے وجود...... رنگ و نور کا سیلاب سا اُمڈ آیا تھا...... ہوا میں خنکی تھی۔ مگر ہر کوئی مستی سے سرشار تھا۔ تمام نوجوان اس پارٹی میں مدعو تھے اور بہت دنوں سے ان لمحات کے منتظر تھے...... جن کے لیے انہوں نے نجانے کیا کیا پروگرامز مرتب کیے تھے اور جو کب سے ان کے تخیل کو گرما رہے تھے...... سب نے مل کر خوب غل غپاڑہ کیا...... موسیقی کی محفل کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔

وہ کونے میں بیٹھی سب ہنگامہ دیکھ رہی تھی اور موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی، عمیر اس کی طرف آیا۔

''ضحیٰ آپ یہاں بیٹھی ہیں...... میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا......؟'' عمیر نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کے پاپا نے بہت تاکید کی تھی کہ آپ کو بور نہ ہونے دیا جائے۔''

''میں بالکل بور نہیں ہو رہی۔''

''کچھ پیا پلایا بھی کہ نہیں''

''موڈ نہیں''

''کمال کرتی ہیں آپ بھی Let's have a toast of pleasure'' اس نے ڈرنک کا ایک گلاس اسے تھمایا۔

''اس نے آہستہ آہستہ پینا شروع کیا تو اردگرد کا سارا ماحول روشن سا ہوتا گیا...... عجیب سی کیفیت ہونے لگی...... وہ پہلے بھی ڈرنک کرتی تھی...... مگر ایسا طاقتور...... ڈرنک اس نے کبھی نہ لیا تھا...... وہ خاموشی سے باہر نکل آئی...... گاڑی پوری رفتار سے وہ سڑک پر دوڑا رہی تھی...... لوگ آج انجوائے منٹ کے موڈ میں تھے اس لیے عجیب و غریب حرکتیں کر رہے تھے...... اچانک ایک گاڑی نے اسے overtake کیا اور اسے رکنے کو کہا...... اس کا دماغ پہلے ہی ماؤف ہو رہا تھا۔ اس سچوئشن پر وہ گھبرا سی گئی...... بارہا گاڑیوں نے اس کا تعاقب کیا تھا...... مگر آج ایک دم اس نے حوصلہ ہار دیا...... یا شاید وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ کبھی بڑے سے بڑا واقعہ حقیر لگنے لگتا ہے تو کبھی معمولی سی بات زندگی کا روگ بن جاتی ہے کیونکہ وقت اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ گاڑی کا

اوور ٹیک کرنا ہمیشہ اسے ایک معمولی سی بات لگتی تھی مگر اب یہی معمولی سی بات کسی بڑے خطرے، کا پیش خیمہ لگ رہی تھی نجانے کیوں وہ اندر ہی اندر ڈر سی گئی اور کبھی کبھی اندر کا ڈر چاہے وہ رائی کے ذرّے کے برابر ہو یا محض ایک کھٹکا، ساری کی ساری بہادری کو بہا لے جاتا ہے اور انسان راکھ کے ڈھیر کی مانند بکھرتا چلا جاتا ہے...... وہ بھی لمحہ بہ لمحہ بکھر رہی تھی...... اندر کا خوف آہستہ آہستہ اسے راکھ کے ڈھیر میں منتقل کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سٹیرنگ پر سے ڈھیلے پڑنے لگے، پاؤں بدحواسی میں Clutch اور Race کو بیک وقت دبانے لگے مگر بے سود...... اچانک اس کی گاڑی جھٹکے سے رکی۔ اگلی گاڑی سے اوباش قسم کے چند نوجوان باہر نکلے...... ایک دم سڑک اس کو سنسان سی لگنے لگی اور واقعی سڑک پر اس وقت کوئی گاڑی نہ گزر رہی تھی۔

دور دور تک کہیں کوئی آدم زاد نظر نہیں آ رہا تھا سوائے ان کے، لائٹس بھی مدھم مدھم جگنوؤں کی مانند جل بجھ رہیں تھیں اور ان سبز، زرد اور سرخ بتیوں میں اس کا پیلا پڑتا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا دماغ پہلے ہی ماؤف تھا اوپر سے اس سچویشن نے اس کو بالکل ہی کمزور کر دیا مگر پھر بھی اس نے ہمت کی۔

"کیا بات ہے؟" وہ بمشکل بولی، الفاظ پر اس کی گرفت انتہائی کمزور تھی۔

"We only want your company" ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

"شٹ اَپ......" وہ غصے سے چلائی۔

"برا منانے کی کیا بات ہے، بس گپ شپ ہو گی...... خوب گزرے گی!"

"بکواس بند کرو"

"زیادہ باتیں مت کرو اور باہر آؤ ہمارا اور اپنا وقت ضائع مت کرو" ایک نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسے باہر گھسیٹنے لگا...... بدحواسی میں اس نے چلانا شروع کر دیا۔ معاً ایک گاڑی قریب آ کر رکی...... جس میں ایک درمیانی عمر کا مدبر سا آدمی بیٹھا تھا...... اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح تاباں تھا اور چہرے پر پھیلا نور، روشن وذہین آنکھیں...... وہ ہر طرح سے پرسکوں لگ رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک عورت دو بچوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"ضحیٰ بیٹی ہم تمہیں ہی لینے آ رہے تھے...... کون ہیں یہ لوگ؟" آدمی نے اس

پیار سے کہا تو وہ دنگ رہ گئی۔ وہ جلدی سے بازو چھڑا کر ان کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سب حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، انہوں نے جھٹکے سے گاڑی سٹارٹ کی۔ کسی نے کوئی سوال نہ کیا۔

عورت نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا اور پھر اس کے نیم عریاں لباس کی طرف...... وہ ان نظروں کی تاب نہ لا سکی اور خود ہی سمٹنے لگی۔ عورت نے بیگ سے چادر نما کپڑا نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے خاموشی سے اسے اپنے اردگرد ڈال لیا...... وہ اندر ہی اندر شرمندہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نیلے پڑتے ہونٹ اور سرد وجود نظروں کی گرمی کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ زور زور سے سانس لے رہی تھی تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک عظیم الشان گھر کے سامنے رکی۔ وہ سب نیچے اترے...... وہ وہیں بیٹھی رہی۔

"آؤ تم بھی"...... خاتون نے شائستگی سے کہا اور وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل دی...... خاتون اسے لے کر ایک کمرے میں گئی۔

"جو کچھ کھانا ہو فریج میں رکھا ہے، فون بھی ہے گھر اگر اطلاع کرنا ہو تو کر لینا...... بہتر یہی ہے کہ سو جاؤ...... صبح بات کریں گے۔"

"مگر......؟" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ وہ جا چکی تھی...... اور وہ دھڑام سے بیڈ پر گر گئی۔ اس نے زندگی میں کبھی اپنے آپ کو اتنا رذیل نہ سمجھا تھا جتنا آج...... اس کے Complexes میں ایک اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی ذات کی توہین ہوئی تھی...... اتنی شرمندگی...... اتنی ندامت...... اس کا اندر ٹوٹنے لگا۔ وہ اتنا روئی کہ شاید کبھی نہ روئی ہو گی Egoist تو تھی ہی اور چوٹ بھی کہاں اور کیسے لگی تھی...... تڑپ بہت شدید تھی...... ایسے میں نیند کہاں آنی تھی۔ اس نے کلاک کی طرف نگاہ دوڑائی۔ چار بج رہے تھے...... رات گزر گئی تھی مگر اپنے پیچھے کیا کچھ چھوڑ گئی تھی...... کسی کو کیا خبر تھی۔ وہ یونہی بے حس وحرکت بیٹھی رہی جب تھوڑی دیر کے بعد اس نے گھر میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ محسوس کی، آہستہ آہستہ آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ چونکی اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا۔

دو محترم پیکر خلوص ومحبت سے بارگاہ خداوندی میں اپنی نیاز مندیوں کے نگینے بکھیر رہے تھے۔ رحمٰن کے قدموں میں نہایت سعادتمندی سے بوسے دے رہے تھے۔ نیاز مندی کا یہ نظارہ اس نے پہلی مرتبہ کسی گھر میں دیکھا تھا۔ دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول

گیا...... اور کسی چیز کی شدید کمی کے احساس پر افسردہ سا ہونے لگا...... کمرے میں جا کر وہ صوفے پر گر گئی۔ دل کی اضطراری کیفیت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یوں بے قرار ہوتا جارہا تھا جیسے شدت غم سے پھٹ جائے گا۔ ایسے جیسے آزاد پنچھی کو پہلی بار پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو اور وہ پر پھڑپھڑا کر بے دل ہو کر اس کی سلاخوں کے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا ہو۔ اس کا دل کانچ کے گھروندے کی مانند ایک ہی وار میں چکنا چور ہو گیا تھا۔ اور اب کرچیاں اس طرح بکھری تھیں کہ خود انگلیاں لہولہان ہو رہی تھیں۔ جسم سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ آنسو اس طرح رواں ہوئے کہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ کیا ہوا تھا...... کچھ سمجھ نہ آرہا تھا...... بس کچھ ہوا تھا...... کچھ چھن جانے کا احساس...... شدید احساس محرومی...... اور یہ احساس اتنا شدید تھا کہ اس کرب سے وہ بلبلا اٹھی...... پھر روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح کے سات بج رہے تھے جب ملازمہ اسے بلانے آئی۔

''بی بی جی...... ناشتہ کے لیے بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں...... اور انہوں نے یہ کپڑے دیے ہیں۔''...... وہ کپڑے بیڈ پر رکھ کر چلی گئی۔ اس نے کپڑوں کو اٹھا کر دیکھا، میرون کلر کا کاٹن کا سوٹ کف کالر والی شلوار قمیض اور بڑا سا پھولدار دوپٹہ...... اس نے باتھ روم میں جا کر فوراً لباس تبدیل کیا...... اسے یوں لگا جیسے زندگی میں پہلی بار اس نے لباس پہنا ہو، بالوں کو سمیٹ کر اس نے پیچھے کیا۔ آئینے میں اس کو اپنا وجود اور شکل بدلی بدلی لگنے لگی۔ دوپٹہ اوڑھ کر باہر نکلی تو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈائننگ ٹیبل کے پاس آ گئی۔

''بیٹھو''...... خاتون نے کہا۔

نظریں جھکائے وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ بیگم سلائس پر جیم لگا کر شوہر کو دے رہی تھی۔ ان کے شوہر نے سلائس پلیٹ میں رکھ کر اس کی جانب بڑھایا۔

''مجھے بھوک نہیں......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کفرانِ نعمت رزاق کی توہین ہے......'' ان کے لہجے میں رات کے واقعہ کے باوجود بے انتہا پیار، شیرینی، مٹھاس اور حلاوت تھی کہ بمشکل اس نے آنسوؤں کو ضبط کیا اور آہستگی سے پلیٹ سامنے رکھ لی۔

''کیا لوگی، چائے، دودھ یا کافی؟'' خاتون نے پوچھا۔

''کافی......'' وہ آہستگی سے بولی۔

اور انہوں نے ملازمہ کو کافی لانے کو کہا...... سب خاموشی سے ناشتہ کرتے رہے...... پھر ڈرائیور بچوں کو لینے آ گیا...... دونوں میاں بیوی وہیں ٹیبل پر اس کے ساتھ بیٹھے رہے تب شوہر نے سکوت توڑا۔

''میں اسفندیار فریدی ہوں...... یہ میری بیگم مومنہ فریدی ہیں۔ میرا بہت وسیع بزنس ہے...... اور میری آپ کے والد سے خاصی جان پہچان ہے...... آپ کو شاید یاد نہ ہو لیکن اکثر پارٹیز میں میرا مطلب ہے بزنس کے سلسلے میں آپ کے گھر آنا جانا ہوا اور تب ایک دو دفعہ میں نے آپ کو وہاں دیکھا...... میں نے رات کو ہی آپ کے پاپا کو اطلاع دے دی تھی...... فکر کی بات نہیں...... میرا خیال ہے اب مجھے آپ کو گھر چھوڑ آنا چاہئے۔''

وہ خاموشی سے اٹھی اور ان کے ساتھ چلنے لگی...... مومنہ بیگم انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئی، اور بہت پیار وخلوص کے ساتھ اسے رخصت کیا...... وہ نادم سی پشیمان سی سر جھکائے بیٹھی تھی...... انہوں نے گزشتہ واقعہ کی طرف اشارہ تک نہ کیا۔

''کون ہو تم......؟ کبھی سوچا ہے اس کے بارے میں'' فریدی صاحب نے گاڑی میں اچانک سوال کیا تو وہ چونک سی گئی۔

''جی...... کک...... کیا...... میں سمجھی نہیں'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''رحمان کو جانتی ہو......؟'' فریدی صاحب نے دوسرا حملہ کیا۔

''کون...... نہیں تو......؟'' اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''کبھی کوئی پینٹنگ دیکھی ہے......؟''

''جی کئی بار......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''پینٹنگ دیکھ کر کیا سوچتی ہو...... میرا مطلب ہے کیا کہتی ہو؟'' فریدی صاحب کا لہجہ آہستہ آہستہ اسے اعتماد بخش رہا تھا...... اعتماد بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ کبھی منوں مٹی کے ایستادہ وجود کو وہ رفعت عطا کرتا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا کی تمام مسافتوں کو چھوڑ کر فضا میں معلق ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا محروم کرتا ہے کہ دھڑام سے زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں پیوست ہو جاتا ہے...... وہ بھی اسی طرح لحہ بہ لحہ پر اعتماد ہو رہی تھی......

''پینٹنگز دیکھ کر ہمیشہ آرٹسٹ کو Appreciate کرتی ہوں۔'' وہ بمشکل بولی۔

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے......؟'' فریدی صاحب نے پھر سوال کیا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکی۔

''تمہاری ذات کی حقیقت...... اس کی وابستگی...... اس کی پہچان کیا ہے......؟''

جواباً وہ خاموش رہی۔

''کیا کبھی تم نے کسی کو چاہا یا کسی نے تم کو چاہا......'' فریدی صاحب نے پھر سوال کیا؟

''معلوم نہیں۔'' اس نے حیرانگی سے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے پھر تمہیں چاہے جانے اور نہ چاہے جانے کی لذت سے، اس درد سے کبھی آشنائی نہیں ہوئی...... کسی سے بھی وابستگی کے لیے یہ پہلا قدم ہے...... اس پر غور کرنا، اور ہاں زندگی کا بنا سوچے سمجھے انجوائے کرنا انسانیت کا وہ درجہ ہے جہاں سے ایک قدم کے فاصلے پر ایسا پتھر منتظر ہوتا ہے جو ذرا بھی متوازن اور ہموار نہیں ہوتا...... اور جیسے ہی لڑکھڑاتے قدم اس پر پڑتے ہیں تو یہ اپنا توازن کھو دیتا ہے اور مسافر دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے...... پاتال کی گہرائیوں میں...... ہمیشہ کے لیے، پھر اٹھنا محال ہو جاتا ہے...... پھر منزل ختم ہو جاتی ہے...... حاصل اور لاحاصل...... حدود اور لامحدود کی کشمکش ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیتی ہے کیونکہ پتھر اور مسافر ہمیشہ کے لیے پاتال کے مکین بن جاتے ہیں...... اپنے آپ کو سمجھو...... ناسمجھی میں جو سفر تم طے کر آئی ہو...... اس کو چھوڑو...... اور شعور کی آنکھ کھولو...... انسان اس کائنات کا معجزہ ہے اور اس طرح ضائع ہو...... قدرت کو کبھی منظور نہیں...... بھٹکتے انسان ہی ہیں...... مگر ہدایت بھی تو وہی پاتے ہیں...... لیکن اس کے لیے انسان کا انسان ہونا شرط ہے...... حقیقت کو جاننے کی کوشش کرو...... پرت پرت کھلتی جاؤ گی...... اور جب حقیقت واضح ہو جائے تو پھر بات کروں گا...... یہ میرا کارڈ رکھو...... جب کوئی مسئلہ ہو، ضرورت ہو تو رابطہ کر لینا'' انہوں نے اسے گیٹ کے سامنے اتارا...... اس نے نہ ان کو اندر آنے کو کہا نہ کچھ اور...... بس حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

......❁......

(14)

جب سے وہ گھر لوٹی تھی بے حد پریشان تھی...... اپنے کمرے میں بیٹھ کر چپ چاپ سوچتی رہتی...... سوچتے سوچتے اشکوں کا سیلاب تمام بندھن توڑ کر آزادی سے رواں ہو جاتا...... تو وہ اور مضطرب ہو جاتی......

وہ سب کیا تھا...... وہ لہجہ...... وہ باتیں...... وہ ندامت...... وہ احساس...... شاید احساس زیاں...... وہ شناسائی...... وہ پتھر...... وہ پینٹنگ...... اور......اور...... وہ رحمان...... کون...... کیا ہے سب؟...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی مگر اندر کا غبار کم نہ ہوتا...... میں کیا ہوں...... مجھے خود معلوم نہیں۔ شاید انسان......؟ شاید نہیں یقیناً......؟ تو پھر انہوں نے مجھ سے کیوں پوچھا...... کہ میں کون ہوں؟...... اس کا کیا مطلب ہے......؟ وہ کیا چاہتے ہیں...... مجھ سے اس طرح کی باتیں کیوں کیں......؟ یہ اضطراب کیوں ہے......؟ یہ کیسی چبھن ہے......؟ یہ درد...... یہ تڑپ...... عجیب سا احساس...... یہ کیفیت...... میں فنا ہو جاؤں گی، مجھ سے کچھ برداشت نہیں ہو رہا...... میں کیا ہوں......؟ میری حقیقت کیا ہے......؟ اور میری وابستگی کس سے ہونی چاہئے......؟ آج تک مجھ سے کسی نے یہ نہ پوچھا تھا...... پھر انہوں نے یہ سب مجھ سے کیوں پوچھا...... وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی...... زندگی میں کبھی اس نے ایسا سوچا ہی نہ تھا...... اس کے ذہن میں ہمیشہ باغیانہ خیالات پرورش پاتے تھے...... یا پھر اپنی محرومیوں کے بارے میں ہی سوچتی تھی...... اس کے علاوہ کبھی کسی اور بات کو سوچنے کی اس کے پاس فرصت نہ تھی...... اور اب جو سوچنے لگی تو اپنے آپ میں خود ہی الجھ کر رہ گئی...... زندگی کی تمام رعنائیاں...... لطافتیں...... سب محو خیال ہو گئیں...... باقی کچھ بھی نہ رہا...... بس ہیولے سے...... بے یقینی سی، مسکراتے چہرے تخیل میں ابھرتے لیکن اگلے ہی لمحے درد کی ایک لہر سینے میں اٹھتی اور

سب کچھ بہا کر لے جاتی...... پیچھے جو رہ جاتا وہ سب بڑا مضطرب اور تکلیف دہ تھا...... بالکل ناقابل برداشت......

اس نے دروازہ لاک کیا ہوا تھا...... پاس پڑا فون مسلسل بج رہا تھا مگر اس کا دل بالکل اسے سننے کو نہ چاہ رہا تھا...... بہت بیلز کے بعد اس نے فون اٹھایا۔

''ہیلو'' وہ نقاہت سے بولی۔

''ہیلو کیا بات ہے...... فون نہیں اٹھا رہی تھی...... اور آواز میں اتنی نقاہت کیوں؟...... کیا مسئلہ ہے؟......'' حسن پرشوق لہجے میں بول رہا تھا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''کیا ہوا طبیعت جاناں کو......'' وہ شوخ ہو کر بولا۔

''بکو نہیں......'' وہ خفگی سے بولی۔

''اب زیادہ بور نہیں کرو...... آج تیار رہنا...... فیض کے ہاں پارٹی ہے، ہم سب جا رہے ہیں میں تمہیں لینے آؤں گا۔''

''کون فیض......؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''ضحیٰ...... کیا ہوا ہے تمہیں...... میرا خیال ہے تم واقعی ٹھیک نہیں...... فیض اپنا جگر...... اپنا دل اور کون؟'' وہ بولتا ہی گیا۔

''اوہ آئی سی......'' اسے شرمندگی سی ہوئی۔

''سوری حسن...... میری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں...... اور میں کہیں نہیں جا رہی''

اس نے فون بند کر دیا بلکہ پلگ ہی نکال دیا اور نوکروں سے بھی کہہ دیا کہ ہر ایک کو کہہ دیں کہ وہ گھر پر نہیں ہے......

کئی دن وہ کمرے میں لیٹی رہی...... بہت کم کسی سے بات کرتی...... مما ان دنوں پھر کینیڈا بزنس کے سلسلے میں چلی گئیں...... پاپا اپنے کام میں مصروف ہو گئے...... نوکر آتے جاتے پوچھتے...... کبھی پانی منگوا لیتی...... کبھی کافی...... کبھی کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوتا...... جب زیادہ طبیعت بے چین ہوتی تو ڈرنک کر لیتی......

''لگتا ہے بی بی کو کوئی پریشانی ہے...... پہلے تو کبھی گھر نظر نہ آتی تھی، اب سارا سارا دن گھر پڑی رہتی ہے۔'' بشیراں نے فضل کریم ڈرائیور کو کہا۔

''ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے...... اور شکل پر بھی کتنی ویرانی چھائی ہے...... یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بڑی پریشانی ہے۔ بڑے لوگوں کی پریشانیاں بھی ان کی طرح بڑی اور انوکھی ہوتی ہیں۔'' فضل کریم نے جواب دیا۔

شام کے سائے آہستہ آہستہ گہرے ہوتے جا رہے تھے...... سارا گھر روشن ہو گیا تھا مگر اس کا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا...... اور لاکڈ بھی تھا...... کوئی اس طرف نہ آیا نہ گیا...... وہ رات بھر جاگتی رہی...... آنکھیں موندے...... مگر ذہن اس قدر تیزی سے حرکت کر رہا تھا، آگے پیچھے کے واقعات اتنی تیزی سے گھوم رہے تھے...... ذہن مسلسل بول رہا تھا...... اتنا بول رہا تھا کہ وہ تنگ آ گئی اور اس سے التجائیں کرنے لگی کہ خدا کے لیے چند لمحوں کے لیے چپ ہو جاؤ...... میں تھک گئی ہوں تمہیں سنتے سنتے...... صرف چند لمحوں کے لیے سو جاؤ...... مگر وہ کہاں کچھ سن رہا تھا...... عجیب و غریب سوچیں...... واہمے...... اس کی تردید...... لیکن مرض بڑھتا ہی گیا جوں جوں دوا کی...... وہ جتنا مثبت طور پر سوچنے کی کوشش کرتی طبیعت میں مزید اضطراب پیدا ہوتا جاتا۔

ایک دن اچانک حسن خود اسے لینے آیا...... اس کا بدلا ہوا نقشہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا...... نہ کپڑوں کی پرواہ...... نہ بکھرے بالوں کا خیال...... چہرے پر عجیب سی مردنی اور پژمردگی چھائی تھی...... آنکھیں شب خوابی کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں...... وہ اس کو اس حلیے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ہیلو...... کیسی ہو؟......'' وہ زبردستی مسکراہٹ چہرے پر لا کر بولا......

''ٹھیک ہوں......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کیا ہوا؟...... کوئی بات ہوئی ہے...... آئینہ دیکھا ہے...... یہ کیا صورت بنائی ہے......؟'' حسن نے اس کے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا ہوا......؟'' اس نے یوں حیرت سے پوچھا کہ حسن حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''ضحیٰ...... تم بالکل ٹھیک نہیں...... تمہارے ماما پاپا کہاں ہیں؟''

''ماما کینیڈا گئی ہیں اور پاپا بزی ہیں......''

''اور تم اکیلی ہو؟......''

''ہوں...... ہاں...... پتا نہیں''

''تم یہ لاتعلقی کس سے ظاہر کر رہی ہو اور اگر تم کو میرا آنا برا لگا ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔'' وہ قدرے موڈ بنا کر بولا۔

''حسن پلیز مجھ سے کچھ مت پوچھو...... میں بہت اَپ سیٹ ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''لیکن کچھ بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا...... آخر بتاؤ تو سہی'' حسن نے خفگی سے جواب دیا۔

''پلیز مجھ سے مت پوچھو'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''چلو میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔'' حسن ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا

''کیوں......؟'' اس نے حیرت سے حسن کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''بھئی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں''

''لیکن مجھے کوئی تکلیف نہیں۔'' اس نے حیرانگی سے جواب دیا۔

''ضحیٰ...... اف......'' اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''بہر حال میں تمہیں لینے آیا ہوں......؟''

''میں کہیں نہیں جانے کی......''

''تم چلو گی...... اور ضرور چلو گی......'' حسن نے اس قدر اصرار سے کہا کہ وہ چپ ہوگئی۔

''اچھا چلو......'' کچھ سوچ کر وہ اٹھی۔

''کہاں......؟ اس طرح......'' وہ حیران ہو کر بولا۔

''ہاں...... کیا ہوا؟......'' وہ حیرت سے بولی۔

''یہ حلیہ دیکھ رہی ہو...... جاؤ چینج کرو......''

''حسن پھر میں نہیں جاؤں گی......''

''پلیز ضحیٰ......'' حسن کے لہجے میں بے پناہ اصرار تھا۔

''اچھا......'' اور وہ سادہ سا لباس پہن کر آئی۔

حسن کو برا تو لگا مگر وہ خاموش رہا۔

''سارا راستہ وہ بھی خاموش رہی...... بالکل ساکت سی...... منجمد سی...... ویران

سی...... بکھری بکھری سی...... بھربھری ریت کی مانند...... حسن نے کئی دفعہ گاڑی روک کر اس کی جانب دیکھا مگر وہ اردگرد سے بالکل بے نیاز بیٹھی تھی۔

''ضحیٰ...... مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تمہارا عادی ہوتا جا رہا ہوں...... تم سے ایک دن نہ ملوں تو یوں لگتا ہے جیسے میری کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو، کیا تم بھی ایسا محسوس کرتی ہو......'' حسن نے پرشوق نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''نہیں...... نہیں تو......'' وہ پھر خاموش ہوگئی۔

اس نے گاڑی ایک پارلر کے سامنے روکی...... زبردستی اس کو اندر بھیجا اور خود بیوٹیشن کو کچھ ہدایات دے کر وہ گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا...... اس نے موقع کی مناسبت کے مطابق اسے ہلکا ہلکا میک اَپ کیا...... لیکن اس کو بہت کوفت محسوس ہو رہی تھی...... واپس آئی تو خشمگیں نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''دیکھو ہم پارٹی میں جا رہے ہیں...... اس لیے اس طرح جانا تو اچھا نہیں لگتا...... مانا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں مگر کسی کو کیا معلوم اب انسان ہر ایک کو تو بتانے سے رہا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' حسن نے اس کی ناراضگی دیکھ کر توجیہہ پیش کی۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

حسن کے بھتیجے کی برتھ ڈے تھی اور وہ اس کو سب سے ملانا چاہتا تھا...... وہ رسماً سب سے ملی...... حسن کی ماں کو تو وہ بالکل ہی اچھی نہ لگی...... حسن ان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا...... تینوں بھائی اچھی جاب کر رہے تھے...... اور شادی شدہ تھے، صرف حسن باقی تھا...... کروڑوں کی جائیداد کا مالک...... پڑھائی کا بے حد شوقین تھا...... اس لیے یونیورسٹی جاتا تھا...... ورنہ باپ تو ہمیشہ اس کو بزنس سنبھالنے کو کہتا تھا...... حسن بھائیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور عادتوں کے لحاظ سے بے حد نفیس انسان تھا۔ ہر اچھے گھرانے کی اس پر نظر تھی، اتنا ہنس مکھ لڑکا سب کو بے حد بھاتا تھا...... اور وہ کس پر فدا ہوا تھا...... اس کی ماں حیران تھی کہ وہ کس مخبوط الحواس کو اٹھا لایا تھا جو مسکراتی تو لگتا کہ زبردستی مسکرا رہی ہو...... بولتی تو ایسے اٹک اٹک کر کہ جیسے کوئی روبوٹ بول رہا ہو...... چلتی تو لڑکھڑاتی...... اور لڑکھڑاتے ہوئے کتنی بار گرنے لگی۔

پارٹی کیا تھی جشن کا ساسماں تھا...... کوئی بھی عام شخص نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ ان

خواص میں سب سے زیادہ عام لگ رہی تھی۔

دفعتاً اس کی نظر فریدی صاحب پر پڑی، گولڈن فریم کی عینک اور بلیک تھری پیسز سوٹ میں وہ پچھلی ملاقات سے قدرے مختلف لگ رہے تھے...... اس کو پہچاننے میں تھوڑی سی دقت تو ہوئی...... مگر وہ ان کو بھول کیسے سکتی تھی...... جن کی وجہ سے اس کا اندر تہہ و بالا ہو گیا تھا جنہوں نے ایک ہی ملاقات میں اس کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا...... وہ جنہوں نے اسے حقیقت دکھانے کی کوشش کی تھی...... کس قدر بے نیاز کھڑے تھے۔

وہ اورنج جوس ہاتھ میں پکڑے گرد و پیش سے بے خبر ان کی جانب لپکی......

لیکن ایک ہلکی سے ٹھوکر سے لڑکھڑا گئی...... سارا جوس کپڑوں پر گر گیا...... سب نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا، کچھ نے تو نگاہوں میں...... اور کچھ نے دل میں اس کو اجڈ اور بدتمیز کہا...... لیکن فریدی صاحب اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے جا چکے تھے...... وہ شکستہ پر طائر کی طرح وہاں کھڑی پھڑ پھڑا رہی تھی۔

''ضحیٰ...... چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں......'' حسن نے ناموافق حالات کا جائزہ لے کر کہا۔

اور وہ بغیر کسی کو خدا حافظ کہے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

''یہ کیا پاگل پن تھا؟'' حسن نے قدرے ناراضگی سے پوچھا۔

جواباً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''بھئی کیا ہوا...... میں نے کون سی ایسی بات کہی...... آئی ایم سوری......'' حسن قدرے شرمندگی سے بولا۔

وہ آنسو بہاتی رہی اور حسن اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا رہا۔ وہ خاموشی سے اسے گھر چھوڑ کر واپس آ گیا۔

(15)

فریدی صاحب سے نہ ملنے کا اسے بہت ملال تھا...... اسے یوں لگا جیسے کوئی خوشنما چیز ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی ٹوٹ گئی ہو...... اس کا دل فریدی صاحب کو دیکھ کر کیوں دھڑکا تھا...... ایسی کیا بات ہے ان میں...... ضرور...... یقیناً...... کچھ نہ کچھ ہے۔ وہ اٹھی اور ان کا دیا ہوا کارڈ ڈھونڈنے لگی...... اور انہیں فون کرنا چاہا...... رات کے تین بج رہے تھے...... اس نے فون کیا، بیلز ہوتی رہیں مگر کسی نے فون نہ اٹھایا...... شاید وہ سو گئے ہوں...... ہاں یہ سونے کا ہی تو وقت ہے...... مگر میں کیوں جاگ رہی ہوں...... میری نیند کہاں ہے...... کس وادی سے اس کو ڈھونڈ کر لاؤں...... اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں...... وہ اس دنیا میں کیا کرنے آئی ہے......؟ کس لیے......؟ کوئی بھی تو مقصد نہیں...... کسی کا بھی تو کوئی فائدہ نہیں...... صرف یہی کہ میں مسٹر اینڈ مسز توفیق حیدر کی اولاد ہوں...... اور میری حیثیت کچھ بھی نہیں...... اگر میں نہ بھی ہوں تو کسی کو کیا فرق پڑتا ہے...... زندگی تو چلتی رہے گی...... کوئی اسکے ساتھ چلے یا نہ چلے...... کتنی دیر وہ یونہی سوچتی رہی اور پھر اچانک اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن اٹھتے ہی سب سے پہلے ان کو فون کیا۔

''ہیلو...... ضحیٰ بول رہی ہوں۔'' وہ اٹک اٹک کر بولی۔

''ہیلو ضحیٰ...... کیسی ہیں آپ؟...... خوش باش'' فریدی صاحب کا لہجہ گرمیوں کی شدید دھوپ میں ایک نرم اور خوش گوار جھونکے کی مانند تھا۔

''فریدی صاحب......'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی...... وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ اس نے کل ان کو دیکھا تھا...... کیا کہے...... اس کو سمجھ نہ آ رہا تھا۔

''فریدی صاحب میں بہت پریشان ہوں...... میں جینا نہیں چاہتی'' اس کے لہجے میں بے پناہ مایوسی اور درد تھا۔ اس لیے بے بسی سے ایک دم بول کر چپ ہوگئی۔

''کیوں بھئی...... ایسی مایوسی کی باتیں نہیں کرتے...... رحمت حق سے مایوس ہونا رحیم کو ناراض کر دیتا ہے...... اس دنیا میں ہم اس کی مرضی سے آئے ہیں اور اسی کی مرضی سے جائیں گے اور چاہے ہم لاکھ کوشش کریں پہلے یا دیر سے جانے کی تو یہ قطعی ناممکن ہے۔ موت کا ذائقہ تو ہر نفس نے چکھنا ہے یہ تو طے ہے...... اٹل ہے...... مگر کب...... کس وقت...... جو خالق تخلیق کرتا ہے وہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی تخلیق کب تک چلے گی...... ہم تو مٹی کے بے جان پتلے تھے...... یا پھر تھے ہی نہیں...... اس نے ہمیں وجود بخشا، بے پناہ صلاحیتیں دیں...... اب اس کی مرضی ہے کہ کب تک ہمیں زندہ رکھے...... کب اٹھائے...... ہماری مرضی کوئی نہیں، ہماری بقا مرجانے میں نہیں اس کی رضا کو پانے میں ہے...... ورنہ ہم کیا......؟ ہماری حقیقت کیا......؟ اس لیے آپ کا یہ سوچنا قطعی بے معنی ہے کہ آپ مرنا چاہتی ہیں...... ڈپریشن میں پہلی سوچ ہی یہ آتی ہے...... کیونکہ انسان کا نفس کچھ سہنے کا عادی نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ سکھ چین سے رہنا چاہتا ہے۔ حالانکہ خالق فرماتے ہیں، کہ انسان تو پیدا ہی تکلیف میں کیا گیا ہے'' نجانے کیوں لوگ نہیں سمجھتے...... وہ تو سنا ہی ہوگا:

"Pleasure is intermission of Pain"

خوشی کا وجود بہت تھوڑا ہے، مگر اس کا سرور اتنا ہوتا ہے کہ ہمیشہ اچھی لگتی ہے اور انسان بار بار اس کی تمنا کرتا ہے۔ خیر آپ پریشان نہ ہوں......'' انہوں نے اسے تسلی دی۔

''مگر میں کیا کروں میں بے حد پریشان ہوں'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''ارے ارے یوں پریشان نہیں ہوتے...... جب انسان بہت پریشان ہوتا ہے تو دل ہار بیٹھتا ہے......

''مجھے بتایئے کہ میں کیا کروں......؟'' وہ پھر بولی۔

''جینے آئے ہو اس جہاں میں اگر کچھ تو مفہوم زندگی سمجھو

جو قدم اٹھے کامیاب اٹھے لمحے لمحے کو آخری سمجھو

سوچو...... سمجھو...... غور کرو...... پہلا قدم یہ ہے...... باقی اس کے بعد......'' پھر

بات کریں گے...... خدا حافظ۔''

انہوں نے فون بند کر دیا مگر ریسیور ہاتھ میں پکڑے وہ کافی دیر بیٹھی رہی۔

وہ سارا وقت یونہی خاموش بیٹھی رہی...... کبھی اپنے دل کی حالت پر غور کرتی...... جو بہت دنوں کے بعد آج فریدی صاحب سے بات کرنے کے بعد سنبھلا تھا...... اس کو آج طمانیت سی محسوس ہو رہی تھی...... وہ فریدی صاحب کی باتوں پر غور کرتی رہی...... کبھی اردگرد کی طرف نگاہ دوڑاتی...... کبھی ان کے لفظوں کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتی...... کبھی اس کو سب غبار دل سا لگتا...... کبھی وسوسہ...... اور کبھی وہم...... تھوڑا سا اس نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا...... مگر کیسے سمجھائے...... اس کو تو سمجھانا ہی نہ آتا تھا...... اس نے اس سے قبل اپنے آپ سے بات ہی کب کی تھی...... اب جو بات سے بات نکلتی جاتی تو وہ پریشان ہو جاتی...... اس دل میں...... اس دماغ میں کتنا ذخیرہ ہے...... کتنی سوچیں...... کتنی باتیں...... کتنے وسوسے اور واہمے ہیں...... اور دل کا پھڑ پھڑانا...... دھڑکنا...... لرزنا...... پھر پرسکون ہونا سب کیا تھا...... اس کے پاس نہ کرنے کو کچھ تھا نہ کہنے کو سوائے سوچنے کے...... اور بے شمار باتیں...... نقطے...... منفی، مثبت...... سب نے اس کی شخصیت کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اچانک اس کے پاپا آگئے...... گھر میں اس قدر خاموشی تھی کہ خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ملی بھی تو بڑی چپ چپ سی...... نہ انہوں نے کچھ پوچھا اور نہ اس نے کچھ کہا...... بس دیکھتے رہے۔

ڈائننگ ٹیبل پر وہ مسلسل پانی پیتی رہی...... ایک ایک گھونٹ...... وہ کافی دیر غور سے دیکھتے رہے پھر تنگ آ کر بولے۔

''ضحیٰ بیٹے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا'' وہ قدرے حیرت سے اونچی آواز میں بولے۔

''جی...... جی ہاں'' وہ ایک دم ہڑ بڑا کر بولی۔

''کیا بات ہے...... کیا کوئی پریشانی ہے؟''

''نہیں تو......''

''میں کچھ محسوس کر رہا ہوں'' اس کے پاپا نے بغور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیا......؟'' وہ حیرت سے بولی

''کیا تمہیں معلوم نہیں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں تو......'' اس نے قطعی لاتعلقی کا اظہار کیا۔

''واقعی اگر ایسا ہے تو پھر کچھ نہیں'' اور وہ اٹھ کر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

......۞......

(16)

اس نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا تھا...... اور دوستوں سے بھی رابطہ بالکل منقطع کر دیا تھا......صرف حسن کبھی کبھار آتا...... خیریت پوچھتا اور چلا جاتا...... وہ باہر بھی بہت کم نکلتی......بس ہر وقت اپنے کمرے میں کبھی لیٹ کر چھت کو گھورتی رہتی......کبھی لان میں چکر لگاتی...... طبیعت میں بے حد بوجھل پن آ گیا تھا۔ ہر وقت اکتائی اکتائی سی...... پریشان پریشان سی...... بکھری ہوئی جیسے دل بالکل ہی مر گیا ہو...... نہ کوئی حسرت نہ کوئی تمنا......بس سینے پر ایسا بوجھ...... جیسے بھاری پتھر......

موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا...... جب وہ لان میں گھوم رہی تھی...... اس کو عجیب طرح سے بے چینی اور الجھن سی محسوس ہونے لگی...... وہ چابی لے کر باہر نکل گئی...... گاڑی انجان راستوں کی جانب چلتی رہی...... جیسے نامعلوم مسافر...... نامعلوم منزل کی جانب...... منزل کا تعین کہاں سے کرے...... کس طرح کرے...... جبکہ اسے راستے کا خود ہی پتا نہ تھا......کہاں سے ڈھونڈتی...... کہاں سے شروع کرتی...... اس نے انجانے میں گاڑی ایک کچی سڑک پر ڈال دی...... کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی ناہموار کھڈے دار سڑک پر ہچکولے کھانے لگی اور ایک کھائی کے پاس رک گئی...... وہ گاڑی سے باہر نکلی، اردگرد گھنے درختوں کے سائے اوپر کو اٹھے ہوئے محراب سی بنا رہے تھے...... یوں لگ رہا تھا جیسے راستے کے اوپر درختوں کی چھت سی بنی ہو...... دور ایک ندی بہہ رہی تھی...... اور اس کے قریب سارا علاقہ دلدلی مٹی سے ہموار تھا...... وہ سڑک کے کنارے کھڑی ہو کر دور دور تک نگاہ دوڑاتی رہی...... اسے ایک کھنڈر نما چار دیواری سے بنی نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف چلتی گئی...... ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی...... کھنڈر نجانے کس آثار قدیمہ کی یادگار تھا جسے حوادث زمانہ نے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔ کہیں کہیں چونے کے کھرپ باقی

تھے...... کہیں ٹوٹی ہوئی شکستہ کھڑکیاں، خستہ حال دیواریں...... خستہ حال عمارت...... یہ کیا تھا......؟ کیا ہوگا......؟ شاید کوئی کمرہ...... مگر اس کا دروازہ کہاں ہے......؟

کمرہ...... دروازے کے بغیر...... یہ کیسے ممکن ہے...... اور کھڑکیاں، کھڑکیاں تو کمرے میں ہی ہوتی ہیں...... لیکن اس کی چھت، چھت کے بغیر...... یہ کوئی کمرہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ وہ کافی دیر کھڑی سوچتی رہی...... مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... ایک طرف سے دیوار کی کچھ اینٹیں نیچے گری ہوئی تھیں...... اگر ایک باہر کو...... تو ایک اندر کو...... ایک لمبی سی راہداری بنی ہوئی تھی...... وہ مشکل سے کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہوئی...... فرش عجیب سی مٹی سے کالا ہو رہا تھا...... اس نے جوتے اتارے اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی دیوار کے ساتھ چلنے لگی...... یکدم پاؤں کی ٹھوکر سے ایک پتھر اپنی جگہ سے لڑھک گیا اور پتھر کے نیچے دبے ہوئے حشرات اور کیڑے مکوڑے ادھر ادھر بکھرنے لگے جیسے برسوں تاریکیوں میں رہنے کے بعد وہ ایک دم سورج کی روشنی کی تاب نہ لا سکے ہوں اور عالم نزع میں جاں بلب جسد کی مانند تڑپنے لگے ہوں...... وہ ڈری سی گئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ مگر ایک دم نیچے بیٹھ گئی اور ننگ دھڑنگ حشرات کو غور سے دیکھنے لگی...... ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سبز پودے اور ننھی ننھی کونپلیں اس طرح اگی ہوئی تھیں کہ ان کے سرے پتھر کے ساتھ چپکے ہوئے تھے اور درمیان میں حشرات، جیسے خوراک کا ذخیرہ ان کے لیے مخصوص کیا گیا ہو...... کیا یہ پودے ان حشرات کے لیے اُگے ہیں......؟ کیا حشرات کا وجود اتنا اہم ہے کہ ان کی زندگی...... ان کی بقا کا اتنا خیال رکھا گیا ہے اور اس پتھر کو ان کیڑوں کا محافظ بنایا گیا ہے اور ان سب کا محافظ...... ان در و دیوار کو...... ایک کی زندگی دوسرے کے ساتھ منسوب کی گئی ہے...... ایک کو دوسرے کا ضامن...... دوسرے کا محافظ...... ایک کی تسکین دوسرے کی ذات سے ہوتی ہے...... اس طرح تو لامحدود سلسلہ چلتا رہتا ہے...... ایک کی زندگی میں دوسرے کا عمل دخل...... سب کچھ کتنا منظم، کتنا پختہ...... مضبوط و مربوط...... جب سب کچھ اتنا مضبوط، ہم آہنگ اور ایک دوسرے سے جڑا ہے تو سب کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد بھی تو ہوگا، یقیناً ہوگا...... پرندوں کا...... جانوروں کا...... حیوانوں کا...... حشرات کا...... انسانوں کا بھی ضرور ہوگا...... لیکن اس کو علم نہ تھا اور وہ خود...... خود کیا تھی انسان......؟ تو وہ کس سے منسوب ہے......؟ اس کی زندگی میں کس کا عمل دخل ہے......؟

اس کی وابستگی کس کے ساتھ ہے...... کس کے ساتھ تعلق ہے...... کون اس کا محافظ ہے...... اس کی تسکین کیسے ہوگی...... جوں جوں سوچتی اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے بے قرار دل کو سکون سا میسر آنے لگا ہو۔ اس نے شکستہ دیواروں کی جانب ایک نظر دوڑائی...... دیواروں کی شکستگی کسی شاندار ماضی کی یاد دہانی کرا رہی تھی کیونکہ کونوں کھدروں میں کہیں کہیں ان مٹے نقش و نگار اور کہیں کہیں رنگوں کے نقطے باقی رہ گئے تھے...... اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی اس کا بھی وجود تھا...... بہت خوبصورت...... محفوظ و سالم لیکن تب اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوگا...... وہ یوں فنا ہو جائے گی...... فنا...... بقا...... وجود...... تحفظ...... زندگی...... علامت...... حقیقت؟ ایک دم اسے کچھ یاد آنے لگا...... کیا فنا ہر ایک کا مقدر ہے...... بقا کے بعد فنا...... یا فنا کے بعد بقا...... شاید فنا...... نہیں بقا بھی تو...... کچھ ایسا ہی فریدی صاحب نے کہا تھا...... مگر کب......؟ کیسے......؟ کس کے لیے؟ اور سب کیسے ممکن ہوگا...... وہ پھر پریشان ہوگئی...... اسی لمحے سارا سکون غارت ہوگیا...... اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے...... دل نئی نئی کیفیات سے دوچار ہونے لگا...... اس نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا...... دور دور تک پھیلا وسیع و عریض نیلا چھت...... کہیں کوئی دراڑ...... کوئی شگاف...... کوئی لوچ...... کوئی ابھار...... کہیں کوئی کھڈ...... گھاؤ...... کوئی کھائی نہ تھی...... ہر طرف مکمل سکون ہی سکون...... ہمواری ہی ہمواری...... ٹھنڈک اور لطافت ہی لطافت تھی۔ وہ لمحہ بھر کو رکی پھر اوپر دیکھتی رہی...... بے چین دل کو پھر کچھ قرار سا آنے لگا یا شاید اس کو کچھ یاد آنے لگا...... کہیں اس نے پڑھا تھا مایوسی اور پریشانی میں آسمان کی وسعت کو دیکھو تو دل اس کے حوصلے کو دیکھ کر پریشان ہونا چھوڑ دیتا ہے...... وہ بھی تو صبر کی علامت ہے۔ ازل سے یونہی کھڑا ہے...... خاموش...... چپ چاپ...... کتنا صابر، کتنا پرسکون، وہ پکار پکار کر کہتا ہے: اے انسان! تم کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل چھوڑ بیٹھتے ہو، میری وسعت کو دیکھو میرا حوصلہ دیکھو...... تمہارے لیے صدیوں سے یونہی کھڑا ہوں، مگر ہمت نہیں ہارتا...... کیا کیا دیکھتا ہوں...... سہتا ہوں...... مگر دل نہیں چھوڑتا...... خالق نے مجھے تمہاری خدمت کے لیے تخلیق کیا ہے...... اور تمہارے لیے تو ساری کائنات ہے...... ایک ایک ذرہ تمہارے عمل میں ہے...... اور تم اتنی جلدی کیوں ٹوٹ جاتے ہو۔ لمحے میں جل کر راکھ کی طرح سیاہ ہو جاتے ہو اور لمحے میں ریت کے حقیر

ذروں کی مانند بے وقعت سے اڑتے پھرتے ہو...... تم سمجھتے کیوں نہیں...... تم اتنے بے وقعت...... حقیر...... اور کم ذات تو نہیں، پھر یہ سب کیوں......؟

اس کی بے قرار نظریں چمکتے دمکتے سورج سے ٹکرائیں جو اپنی پوری تمازت سے چمک رہا تھا...... جو دیکھنے میں گول شفاف چمکتی دمکتی ٹکیہ ہے لیکن کس طرح لمحہ بہ لمحہ اس کے اندر دھاتیں اور گیسیں ابل رہی ہیں...... اس کی ناہموار سطح کن کن مراحل سے گزر کر روشنی مہیا کر رہی ہے۔ اس کا بھی تو ایک ہی مقصد ہے دوسروں کو زندگی دینا...... دوسروں کی زندگیوں کو روشن رکھنا ان کو تاریک ہونے سے بچانا...... صرف اسی ایک کے دم سے تو کائنات کا وجود ہے...... کیا یہ بھی زندہ ہے......؟ یہ روشنی کہاں سے پاتا ہے......؟ اس کی خوراک...... اس کا تعلق...... رابطہ...... وابستگی...... کیا ہے؟ اس کا محافظ کس کو بنایا گیا ہے اور اس کا نہ ختم ہونے والا سفر کب تک جاری رہے گا......؟ کب تک یہ یونہی جلتا رہے گا...... یونہی چمکتا اور چمکاتا رہے گا......؟ یہ کیوں صدیوں سے ایک ہی حالت میں معلق کھڑا ہے...... ایک انچ نہ اپنا جسم کم کرتا ہے کہ کائنات فنا ہو جائے گی اور لوگ برف سے مرنے لگیں گے...... اور نہ ہی ایک انچ آگے بڑھتا ہے کہ کائنات لاوا بن کر ابلنے لگے گی...... اتنا صحیح فاصلہ، اتنی صحیح مقدار...... کیسا ٹھیک تعین...... یہ برسوں سے صعوبتیں برداشت کرتا آرہا ہے صرف اور صرف دوسروں کو حیات بخشنے کے لیے۔ خالق نے کیا اسے دوسروں کے لیے مسخر کیا ہے...... کیا دوسروں کا وجود اتنا اہم ہے...... کیا اس کا اپنا نہیں۔

ایک دم پچھم سے تیز ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ اس کے بال آگے پیچھے منتشر ہونے لگے...... ہوا نرم گرم...... لطیف سی محسوس ہونے لگی...... کتنا لطیف جھونکا...... اس نے کھینچ کر سانس لیا...... اس کی لطافت اس کو اپنے رگ و پے میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ عجیب سا لطف آنے لگا...... ہوا کتنی نازک...... کتنی لطیف کہ چھونے سے بھی لرز جائے...... ہاتھ میں نہ آئے مگر احساس کتنا خوبصورت، کتنا دل موہ لینے والا...... اس کا وجود صرف متحرک رہنے میں ہے۔ جب اٹھکیلیاں کرتی کھیتوں کھلیانوں پر چلتی ہے تو گندم کے سٹے لہرا لہرا کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ خوشی سے جھومنے لگتے ہیں۔ سرسوں کے کھیتوں پر چلتی ہے تو وہ خوشی سے قلقاریاں مارنے لگے ہیں۔ جب درختوں کو چھیڑ کر گزرتی ہے تو پتے مچلنے لگتے ہیں۔ خوشی سے پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ آپس

میں یوں سرگوشیاں کرتے ہیں جیسے سیٹیاں بجا رہے ہوں...... لہروں کے سنگ چلتی ہے تو وہ تڑپنے لگتی ہیں اور مستی میں آ کر ساحل سے لپٹنے لگتی ہیں...... چٹانوں پر چلتی ہے تو سنگریزے بکھیرنے لگتی ہے...... جب شگوفوں کو پیار کرتی ہے تو مسکرانے لگتی ہے...... اور جب دلوں کے تار چھیڑتی ہے تو وہ ماہی بے آب کی طرح مچلنے لگتے ہیں...... اس کے وجود میں اتنی لطافت...... اتنی رنگینی، اتنی مستی اور سرشاری کس نے بھر دی ہے۔

کبھی وہ کھنڈر کے در و دیوار کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھتی...... کبھی اس کو رگڑنے کے بعد گرتے ہوئے چونے کو...... کافی دیر وہاں کھڑی رہنے کے بعد وہ وہاں سے باہر نکل آئی...... اور دلدلی مٹی سے میں سے چلتی ہوئی ندی کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس کی لہروں سے نکلتی ہوئی سرگوشیوں کو سننے لگی...... میٹھی میٹھی دھن...... نرم لہجہ...... اس کی آواز...... ہنسی...... سرگوشیاں۔ اس نے ایک کنکر اس میں پھینکا...... شور سا اٹھا...... بھنور سے نکلتی ہوئی لہریں...... ان میں مچلتا تلاطم...... ہیجان...... ایسا ہی ہیجان ایسا ہی تلاطم انسان کے اندر بھی ہے...... بالکل اسی ندی کی طرح...... وہ حیرت سے پانی کو دیکھتی رہی...... اس میں آہستہ آہستہ ہاتھ ڈالتی رہی...... یخ پانی کتنا اچھا لگ رہا تھا...... اس نے وہی پانی اپنے چہرے پر ڈالا...... اور سکون کی سانس لی...... پانی...... زندگی کی بنیاد...... حیات کا سرچشمہ اس کا بھی وجود ہے...... اس کا بھی اپنا ہی سوز ہے...... اس کی بھی اپنی ہی ہیئت ہے...... کہیں بے رنگ...... کہیں سفید...... کہیں کالا...... کہیں گدلا...... کہیں نیلا...... کڑوا...... میٹھا...... نمکین...... کہیں طمانیت و سکون کی علامت...... کہیں سرشاری میں آبشاروں اور جھرنوں سے چھلکتا ہوا...... کہیں اتنا سرکش اور منہ زور کہ بند باندھنے پڑتے ہیں...... اس کی بقا رواں رہنے میں ہے۔ دوسروں کو حیات بخشنے کے لیے ہر وقت سفر کرتا رہتا ہے...... نجانے کہاں سے چلتا ہے......؟ کہاں سے آتا ہے......؟ اس کی بنیاد کہاں ہے......؟ کہاں سے حیات پاتا ہے اور کہاں جاتا ہے......؟ اس کی منزل کہاں ہے......؟ اس کا مقصد کیا ہے......؟ شاید دوسروں کو حیات بخشنا...... اور...... اور اس کے نیچے بھی تو ایک جہان آباد ہے...... بہتے بیل بوٹے...... حشرات...... نباتات...... آبی درندے...... نجانے کیا کچھ اپنے اندر سموئے بیٹھا ہے...... نجانے کس کس کی بقا کے لیے ہر وقت متحرک رہتا ہے...... انسان کو بھی حیات بخشتا ہے اور ان کو بھی...... مگر کبھی نہیں تھکتا...... کس کی بقا چاہتا ہے...... اپنی

یا دوسروں کی...... اس کی وابستگی کس کے ساتھ ہے......؟ یا کسی اور کی وابستگی اس کے ساتھ ہے......؟ سب ایک دوسرے کے ساتھ کیسے جڑے ہیں...... کیسے ہر جز، کل کے ساتھ جڑا ہے...... وہ کافی دیر یونہی بیٹھی رہی...... سوچتی رہی۔ ساکت سی، منجمد سی، کسی پتھر کے مجسمے کی مانند بیٹھی فطرت کے نظاروں پر غور کرتی رہی...... لیکن سوال کیا تھا...... جس کی تلاش میں یہاں آئی تھی...... وہ خود نہیں جانتی تھی...... اک جہاں روشن ہو گیا تھا...... اپنے اندر سوچنے سے ذہن کے بے شمار دریچے کھل گئے تھے...... ہر اٹھتی نظر اپنے اندر ایک سوال لیے تھی...... وہ ہر چیز کو غور سے یوں دیکھتی جیسے گھور رہی ہو...... سورج اپنا آج کا سفر طے کر چکا تھا اور اب ڈوبنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس کی پیلی مدھم سی کمزور پڑتی دھوپ...... اور ڈوبنے کا خوف، اس کا زرد اور سرخ چہرہ...... اس کو بہت اچھا لگا...... وہ اس کے ڈوبنے کا انتظار کرتی رہی...... ہر طرف ملگجے سائے لہرانے لگے...... اس کے ڈوبنے کے ساتھ ہی ہوا نے اپنا رخ بدلا...... اپنے اندر خنکی بھری اور شاداں اٹھکیلیاں کرنے لگی...... مسرت کا اک احساس رگ و پے میں سرایت کر گیا......

وہ مٹی سے اٹے پاؤں لے کر واپس گاڑی میں آ گئی۔ جب گھر لوٹی تو شام کے سائے رات کی تاریکی میں بدل رہے تھے۔ توفیق صاحب اس کا حلیہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

”ضحیٰ بیٹا...... کہاں سے آ رہی ہو...... خیریت تو ہے؟“ انہوں نے چونک کر اس سے پوچھا۔

”جی...... جی...... پاپا!“ وہ بے ترتیب لہجے میں بولی۔

”یہ تمہارے پاؤں...... کیا ہوا انہیں......؟“

”کیا ہوا ہے؟......“ وہ حیرت سے بولی

اس نے ایک دم حیرانگی سے پاؤں کی طرف دیکھا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

(17)

وہ پرسکون سو رہی تھی جب رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ کھلی...... وہ حیران سی سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگی...... ایک دم خوف سا چھانے لگا۔ دل آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا...... بے چینی اور اضطراب پھر بڑھنے لگا، یہ سب کیا ہونے لگا ہے...... وہ اٹھ کر باتھ روم میں گئی...... چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا...... اسکا جی متلانے لگا...... اس نے ابکائی کرنا چاہی مگر تیورا کر وہیں گر پڑی...... سارے جسم سے ٹیسیں سی اٹھنے لگیں...... پھر اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں تھی اور کہاں ہے......

صبح بشیراں اس کے کمرے میں آئی تو حیران رہ گئی...... وہ شور مچانے لگی......

”بی بی جی کو کچھ ہو گیا ہے......“ لمحہ بھر میں گھر بھر کے نوکر اکٹھے ہو گئے۔ اس کو بستر پر لٹایا...... تھوڑی دیر بعد ہوش میں آئی تو سب کو اپنے گرد کھڑے دیکھ کر حیران رہ گئی......

”کیا ہوا ہے......؟“ اس نے یوں چونک کر پوچھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

”ضحیٰ بیٹے کیا بات ہے میری جان...... کیا مسئلہ ہے...... خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ...... میں نے تمہاری ماں کو فون کر دیا ہے بس ایک دو دن میں وہ یہاں پہنچ جائے گی۔“ توفیق صاحب پریشانی سے بولے۔

”کیوں پاپا......؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم بیمار ہو......“ وہ آہستگی سے بولے۔

”نہیں تو......“ وہ لاپروائی سے بولی۔

”کیا نہیں تو، وہ آ لے تو تمہیں کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں اب بستر سے نیچے پاؤں نہ رکھنا۔“ وہ قدرے غصے سے بولے۔

”مجھے کچھ نہیں ہوا...... بس آرام کرنا چاہتی ہوں...... آپ لوگ سب چلے

جائیں...... میں سونا چاہتی ہوں۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''بشیراں...... سب لوگ باہر آ جاؤ اور دروازہ اچھی طرح بند کردو۔'' توفیق صاحب نے سب کو باہر بھیج کر بشیراں کو ہدایت کی۔

اس نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

''دروازہ...... دروازہ تو اس کا بھی نہیں تھا......'' وہ بڑبڑائی۔ توفیق صاحب نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

''کیا بات ہے...... کچھ کہہ رہی تھی؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں تو......''

''اوکے...... Take Care''

لیکن اس کا ذہن اسی میں الجھ کر رہ گیا۔

''دروازہ...... اور وہ کھنڈر...... وہ کیا تھا......؟'' اس نے بھنویں سکیڑ کر کچھ سوچنے کی کوشش کی۔

یقیناً دروازہ ہوگا...... یہ کیسے ممکن ہے...... ہاں تھا...... نہیں تھا۔ بھلا دروازے کے بغیر بھی کوئی عمارت ہوتی ہے...... لیکن اس کا تو کوئی نہیں تھا...... وہ دماغ پر زور ڈالنے لگی...... شاید نہیں تھا۔ منفی اور مثبت کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہونے لگے...... وہ چابی لے کر اٹھی مگر پھر نقاہت کے باعث تیورا کر بیڈ پر گر پڑی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی چائے کو غور سے دیکھا، نجانے بشیراں کس وقت کی یہاں رکھ گئی تھی...... اس نے یخ چائے اٹھا کر یوں آہستہ آہستہ پینی شروع کی جیسے بہت گرم ہو...... اور پھر اس کو لمحہ بہ لمحہ سکون سا آنے لگا...... یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر پھر سے قوت آ گئی ہو...... قوت کہاں سے آتی ہے......؟ حرارت اور توانائی سے...... اور توانائی کہاں سے......؟ روشنی کہاں سے......؟ پتا نہیں...... شاید سائنس کو بھی نہیں علم ہو سکا کہ روشنی کہاں سے آتی ہے لیکن اس کا منبع تو کہیں نہ کہیں ہے ضرور...... اس نے کھڑکی کھولی...... سورج کی روشن کرنیں اندر آنے لگیں...... اتنی چمکدار...... اتنی روشن، صاف شفاف کرنیں...... ان کا وجود کہاں پنپتا ہے...... ان کا ماخذ۔ اس نے پھر سوچنا شروع کیا اور کمرے کی جانب نظریں دوڑائیں...... لیکن ہر بار نظریں دروازے پر جا کر رکتیں۔ وہ چابی لے کر باہر نکل گئی۔

اسی انجان منزل کی جانب، کچھ کچھ یادیں ہمراہ لیے ہوئے...... کافی دیر بھٹکنے کے بعد وہ

وہاں پہنچی...... اور قدرے بھاگتی ہوئی کھنڈر کے پاس گئی۔ اس کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی...... جیسے کوئی دیوانہ کسی شے کے گرد چکر لگاتا ہے...... شاید کہیں کوئی دروازہ ہو...... کہیں کوئی چھت ہو...... مگر کہیں بھی کچھ نہ تھا، تھک ہار کر وہیں بیٹھ گئی...... کیا ہے یہ؟ اس نے ٹھنڈی آہ بھری...... کہیں وہ خود تو نہیں...... کھنڈر کی عمارت بغیر چھت اور دروازے کے...... یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے...... میری چھت...... میرا دروازہ...... اس کا مطلب ہے میں اس کی طرح شکستہ ہوں۔

نہیں یہ ممکن نہیں...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو انسان ہوں...... انسان...... انسان اور انسان کیا ہے؟...... مٹی کا پتلا...... جیتا جاگتا وجود...... جیسے روبوٹ...... یا فرشتہ...... یا پھر...... جن...... بھوت کی طرح...... What nonsense...... انسان صرف انسان ہے...... کہاں سے آیا ہے...... کہاں جائے گا...... اور کیوں آیا ہے؟...... کس لیے اور کس نے اس کو بھیجا ہے...... اور کیوں......؟ کیا کھانے پینے...... عیش کرنے...... انجوائے کرنے...... یا پھر تکلیفیں سہنے...... جسمانی و ذہنی...... یا پھر لمحہ بہ لمحہ آزمائشوں سے گزرنے کے لیے...... کرب سہنے کے لیے...... کیا کرنے کے لیے...... اف کیا گورکھ دھندا ہے۔ انسان کتنا الجھا ہوا ہے...... کبھی طوفانوں میں...... کبھی جھکڑوں میں...... کبھی گرد و غبار میں...... اس کا سینہ تنگ سا ہونے لگا...... مفہوم اس کی سمجھ سے بالا تھا...... وہ بے دلی سے اٹھی اور ندی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

دور چند بگلے پانی میں کھڑے چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ خوبصورت...... سفید سفید...... ان کی ذات میں کتنا خوبصورت تناسب ہے...... کتنا حسین امتزاج...... کچھ پانی میں کھڑے تھے...... کچھ پر پھیلائے محو پرواز تھے...... وہ حیرت سے ان کے کھلتے بند ہوتے پروں کو دیکھ رہی تھی...... یہ کیوں پرواز کر رہے ہیں...... کس لیے...... شاید اپنے وجود کی بقا کے لیے...... ان کے زندہ رہنے کے لیے پرواز بہت ضروری ہے۔ ان کا وجود پرواز سے زندہ ہے...... کس قدر مہارت سے یہ پرواز کرتے ہیں کبھی پروں کو سکیڑتے ہیں کبھی پورا پھیلا دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ پرواز کس سے سیکھی ہے، کیا ان کا مقصد صرف مچھلیوں کا شکار کرنا ہے۔ یہ انسان کیوں نہیں ہو سکتے...... یہ بھی تو چلتے ہیں، اپنی بولی بولتے ہیں...... کھاتے ہیں...... پیتے ہیں...... ہواؤں میں پرواز کرتے ہیں...... میلوں مسافت طے کرتے ہیں...... بھوک لگتی ہے تو مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔

نجانے کیا کیا کھاتے ہیں...... اور مچھلی...... انسان کیوں نہیں ہو سکتی...... آخر اس میں بھی تو جان ہے۔...... وہ بھی کھاتی ہے...... تیرتی ہے...... سفر طے کرتی ہے کدھر سے آتی ہے...... اور کہاں جاتی ہے...... بڑے بڑے جانور انسان کیوں نہیں ہو سکتے...... اتنے طاقتور...... اتنے توانا، اتنے مضبوط...... انسان سے بڑے...... انسان سے زیادہ خطرناک...... چیرنے پھاڑنے والے...... کیوں انسان نہیں ہو سکتے...... سنا ہے انسان کو مٹی سے بنایا ہے...... پھر مٹی کا انسان چلتا پھرتا کیسے ہے......؟ بولتا بھی ہے جیسے روبوٹ...... لیکن روبوٹ سوچ نہیں سکتا...... اتنی عجیب وغریب سوچیں...... لحہ بہ لحہ بدلنے والے تصورات...... خیالات...... جذبات...... مشاہدات...... نجانے کیا کچھ مگر انسان سوچتا کیسے ہے کیا اسکے اندر کوئی ایسا بٹن ہے جس کو دبا دو تو سوچنا شروع کر دیتا ہے...... پھر کبھی روتا ہے...... کبھی آہیں بھرتا ہے...... تڑپتا ہے...... خوش ہوتا ہے محبت کرتا ہے...... باتیں کرتا ہے...... گلے ملتا ہے...... چومتا ہے...... ہنستا ہے...... پیار کرتا ہے...... لیکن وہ یہ سب کیوں کرتا ہے...... ان سب کا کیا مقصد ہے...... اف یہ سب کیا فضولیات ہیں...... کیا ہو گیا ہے...... کس لیے یہ سب؟ کسی نے اندر سے آواز لگائی۔

''مجھے نہیں معلوم...... نہیں معلوم...... کاش میرا دل پھٹ جائے...... کاش میرا دماغ مفلوج ہو جائے...... یہ آنکھیں خشک ہو جائیں اور یہ جسم فنا...... کاش میں مرجاؤں...... میں مرکیوں نہیں جاتی...... میں جی کر کروں گی بھی کیا...... میری زندگی کا حاصل کچھ بھی نہیں...... میں تو کٹی پتنگ کی طرح ماری ماری پھر رہی ہوں...... اس کو اپنی زندگی بے حد بیکار اور فضول سی لگنے لگی۔ مرجانا تو ہر مسئلہ کا حل نہیں...... پھر کسی نے اندر سے ٹوکا، اگر ایسا ہو تو اس دنیا کے تمام انسان مر جائیں...... اور اگر مرگئی تو پھر کیا ہو گا۔ میں کہاں جاؤں گی...... شاید منوں مٹی کے نیچے...... میری سانس رک جائے گی...... نہیں سانس تو ہو گی ہی نہیں...... میرا وجود...... میری ہڈیاں...... میرا جسم سب فنا ہو جائے گا...... لیکن میرا دل تو مضطرب نہیں ہو گا۔ یوں تو نہیں تڑپے گا...... مجھے درد نہیں ہو گا...... ہر وقت...... کا احساس زیاں...... کچھ چھن جانے کا شدید احساس...... کچھ نہ پانے کا ملال...... ہاں مجھے مرجانا چاہئے۔ اس کے خشک ہونٹوں پر پپڑی سی جمنے لگی...... اس نے ندی سے پانی لے کر پیا، کچھ ٹھنڈک اور طراوت محسوس ہوئی۔ نئے عزم کے ساتھ کہ مرجانا ہی اس کے لیے بہتر ہے وہ گھر لوٹ آئی۔

(18)

عجیب اضطراری کیفیت تھی کہ اچانک فریدی صاحب کا فون آ گیا۔ وہ حیران رہ گئی اور ان کی آواز سن کر دل ایک لمحے کے لیے ساری پریشانی بھول گیا، مسرت کا احساس سا چھا گیا۔

''کہیے ضحیٰ بی بی کیسی ہیں آپ......؟'' فریدی صاحب خوشدلی سے بولے۔

وہ ایک دم پھر پریشان ہو گئی۔

''میں بے حد پریشان ہوں اور مرنا چاہتی ہوں'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''آپ بہت Extremist اور Emotional ہیں۔ ایک دم ہی کسی نتیجے پر پہنچنا اچھی بات نہیں۔ زندگی کی طرف بے شمار راہیں جاتی ہیں۔ آپ صرف آمنے سامنے دیکھتی ہیں۔ سامنے اگر تاریکی ہو تو انسان پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور اگر پیچھے راستہ بند ملے تو دائیں طرف اور اگر دائیں طرف کچھ نظر نہ آئے تو بائیں طرف اور اگر چاروں طرف نظر نہ آئے تو پھر قدموں تلے دیکھو...... زمین تو ہے ہی جس پر کھڑے ہو۔ اگر اس کو ناکافی پاؤ تو پھر اوپر دیکھو آسمان کھلا پڑا ہے۔ راستے ہی راستے ہیں...... اور پھر ہر لمحے رحمٰن کی ناشکری نہیں کرتے...... زندگی کا مفہوم فنا میں نہیں بقا میں ہے...... اگر سوچو غور کرو تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ اس نے ناحق ابلیس سے انسان کے لیے جنگ کیوں کی تھی اور اس کی برسوں کی عبادت...... رفاقت اور قربت کو صرف ایک لمحے میں پس پشت کیوں ڈال دیا تھا...... صرف اور صرف انسان کے لیے...... کیونکہ خدا نے انسان کو رفعت اور وہ عالی مرتبہ عطا کرنا تھا جس پر ابلیس صدیوں تک عبادت کرنے کے باوجود نہ پہنچ سکا تھا کیونکہ اس کی ذات کا خاصہ وہ نہیں تھا...... اور انسان کی ذات کو اس نے جس شاہکارانہ طریقے سے تخلیق کیا ہے، اگر انسان سوچنے بیٹھے تو ساری زندگی سجدے سے جبیں نہ اٹھائے...... اس کی بے

شمار رعنائیوں اور نعمتوں کا صلہ ہم بار بار یہ کہہ کر لوٹا رہے ہیں کہ ہمیں یہ زندگی، یہ عنایت یہ تحفہ نہیں چاہئے...... کیوں کیا ہم اتنے کم ظرف...... ناتواں...... اور کمزور ہیں۔ کیا ہم اس کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کے قابل نہیں...... ہم میں کس چیز کی کمی ہے، اگر کمی کسی چیز کی ہے...... تو وہ ہے حوصلہ اور مثبت سوچ۔ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں فرمایا ہے

''سن رہی ہونا......؟'' انہوں نے اسے خاموش پا کر پوچھا۔

''جی......'' وہ آہستہ سے بولی۔

مثلِ حیواں کھانے اور سونے سے آخر فائدہ
زندگی کیا، جب نہ ہو جینے کا محکم قاعدہ
آج بھی روز خودی سے خود کو گر محکم کرے
قوتِ تسخیر سے تو کل جہاں برہم کرے
گر فنا چاہے تو اپنی ذات سے آزاد ہو
گر بقا چاہئے تو اپنی ذات میں آباد ہو

دیکھو انسان کی ذات کو قدرت نے بڑی خوبیوں سے نوازا ہے۔ اس کے خمیر میں نجانے کیا کیا کچھ گوندھا ہے۔ اس ایک ایک ذرے کو اس خمیر سے علیحدہ کرو...... جو تاباں ہے، خوبصورت ہے اس کی چمک اور بڑھاؤ جو ارزاں ہے بے وقعت ہے اس کو خارج کر دو۔

دیکھو مایوسی بھی سرشت میں ہے۔ مایوسی سے بچو یہ انسان کے اندر کو بے حد کمزور اور تاریک کر دیتی ہے جس طرح بند کوٹھڑی جسے کوئی ساز و سامان روشن نہیں کر سکتا...... زندگی کو زندگی سمجھو...... بوجھ نہیں...... یوں سمجھو کہ ایک زینہ ہے یا سیڑھیاں جن پر ہر حال میں تمہیں قدم رکھنا ہے تو پھر کیوں نہ ہر قدم خوشی سے اٹھے...... زندگی کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرو...... مگر آہستہ آہستہ...... یہ بہت گورکھ دھندا ہے...... جلدی نہ کرو سمجھنے میں...... یہ کوئی کتاب نہیں...... کہ ایک دفعہ پڑھ کر بند کر دو، یہ تو ہر لمحے نئی سطر سے آغاز کرتی ہے...... اور ہر دفعہ نیا مفہوم دیتی ہے...... نظر مثبت پر ہو گی تو ہر منفی مفہوم بھی مثبت لگے گا...... بس یہی زندگی کا گر ہے...... میرا خیال ہے اب تم سمجھ جاؤ گی...... کیا خیال ہے؟''

انہوں نے پوچھا۔

''جی...... ٹھیک ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اچھا...... اب اجازت چاہتا ہوں...... خدا حافظ۔''

فریدی صاحب آپ میرے لیے کتنی بڑی نعمت ہیں...... کاش آپ سمجھ سکتے...... آپ مجھے بہت سمجھنے لگے ہیں...... میرا درد، میرا کرب...... اگر فریدی صاحب مجھے مل جائیں...... ہمیشہ کے لیے...... تو مجھے جیسے خزانہ مل جائے اور میرا کرب ہمیشہ کے لیے رفع ہو جائے گا۔ اس نے اضطراری کیفیت سے تنگ آ کر نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو فریدی صاحب''

''جی فرمائیے'' انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''فریدی صاحب کسی طرح آپ ہمیشہ کے لیے میرے ساتھ باتیں نہیں کر سکتے۔'' وہ تھوڑا ہکلا رہی تھی۔

''اچھا تو آپ نے زندگی کا مفہوم یہ سمجھا ہے......'' فریدی صاحب نے قہقہہ لگایا۔

''میرا مطلب ہے...... مجھے آپ کی ذات سے بہت سکون ملتا ہے...... بہت تسکین...... میں آپ کے ذریعے اپنے اضطراب کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ بمشکل بولی۔

''یہ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں...... کیا ساری زندگی آپ کسی کی باتیں سن کر گزار دیں گی...... ہر ایک کو انفرادی طور پر ایک ایک زندگی ملی ہے۔ جس کو وہ اپنے اپنے طریقے سے گزارتا ہے اب کیسے کوئی گزارتا ہے یہ اس کی سمجھ بوجھ پر ہے اور اس کی آزمائش بھی یہی ہے۔ نہ آپ میرے لیے جواب دہ ہیں نہ میں آپ کے لئے...... کیونکہ ہم دونوں کے علیحدہ علیحدہ وجود، شخصیات اور عادات و اطوار ہیں...... ہر ایک کی منزل ایک سہی مگر راستے جدا جدا ہیں...... کوئی ہموار سڑک چنتا ہے، کوئی پرخار راستہ، کوئی تنگ و تاریک گھاٹیاں اور کوئی پرواز کرتا ہوا اڑتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ آپ پر ہے کہ اپنی منزل کا تعین کریں...... بکھرے اور شکستہ وجود منزل نہیں پاتے...... بلکہ مزید بھٹک جاتے ہیں...... ذہن کو ایک نقطے پر مرکوز کرو کہ آپ کو زندگی گزارنی ہے اور اچھے طریقے سے یا برے طریقے سے فیصلہ آپ پر ہے...... لیکن پہلے سوچو، پھر تعین کرو جو مسئلہ ہو میں ہر ممکن مدد کے لیے تیار ہوں......'' انہوں نے مزید باتیں کیے بغیر فون بند کر دیا۔

''منزل کہاں ہے......؟ کہاں سے تعین کروں...... کہاں سے شروع کروں......؟''

اور کہاں تک جاؤں......؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا......'' اس نے جھنجھلا کر سوچا۔

روزانہ اس کا یہی معمول تھا گھر سے نکلتی...... اور کھنڈروں ویرانوں میں چلی جاتی، لہروں سے لپٹتی، ہواؤں سے باتیں کرتیں، دھوپ چھاؤں کی اٹھکیلیوں سے لطف اندوز ہوتی...... پانی کے شور کو سراہتی اور پرندوں سے سوال پوچھتی...... وہ بمشکل ہی گھر میں ٹکتی اور اکثر تو صبح ہوتے ہی گھر سے نکل پڑتی اور نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتی...... فطرت سے باتیں کرنا اس کو اچھا لگتا تھا...... اس کو یوں معلوم ہوتا کہ کبھی کبھی وہ اور فطرت ایک ہوں...... وہی دھوپ چھاؤں، گرمی، سردی، خزاں بہار...... ہریالی، سونا پن، ویرانہ دشت و بیاباں، صحرا...... کبھی پھول، کبھی کانٹے...... کبھی مہک ہی مہک، کبھی چبھن ہی چبھن، کبھی طوفاں، کبھی سکوں، کبھی لہروں کا تلاطم تو کبھی پرندوں کی چہچہاہٹ...... کبھی ان کا ترنم تو کبھی ان کی نالہ زاری...... سب کچھ تو اندر تھا...... اور باہر بھی...... کیسا عجیب اور حسین اتفاق ہے۔ وہ اکثر سوچتی...... جب سوچتی تو بہت دور نکل جاتی......

......❁......

(19)

اس کی ماں جب سے وطن واپس لوٹی تھی اسے ہر وقت اس کی پریشانی رہتی تھی۔ اچھے اچھے ماہر نفسیات کو دکھانے کی کوشش کرتی مگر وہ کہیں نہ جاتی۔ اکثر ماں کے بیدار ہونے سے پہلے ہی وہ گھر سے نکل کھڑی ہوتی...... کبھی وہ پیار سے سمجھاتی...... کبھی ڈانٹ کر۔ مگر وہ اپنی من مانی کر کے رہتی...... وہ کیسے ایک دم اتنی بدل گئی تھی اس کا انہیں بہت قلق تھا۔ ایک اولاد اور وہ بھی ایسی سر پھری۔ انہیں سب سے زیادہ دکھ ہی اس بات کا تھا کہ اس کی **Social Activities** ختم ہو کر رہ گئی تھیں اور اب وہ سوسائٹی میں **Move** کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

دن بدن اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ پژمردہ چہرہ...... بے رونق آنکھیں...... سانولی رنگت مزید خراب ہوگئی تھی...... ہڈیاں جگہ جگہ ابھر آئیں تھیں۔ وہ اپنے وجود سے ایسی بے خبر ہوئی کہ اس کو بالکل ہی اپنے بارے میں ہوش نہ رہا تھا۔

حسن بہت دنوں بعد آیا تو اسے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

''ضحیٰ اٹھو کہیں باہر چلتے ہیں'' وہ اس کو یوں پریشان دیکھ کر بولا۔

''مگر کہاں میں تو ابھی باہر سے لوٹی ہوں''

''لیکن میرے ساتھ بھی تمہیں جانا ہوگا'' وہ بضد رہا۔

''مگر کچھ پتا بھی تو چلے'' اس نے حیرت سے جواب دیا۔

''بس پوچھو مت چلو کہیں باہر لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں'' حسن مسکرا کر بولا۔

''میرا موڈ نہیں''

''لیکن تمہیں چلنا پڑے گا'' حسن نے دوٹوک لہجہ میں کہا۔

''حسن مجھے مجبور مت کیا کرو اور پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بہت تھک

گئی ہوں۔"

"میں نے کہا اٹھو، اب مزید کوئی بات نہیں......" اس کے بے حد اصرار پر اس کو چار و ناچار اٹھنا پڑا۔ بکھرے بالوں کو اس نے ہاتھوں سے یونہی سنوارا اور دوپٹے کو درست کر کے سوفٹی سمیت ہی وہ گاڑی میں بیٹھ گئی حسن نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور گاڑی سٹارٹ کی۔

"ضحیٰ تمہیں کیا ہو گیا ہے کیوں اتنی خاموش رہتی ہو۔ اتنی پریشان، بکھری بکھری سی، کیا کوئی پریشانی ہے، کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ مگر خدا کے لیے یوں اپنے آپ کو بھی اذیت مت دو اور دوسروں کو بھی۔"

وہ جواباً خاموش رہی۔

"تم سن رہی ہونا...... جو میں کہہ رہا ہوں" وہ جھنجھلا کر بولا۔

"ہاں......" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"بتاؤ...... پلیز بتاؤ...... کیا ہوا ہے تمہیں...... کیا تکلیف ہے"

"کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں...... ٹھیک تو ہوں" وہ سرد مہری سے بولی۔

"تم ٹھیک نہیں ہو......" اس نے غصے سے اس کی جانب دیکھا۔

"اچھا......" زخمی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی۔

"پلیز بتاؤ...... کہ تم کیا محسوس کرتی ہو؟"

وہ کافی دیر اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"کبھی کبھی بہت عجیب سا محسوس کرتی ہوں...... کبھی تم نے پونم کی رات کو سمندر کی بے چینی...... اس کا اضطراب دیکھا ہے۔ لہروں میں تلاطم اور ان کا شور سنا ہے۔ ان کا چاند کی جانب اچھلنا، اس کو دیکھ کر ان کا بدمست ہونا...... ان کا جنوں، ان کی وحشت...... اضطراب اور بے قراری...... دیکھی ہے کبھی۔ بس میرے اندر بھی یونہی ہوتا ہے۔ نہ سمجھ آنے والا شور...... بے حد شدید تلاطم...... کبھی پرسکون لہریں...... کبھی بہت منتشر کر دینے والا احساس، خواہش...... طلب...... اضطراب...... سکوت...... خاموشی...... اور کبھی شانتی ہی شانتی...... مگر بہت کم کم...... میری سمجھ سے بالا...... سوچ سے بڑھ کر...... تم کو میں کیا بتاؤں کہ کہاں درد ہے مجھے، کیا تکلیف ہے...... ان جذبوں کو، ان احساسات کو کیا نام دوں! ایسا

کرب...... ایسی تکلیف...... ایسی چبھن...... جس کو صرف میں ہی محسوس کر سکتی ہوں...... دوسرے تو صرف اسے دیوانگی کا نام دیتے ہیں جیسے میری ماما...... اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں...... اور کسی اذیت کے احساس سے بڑبڑانے لگی۔

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا...... اور خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ اس نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روکی۔

"آؤ چند لمحے بیٹھ کر کچھ باتیں کر لیں"

"حسن!" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"ہاں سمجھتا ہوں لیکن اس کے باوجود بھی۔"

وہ خاموشی سے اس کے ہمراہ چل دی۔

"ضحیٰ تمہیں پتہ ہے مرد کسی حد تک اپنی فطرت میں کمینہ واقع ہوا ہے۔ لاحاصل جذبوں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا رہتا ہے۔ اس سے طلب کرتا ہے جس سے وہ اندر سے مطلوب ہوتا ہے۔ اس کو عطا کرتا ہے۔ جس سے خود اس کو طلب ہوتی ہے اور جب طلب باقی نہیں رہتی تو محروم کر دیتا ہے اور خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس عورت ہمیشہ عطا کرتی ہے، چاہے وہ اپنی ذات میں کتنی ہی محروم کیوں نہ ہو۔ وہ طلب، طالب اور مطلوب کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتی...... جو بھی طلب کرتا ہے اسے عطا کرتی ہے۔ پوری شدت اور جذبے کے ساتھ...... بغیر کسی کھوٹ اور کمی کے...... اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مرد ہمیشہ اس عورت کو چاہتا ہے جس سے اسے بھرپور خلوص، محبت اور احترام ملے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی ذات میں ہمیشہ محبوبہ، بیوی، دوست اور ماں کا روپ دیکھنا چاہتا ہے...... اور پتا ہے تم میرے لیے سب کچھ ہو سکتی ہو۔ میرا مطلب ہے...... جب بھی میں تمہاری طرف دیکھتا ہوں تمہاری آنکھوں میں محبت کی چنگاریاں...... دل میں ہمدردی و خلوص، اور وجود میں اک مخصوص سی کشش پاتا ہوں، تم کیا ہو میرے لیے صرف میں ہی جانتا ہوں...... پہلے پہلے تو میں صرف تمہیں چاہنے لگا...... پھر محبت کرنے لگا لیکن اب میں تم سے عشق کرتا ہوں اور تمہیں پتا ہے محبت بیک وقت ہم بہت سے انسانوں سے کرتے ہیں۔ اور محبت میں ہمیشہ مثبت اور منفی، جمع اور تفریق کی گنجائش ہوتی ہے مگر عشق صرف ایک سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بڑا لاحاصل جذبہ ہے۔ اس کی انتہا فنا میں ہے۔ اس کو

دوام جب ہی ملتا ہے جب اس کا طالب فنا ہو جاتا ہے۔ صرف اس کی شدت اور اس کا جذبہ باقی رہ جاتا ہے یا پھر اس کی سچائی یا پاکیزگی اور میں آج اقرار کرتا ہوں کہ محبت میرے لیے کوئی مفہوم نہیں۔ میں تم سے عشق کرتا ہوں، بے انتہا عشق...... عشق سے آگے کوئی مقام نہیں...... صرف فنا ہی فنا ہے...... تم میری ذات کا محور ہو...... اور میں تمہیں حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”شادی؟ تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتے“ اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”کیوں؟“ حسن کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

”اس لیے کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی“

”لیکن میں تمہیں پانا چاہتا ہوں اور شادی کے علاوہ تمہیں حاصل کرنے کا اور کون سا راستہ ہے؟“

”کیا دنیا میں جو کچھ ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ضرور ہمیں مل کر رہتا ہے؟“ اس نے معنی خیز انداز میں اس کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“

”جب معلوم کر لو گے پھر مجھ سے کہنا...... کیا شادی کا مفہوم تم جانتے ہو؟“ اس نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

”ہاں...... ذات کا ذات سے تعلق...... وجود کا وجود سے رشتہ...... اٹوٹ...... پختہ...... نہ ٹوٹنے والا...... اور شاید...... ذات کا ذات میں مدغم ہونا...... روح کا روح سے ملاپ......“ حسن نے جواب دیا۔

”اچھا تو تم زندگی میں کس چیز کو زیادہ اہم سمجھتے ہو، محبت کو یا شادی کو“ وہ بہت سنجیدہ ہو کر بات کر رہی تھی۔

وہ خاموش رہا۔

”حسن بولو...... میں سیریس ہوں“ وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔

”میرا خیال ہے True Love is most important, And Love

is a spiritual coupling of two souls“

”اور شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

"Successful marriage is always based on true love"

”لیکن ہمارے ہاں بعض شادیاں تو محبت کے وجود کے بغیر ہی بہت کامیاب ہوتی ہیں......“ اس نے سوال کیا۔

”وہ شادیاں نہیں...... مجبوریوں، مصلحتوں اور رسم و رواج کا ملاپ ہوتی ہیں۔ اور فریقین رشتے کو نہیں بلکہ رشتے داریوں کو ہی نبھانے میں سارا وقت گزار دیتے ہیں لیکن زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر اس کی کمی کا شدید احساس انہیں ضرور رلاتا ہے...... لیکن کچھ کر نہیں سکتے کیونکہ زندگی جیسی ہے ویسی گزارنے کی کمٹمنٹ وہ کر چکے ہوتے ہیں۔“

”کیا شادی صرف انسانوں کے درمیان ہو سکتی ہے...... کسی اور کے درمیان نہیں......“ اس نے اچانک پوچھا۔

”کیا مطلب......؟“ حسن چونکا۔

”کچھ نہیں...... بس آئندہ مجھ سے اس موضوع پر بات مت کرنا“ اور اس نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

”تم جتنا انکار کرتی ہو میرا اقرار اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے، کاش تم میرے اضطراب کا اندازہ لگا سکتی۔“ حسن قدرے بے بسی سے بولا۔

”اور کاش تم بھی...... وعدہ کرو مجھ سے ایسی بات دوبارہ نہیں کرو گے“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”ٹھیک ہے......“ حسن نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔

وہ جلتے ہوئے سگریٹ کو بہت انہماک سے دیکھنے لگی جیسے اس سے پہلے اس نے کبھی اس طرح نہ دیکھا ہو اور پھر جب وہ نتھنوں سے دھوئیں کے غبار کو باہر نکال رہا تھا تو وہ بے حد حیران ہو رہی تھی...... حسن اس سے بے نیاز کچھ سوچنے میں مصروف تھا۔ اس پوری گفتگو کے دوران اس کو بالکل ہی محسوس نہ ہوا کہ اس کو کوئی مسئلہ ہے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ وثوق اور سمجھداری سے باتیں کرتی رہی تھی...... اگر کچھ تھا تو صرف اضطراب۔

”حسن“

”ہوں“ وہ بے دھیانی میں بولا۔

"مجھے یہ سگریٹ دو" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا کیونکہ اس کے پرس میں ہمیشہ اچھی برانڈ کے سگریٹ ہوتے تھے اور اب ادھ جلے سگریٹ کے لیے اس کے لہجے میں کتنی اداسی اور التجا تھی۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر اس نے سگریٹ اسے تھما دیا۔

اس نے سگریٹ کا اتنا لمبا کش لیا کہ شدید کھانسی شروع ہو گئی اور کھانس کھانس کر برا حال ہو گیا۔ سانس اکھڑنے لگی۔ اسی حالت میں اس نے جلتا ہوا سگریٹ مٹھی میں دبا لیا، حسن نے پریشان ہو کر سگریٹ اس کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کی اس کی ہتھیلی جل چکی تھی۔ وہ مسلسل کھانس رہی تھی، تھوڑی دیر بعد نارمل ہوئی تو چہرہ ایک دم زرد پڑنے لگا۔

"چلو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں...... تمہارا ہاتھ جل گیا ہے۔"

"کب" اس نے ہتھیلی کھول کر دیکھی تو خود ہی مسکرا دی۔

"کچھ نہیں ہوا...... خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"ضحیٰ تمہیں واقعی اپنے درد، شدت، اذیت کسی چیز کا احساس نہیں رہا، تم اتنی بے حس کیوں ہو گئی ہو؟ تمہارا وجود تمہارے لیے اتنا بے وقعت کیوں ہو گیا ہے؟" حسن نے تڑپ کر پوچھا۔

جواباً وہ مسکرا دی۔

......❁......

(20)

"آنٹی ضحیٰ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ اسے کوئی نفسیاتی مسئلہ نہیں...... صرف کچھ ٹینشن ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی...... اور یہ اس کی اپنی **Will Power** پر ہے جس کی وجہ سے وہ ٹھیک ہو گی۔ آپ خوامخواہ اسے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات کے پاس نہ لے کر جائیں۔ کہیں وہ اس کو اور بیمار نہ کر دیں۔" حسن مسز توفیق کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"لیکن حسن بیٹا...... اس کو دیکھو تو سہی اس کی **Social Activities** ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔ یونیورسٹی اس نے جانا چھوڑ دیا ہے۔ صبح سویرے گھر سے نکل جاتی ہے، کبھی مٹی سے اٹے کپڑے اور پاؤں لیے گھر واپس آتی ہے، کبھی جوتے اترے ہیں۔ پوچھو تو پتا نہیں ایسی بھی کیا بے اعتنائی۔ مجھ سے اور اپنے پاپا سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ ہر وقت کمرے میں گم صم لیٹی رہتی ہے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا کچھ پتا...... اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں کیا یہ نارمل رویہ ہے؟" مسز توفیق پریشانی سے بولی۔

"آنٹی ایک بات طے ہے کہ اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں۔"
حسن اٹھتے ہوئے بولا۔

"تو پھر کس کے پاس ہے......؟ میں یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر تو نہیں بیٹھ سکتی۔"
وہ بے بسی سے بولی۔

"اچھا پھر کچھ کرتے ہیں"...... وہ خاموشی سے کہہ کر باہر چلا گیا۔

اگلی سہ پہر وہ اس کو لینے آ گیا اور وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔ اس دفعہ اس نے نہ جگہ پوچھی نہ ہی کوئی ضد کی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گاڑی ایک دربار کے سامنے روکی۔ وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"یہاں کیوں لائے ہو......؟" اس نے حیرت سے پوچھا

"تمہیں سلام کروانے لایا ہوں، بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔"

"کیا......؟" وہ چونک کر بولی۔

"حسن تم کن باتوں میں پھنس گئے ہو...... وہی دقیانوسی...... قدامت پسند...... روایتی سوچ...... اس کا مطلب ہے اندر سے سب لوگ ایک سے ہوتے ہیں۔" اور وہ کھلکھلا کر کافی دیر ہنستی رہی۔

"چلو۔" اس نے اسے باہر نکلنے کو کہا۔

اور گلاب کی پتیاں، خوشبو، چنے، مٹھائی...... اور نجانے کیا کیا، اسے پھولوں کے لفافے سمیت تھما دیا اور ایک خود ہاتھ میں لیا اور سر پر رومال باندھ کر جوتے اتارنے لگا۔

مگر وہ یونہی چل دی۔

"ارے بی بی جوتے تو اتار لو......" پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"اوہ......" وہ سمجھ گئی اور جوتے اتارنے لگی۔

"پتا نہیں کیسے کیسے لوگ آ جاتے ہیں...... نہ ادب نہ احترام" ایک اور آواز ابھری، حسن نے یہ الفاظ سنے مگر قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اس کو ساتھ لے کر چل پڑا۔

"دوپٹہ سر پر لو......" حسن نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"اس نے دوپٹے کا پلو لاپرواہی سے سر پر رکھ لیا۔

سنگ مرمر کا فرش دھوپ کی حدت سے انگارہ بنا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں جلنے لگے۔

"حسن میرے پاؤں جل رہے ہیں......" اس نے اس بیچارگی سے کہا کہ حسن دل مسوس کر رہ گیا۔ اس لمحے وہ اسے شکستہ پر طائر کی مانند پھڑپھڑاتی نظر آ رہی تھی۔

"بس تھوڑا دور ہی تو جانا ہے" حسن نے اس کو تسلی دی۔

مزار کے قریب پہنچ کر اس نے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

"ضحیٰ اس لفافے میں پھول ہیں، مزار پر ڈال دینا اور ہاں سنو دعا بھی کرنا"

"کیسی دعا؟" وہ چونکی۔

"جو تمہارے دل میں آئے کہہ لینا......" وہ جھنجھلا کر بولا۔

"وہ جب مزار کے اندر داخل ہوئی تو ایک دم اس کے اندر شور برپا ہو گیا، تلاطم

سا پیدا ہونے لگا...... اس کی پیاسی روح مچلنے لگی...... وہی کیفیت پیدا ہونے لگی جو کبھی کھنڈر کو دیکھ کر ہوا کرتی تھی۔ اس نے بھرپور نظروں سے مزار کا جائزہ لینا شروع کیا۔ گنبد...... خلا...... سبز رنگ...... ہر طرف سبز ہی سبز...... درمیان میں قبر...... بے شمار چادریں...... پھول...... کچھ سوکھے...... کچھ تازہ...... مہک...... ہی مہک...... چہار سو...... آرائشی دیواریں...... بے شمار لوگ...... ایک دوسرے کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ کچھ ورد میں مصروف تھے...... کچھ لہک لہک کر گا رہے تھے اور لوگ ان کے گرد اکٹھے تھے...... اتنی مستی...... اتنی دیوانگی...... وہ حیرت سے گھورتی رہی یوں جیسے لاشعوری طور پر کبھی ان سب سے مانوس رہی ہو، لیکن کب؟ اسے یاد نہ آ رہا تھا...... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کئی بار یہاں آ چکی ہو...... اس کو لاشعور کے یقین اور بے یقینی پر گمان سا ہونے لگا۔ اس کا سر دکھنے لگا...... وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی...... دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر...... جیسے کوئی فقیر شکستہ حال سارا دن بھیک مانگنے کے بعد سرِ شام کسی آشیانے کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ستانے کو سر ٹکا کر بیٹھتا ہے۔ کافی دیر وہ یونہی بیٹھی رہی...... ایک دم شور سا نمودار ہونے لگا...... دور ایک حلقہ سا بنا ہوا تھا اور بے پناہ لوگوں کا رش وہاں جمع ہو رہا تھا...... وہ خود بخود اس کی طرف چل دی اور ایک کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ ایک شخص شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام بڑے پرسوز و پرشوق انداز میں پڑھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا...... البتہ جب رکتا تو لوگ اس کو دوبارہ پڑھنے کو کہتے وہ پھر شروع ہو جاتا۔

هل نه هيكا ندی تيش   ويهی وجھ مرد ير

دل م آڑم دور توں   مرڑ، سنده قير

توئی لهيں نه پير   هڙ راحت ردم

پھر وہ اردو میں یوں پڑھتا:

(چلتے رہو، بیٹھ کر وقت مت ضائع کرو، اپنے دل میں حق کی تلاش اور جستجو کا مصمم ارارہ رکھو۔ اگر تمہیں منزل مقصود تک پہنچنے میں ناکامی ہو تو حق کی خاطر بیابان میں بھٹکنے میں راحت ہے)

وہ خاموش کبھی اس شخص کو دیکھتی تو کبھی اس کے کہے ہوئے لفظوں پر غور کرتی۔

"مگر شاہ جی بندہ کس کا ہاتھ پکڑے......کوئی تو ہو" ایک آدمی نے مجمع میں سے

آگے بڑھ کر گانے والے کو کہا۔

''اس شخص نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

چاڑم کنج چاڑ سین، رپی ویلی دو

لانس تھیں لد، عشق جنہیں جی اگ م

(جس کا مرشد عشق ہے وہ ضرور منزل پر پہنچے گا، بغیر وسیلے کے آگے بڑھو، اور اپنے آپ کو یکلخت بھلا دو)

''پر محبت کہاں سے سیکھے، عشق تو بڑی دور کی بات ہے'' ایک پھر بولا۔

ٹھائیں کان لیھیں، لسک مھٹجا سرین

ستری ساروز ڈیھن پاھ پاؤ نہ کیلدی

(اے میرے دوست اگر محبت سیکھنی ہو تو بھٹی سے سیکھو جو تمام وقت جلتی رہتی ہے لیکن بھاپ باہر نہیں نکالتی)

حسن ایک دم اس کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آ گیا۔

''تم یہاں ہو اور میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں، اور یہ لفافہ تمہارے ہاتھ میں ہی ہے...... یہ پھول تم نے مزار پر نہیں ڈالے۔'' حسن نے حیرت سے پوچھا۔

''کون سے پھول؟'' اس نے ہاتھ لفافے سمیت اوپر کیا۔

''لاؤ میں ڈالتا ہوں'' اس نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لیا۔

''چلو'' اور دونوں باہر نکل آئے۔ سارا راستہ دونوں خاموش رہے۔ پھر ایک دم گویا ہوئی۔

''حسن...... تم نے سنا جو وہ گا رہا تھا''

''ہاں...... شاہ صاحب کا کلام تھا۔''

''کون شاہ صاحب؟''

''شاہ عبداللطیف بھٹائی صاحب۔''

''تم ان کو جانتے ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ان کو کون نہیں جانتا۔ اللہ کے بڑے عاشق، پہنچے ہوئے نیک بندے تھے۔ بہت انسان دوست تھے مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''یونہی......'' پھر خاموش ہو گئی۔

''حسن اور تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو......؟'' تھوڑی دیر بعد پھر بولی۔

''کہتے ہیں کہ ان کو ایک خاتون سیّدہ بیگم سے عشق ہو گیا۔ یہ سیّد تھے لڑکی کے گھر والے نہ مانتے تھے۔ بہت کرب اور تکلیف سے گزرے۔ سارا سارا دن بیابانوں میں گھومتے اور کلام پڑھتے...... مگر بے سود...... لیکن یہی طلب عشق حقیقی کی طرف لے گئی۔''

''تو کیا ان کی شادی ہو گئی تھی؟''

''ہاں...... شادی تو ہو گئی، مگر اب طلب وہ نہیں رہی تھی...... اب معاملہ کچھ اور تھا......''

''کیا معاملہ تھا؟......''

''کچھ نہیں...... تم نہیں سمجھو گی۔''

جواباً وہ خاموش رہی اور سر سیٹ کے ساتھ ٹکا دیا، جیسے اونگھنے لگی ہو۔

مسز توفیق ان کے انتظار میں ٹہل رہی تھیں۔ گاڑی کی آواز سن کر چونکی۔

حسن کو اکیلے باہر نکلتے دیکھ کر اس کی جانب لپکیں۔

''بیٹے ضحیٰ کہاں ہے......؟'' وہ بے صبری سے بولی۔

''وہ گاڑی میں ہی سو رہی ہے......'' حسن نے کھینچ کر سانس لی۔

''اس کو اٹھانا مت...... شاید آج وہ ساری رات نہیں سوئی...... ساری رات اس کے کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہی ہیں۔ میں اور اس کے پاپا یہی مشورہ کر رہے تھے کہ اس کو علاج کے لیے باہر لے جائیں۔''

''آنٹی کوئی فائدہ نہیں'' حسن نے کہا۔

''کیوں؟...... کیا کوئی خاص بات ہے'' مسز توفیق پریشانی سے بولی۔

''پتا نہیں...... شاید وہ ایسے مرض میں مبتلا ہے جس کا ڈاکٹرز کو بھی پتا نہ چل سکے۔ اس کو ہوش نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے کیا کر رہی ہے۔ لیکن کسی وقت بالکل نارمل ہوتی ہے۔''

''کیا مطلب کہیں شیزوفرینیا (Schizophrenia) تو نہیں۔''

''پتا نہیں ...... لیکن کبھی کبھی وہ بہت نارمل ہوتی ہے...... مجھے تو خود سمجھ میں نہیں

آتا کہ یہ سب کیا ہے؟'' حسن متفکر لہجے میں بولا۔

''پھر کیا کروں......تم ہی کچھ بتاؤ''

''آپ کوشش کر دیکھیں......'' وہ کہہ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیٹ سے باہر نکل آیا۔

پورے دو گھنٹے وہ گاڑی میں یونہی بے سدھ پڑی رہی...... بیدار ہوئی تو خود ہی اندر آگئی۔

''ماما میں گاڑی میں سو رہی تھی، آپ نے مجھے اٹھایا نہیں'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید میں حسن کے ساتھ کہیں گئی تھی'' اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں تم حسن کے ساتھ ہی کہیں گئی تھی۔''

''اوہ...... ہاں یاد آیا......'' اور ساتھ ہی بہت کچھ یاد آنے لگا۔

'حسن کہاں ہے......؟''

''وہ چلا گیا''

''گاڑی کے بغیر......؟''

''ہاں تم سو رہی تھی اس نے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا''

وہ جلدی سے فون کی طرف گئی اور نمبر ملانے لگی۔

''ہیلو آنٹی حسن کہاں ہے......؟'' اس نے حسن کی ماں سے پوچھا۔

''وہ تو گھر پر نہیں......'' اور اسی لمحے حسن اندر داخل ہوا۔

''لو وہ آ گیا ہے'' اور انہوں نے فون اسے تھما دیا۔

''حسن تم اب گھر پہنچے ہو'' وہ حیرت سے بولی:

''ہاں......''

''کیا تم پیدل آئے ہو......؟''

''ہاں......''

''آئی ایم سوری...... میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف اٹھانا پڑی''

وہ شرمندہ ہو رہی تھی۔

''مجھے تمہاری نیند زیادہ پیاری تھی'' اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

''تھینک یو حسن'' وہ بہت زیادہ شکر گزار ہو رہی تھی اور پھر اس نے فون رکھ دیا۔

مسز توفیق حیرت سے اس کی جانب مسلسل دیکھ رہی تھیں۔

''ادھر آؤ بیٹا......'' انہوں نے پیار سے اسے اپنے پاس بلایا۔

جب سے اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی ماں باپ نے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا تھا اور اب اس کو زیادہ وقت دینے کی کوشش کرتے۔

''کیا پریشانی ہے بیٹا...... مجھے تو بتاؤ میں تمہاری ماں ہوں، اور ماں سے کچھ نہیں چھپاتے...... انسان ساری دنیا سے غم چھپا سکتا ہے مگر ماں سے نہیں......'' اس کی ماں شاید زندگی میں پہلی دفعہ ایسے الفاظ استعمال کر رہی تھی۔ اس لیے کچھ دقت محسوس کر رہی تھی۔

''ماما میں کیا بتاؤں...... آپ کیا سننا چاہتی ہیں...... کیا میں نے کوئی غلط کام کیا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے بیٹا...... نہیں تو میں ایسا کب کہہ رہی ہوں...... ہمیں تم پر مکمل اعتماد ہے۔''

''نہیں ماما میں اعتماد کے قابل نہیں۔ کیونکہ مجھے اپنے، آپ پر اعتماد نہیں رہا، اعتماد تو اس وقت ہوتا ہے جب اندر مکمل سکون ہو۔ اطمینان ہو، جب اندر ہی......شور اور افراتفری ہو تو اعتماد کہاں سے جنم لے گا......'' وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور مسز توفیق بہت کچھ سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟......'' وہ کریدتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں...... بس تھک جاتی ہوں۔ کبھی کبھار بہت زیادہ''

اس نے زبان خشک ہونٹوں پر پھیری اور اٹھ کر کمرے میں چل دی۔

......❁......

(21)

موسم گرما کی شدید دھوپ نے ہر طرف کہرام مچایا ہوا تھا۔ ہر طرف ایک ویرانی سی چھائی تھی، سڑک سنسان اور ویران پڑی تھی...... چرند پرند کسی کی بھی آواز نہ آرہی تھی...... یوں لگ رہا تھا جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو...... ہر طرف شدید تمازت تھی۔ اتنی حدّت کہ سب خدا کی پناہ مانگ رہے تھے۔ ایسے وقت میں ہر کوئی سائے کی تلاش میں ہوتا ہے اور تمام مخلوق کمین گاہوں میں چھپنے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ اس وقت باہر جارہی تھی۔

''اس وقت کہاں جارہی ہو......؟'' اس کی ماں نے اس کو باہر نکلتے دیکھ کر کہا۔

''مما بس ابھی آتی ہوں......'' اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہتی وہ گاڑی سٹارٹ کر کے چلی گئی۔

کافی دیر بھٹکنے کے بعد وہ دربار پہنچ گئی۔ بہت کم لوگ اس وقت وہاں موجود تھے۔ کچھ عورتیں بیٹھی پڑھ رہیں تھیں، کچھ دوسری عورتوں کو اپنے دکھ سنا رہیں تھیں...... شاید وہ اپنے اندر کا بوجھ ہلکا کرنے یہاں آئیں تھیں۔ حبس اور لو نے برا حال کر رکھا تھا۔ ہر ایک پسینے سے شرابور تھا...... اور پسینے کی بو...... گلاب کی خوشبو پر حاوی ہو گئی تھی...... کبھی کبھار گرم ہوا کے سنگ گلاب کی مہک سی اٹھتی مگر اگلے ہی لمحے دب سی جاتی۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان خراساں چہرے...... وہ بھی ان کے درمیان چلتی ہوئی مزار کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی...... اور خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورنے لگی۔ پھر اس طرف چلنے لگی جہاں اس دن مجمع تھا مگر آج وہاں کچھ بھی نہ تھا...... وہ کچھ دیر وہاں بیٹھی رہی اور فرش کو گھورتی رہی...... آہستہ آہستہ لوگ اٹھ کر جانے لگے اور آنے لگے مگر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ ایک بوڑھی مجاورن سگریٹ منہ میں دبائے مسلسل اس کو گھور رہی تھی۔ کبھی اسے منہ میں گالیاں دیتی...... کبھی کچھ بکتی اور کبھی منہ پھیر کر دوسروں کی جانب دیکھنا شروع

کر دیتی۔ جیسے جیسے سورج ڈھلنے لگا لوگوں کا بھی ہجوم بڑھنے لگا...... مجاورن غصے سے اٹھی۔

''نہ کوئی منت...... نہ کوئی نذرانہ...... اٹھ بی بی...... اب گھر جا۔ کب کی آئی ہو...... نجانے گھر والے بھی کیوں نکال دیتے ہیں'' اس نے بازو سے پکڑ کر اسے گھسیٹا۔

اس نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور خاموش بیٹھی رہی۔ ''بہت ڈھیٹ لگتی ہو...... اٹھو ورنہ پولیس کو بلواتی ہوں۔'' مجاورن غصے سے بولی۔

اس کے لہجے میں بے حد حقارت اور بدتمیزی تھی کہ اسے اٹھنا پڑا...... اور وہ سیڑھیوں میں جا کر بیٹھ گئی...... ہر کوئی آنے جانے والا حیرت سے اسے دیکھتا اور یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ آیا وہ فقیر تھی یا پھر کوئی دکھیاری...... لیکن اگلے ہی لمحے وہ اسے چھوڑ کر چل پڑتا۔

شام ہونے لگی تھی اور آہستہ آہستہ رات کے گہرے سائے بھی اس کی جگہ لینے کے لیے چاروں طرف لپکنے لگے تو وہ گھر آ گئی...... مسز توفیق سخت غصے میں تھیں مگر کچھ کہا نہیں۔

وہ اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ آج رات اس کو عجیب سا سکون ملا تھا۔ عجیب سی سرشاری تھی جو روح پر چھائی تھی...... صبح دیر تک وہ سوتی رہی۔

روزانہ اس کا یہی معمول تھا۔ وقت نکال کر کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاتی...... مجاورن اس کو آتے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی...... اور وہ خاموشی سے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتی...... وہ مزار کے گنبد اور اس کی چھت کو ہی گھورتی رہتی...... مسلسل اس کے ذہن میں کھنڈر اور اس کی چھت گھومتے رہتے...... اس طرح اس کی بھی چھت ضرور ہو گی...... کیا کبھی وہ بھی ایسا تھا...... اور یہ بھی...... مگر چھت اور دروازہ تو یہاں ہے...... وہاں کیوں نہیں...... ضرور ہو گا۔ اس کا ذہن مسلسل مماثلت کے ذرائع تلاش کرتا رہتا۔

درمیان میں کچھ دن آرام کے گزرے تھے۔ مگر اب وہ پھر روزانہ معمول کے مطابق آتی تھی...... دن بدن وہ اتنی کمزور ہوتی جارہی تھی کہ چہرے پر چھائی پژمردگی سے وہ برسوں کی بیمار لگتی تھی۔ ہاتھوں کی رگیں ابھر کر اوپر آ گئی تھیں اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر یوں باہر نکل آئیں تھیں جیسے کبھی ان پر گوشت تھا ہی نہیں۔ لیکن وہ ان سب چیزوں سے تب باخبر ہوتی جب وہ اپنا آپ محسوس کرتی...... اس کے تقاضوں کو سمجھتی...... وہ تو لاشعوری طور پر ایسی منزل کی جانب گامزن تھی جس کا خود اس کو کوئی علم نہ تھا۔

مجاورن اس کے روز روز کے آنے سے تنگ آ گئی تھی...... اس کا بلا ناغہ بغیر کسی نذرانے کے آنا اس کو سخت برا لگتا تھا۔ وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھی کہ کسی طرح اس کو باہر نکالے۔

ایک دن اس نے انتہا کر دی...... سہ پہر کو نکلی، شام ہو گئی، اور پھر رات کی تاریکی چھانے لگی مگر وہ اٹھنے کا نام نہ لے رہی تھی...... چند ایک تبرک کے طور پر کچھ نہ کچھ چیزیں زبردستی اس کی جھولی میں ڈال گئے...... جنہیں وہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔

رات کے نو بج رہے تھے جب مسز توفیق نے حسن کو فون کیا...... وہ اسی لمحے بھاگتا ہوا آیا...... سب دوستوں کے گھر فون کیے مگر جواب ندارد۔ وہ گاڑی لے کر ہر اس جگہ گیا جہاں اس کو امید تھی کہ وہ وہاں ہو گی مگر وہ کہیں نہ تھی۔ نادانستہ اس نے گاڑی کا رخ دربار کی جانب کر دیا...... وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر چکرا سا گیا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس بکھرے بالوں، آلودہ وجود اور پژمردہ چہرے کے ساتھ یوں پڑی تھی جیسے ابھی ابھی گری ہو۔

"ضحیٰ" اس نے قدرے غصے اور نرمی سے کہا۔

اس نے ایک ٹک حسن کی طرف دیکھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"حسن...... اس نے مجھے دھکا دیا ہے۔" اس کے لہجے میں انتہا کا درد تھا۔

"کس نے......؟" وہ غصے سے بولا۔

"آؤ اوپر میں تمہیں دکھاؤں......" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اوپر لے گئی۔

حسن غصے سے مجاورن کی جانب بڑھا۔

"تم نے کیوں اس کو دھکا دیا ہے؟" وہ معصوم چڑیا کی مانند اس کے بازو کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"اتنا خیال ہے تو گھر رکھا کرو...... کیوں آوارہ چھوڑ دیتے ہو۔"

"تمیز سے بات کرو...... تم عورت نہ ہوتی اور یہ جگہ مقدس نہ ہوتی تو پھر میں تمہیں بتاتا...... سنا تم نے اور جو حرص و ہوس تم لوگوں کو ہے نا، بہتر جانتا ہوں...... اس نے جیب سے سو سو کے دو تین نوٹ نکال کر اس کی جانب پھینکے......

وہ زبان کی تمام کڑواہٹ اور تلخی ایک دم بھول گئی اس نے منہ میں آتے پانی کو

بمشکل روکا۔

"فکر نہ کرو باؤ جی...... آج سے اس کی ساری ذمہ داری میری" مجاورن خوشامدی لہجے میں بولی۔

"چلو آنٹی پریشان ہیں۔" حسن نے نرمی سے کہا۔

مسز توفیق اسے دیکھ کر رونا شروع ہو گئی۔

"حسن یہ کہاں تھی......؟" انہوں نے اس کا حلیہ دیکھ کر پوچھا۔

مگر وہ خاموشی سے کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

"ضحیٰ تم نے بہت اپنی مرضی کر لی۔ اب تم گھر سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکالو گی۔" ان کا لہجہ قدرے تحکمانہ تھا۔

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

......۞......

(22)

بہت دنوں سے اسے فریدی صاحب کی بہت یاد آ رہی تھی۔ مما نے اس کے گھر سے نکلنے پر سخت پابندی لگا دی تھی۔ وہ ہر وقت اس کی نگرانی کرتی رہتی جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلتی چاروں طرف سے نوکر، ڈرائیور اور وہ خود محتاط ہو کر اس پر نظر رکھتے...... جتنی پابندیاں لگ رہی تھیں اتنی ہی وہ بے تاب ہو رہی تھی۔ بار بار فریدی صاحب کے آفس فون کرتی مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ ملتا۔ تنگ آ کر اس نے ان کے گھر فون کیا تو پتا چلا کہ ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہیں کب آئیں گے کوئی پتا نہیں۔ طبیعت میں عجیب سا بوجھل پن پیدا ہو گیا تھا ایسی بے کلی، بے چینی اور اضطراب تھا کہ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مضبوط سہارا چھن گیا ہو۔ تپتے صحرا میں ابر کا ایک سایہ تھا وہ بھی جھلک دکھا کر کہیں غائب ہو گیا ہو...... اب ان کو کہاں ڈھونڈے۔ وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی تھی اور گھر میں بھی رہ رہ کر وہ تنگ آ گئی تھی۔

برسات شروع ہونے میں ابھی چند دن باقی تھے اس لیے سورج بھی بھرپور طریقے سے ان دنوں کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ یوں آنکھیں دکھا دکھا کر چمک رہا تھا کہ خدا کی پناہ۔ مسز توفیق کو اتفاق سے کہیں جانا پڑ گیا اور وہ بھی موقع پا کر باہر نکل گئی۔ بہت دنوں کے بعد گھر سے نکلی تھی اس لیے گرمی کا بھی کوئی احساس نہ تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پنچھی پنجرے کی قید سے آزاد ہوا ہو اور وہ اتنا ہی خوش ہو رہی تھی جتنا کہ آزاد پنچھی...... اس کا رخ کس طرف تھا۔ اس کو خود معلوم نہیں تھا۔ دو گھنٹے یونہی شہر میں آوارہ گھومنے کے بعد وہ شہر سے باہر آ گئی۔ کہیں سرسبز و شاداب کھیت آن واحد کی طرح نظر آتے تو کہیں ٹنڈ منڈ جھاڑیوں نما درخت، کہیں قدیم بے شمار جڑوں والے گھنے پیڑ تو کہیں دور دور کھلے میدان اور ٹیلے...... کبھی کبھار کوئی بشر ان پر چلتا نظر آ جاتا...... اس کی گاڑی

کہاں رکے گی اسے خود علم نہ تھا...... سورج کی تمازت آہستہ آہستہ کم ہونے لگی اور اس کی زرد پڑتی روشنی فضا کو قدرے افسردہ سی بنانے لگی تھی کہ ایک دم گاڑی جھٹکے سے رکی۔ اس نے حیرانگی سے دیکھا۔

''اوہ''...... سارا پٹرول ختم ہو گیا تھا اور اسے پتا تک نہ چلا تھا۔ وہ گاڑی بند کر کے باہر نکلی...... ارد گرد نگاہ دوڑائی، ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ نہ کوئی بشر کہیں نظر آ رہا تھا نہ کوئی حیوان...... ایسے میں پٹرول کہاں سے ملے۔ وہ قدرے پریشان تھی اور اسی پریشانی میں وہ کھیتوں میں گھس گئی...... درمیان میں اونچی اونچی پگڈنڈیاں، ٹوٹے پھوٹے مٹی کے ڈھیلوں سے بنی تھیں...... یہ پگڈنڈیاں ضرور کہیں نہ کہیں جاتی ہوں گی اور یہ سوچ کر وہ ان پر چلنے لگی۔ ہوا کے گرم، تیز و تند جھونکے تھپیڑوں کی مانند اس کے چہرے سے ٹکراتے۔ کبھی مٹی سی آنکھوں میں پڑتی تو وہ آنکھیں بند کر کے چلنا شروع کر دیتی...... دور کہیں سے رہٹ کی آواز آ رہی تھی...... اس کا مطلب ہے شاید قریب کہیں گاؤں ہو...... لیکن آبادی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ چلتے چلتے عین کھیتوں کے درمیان اسے ایک ویران سا کھنڈر نما کمرہ نظر آیا...... ایک اور کھنڈر...... نادانستہ قدم اس کی جانب اٹھ گئے۔ چار دیواری سی بنی تھی اور درمیان میں ایک چھوٹا سا خستہ حال کمرہ...... جس کی شکستہ دیواریں اس کے قدیم ہونے کا پتا دے رہی تھیں۔ صحن بھی کچا تھا مگر صاف ستھرا اور کونے میں بان کی ایک چارپائی بچھی تھی...... لیکن کوئی بشر نظر نہ آ رہا تھا۔ کونے میں ایک چھوٹا سا پمپ بھی لگا تھا...... ہینڈ پمپ...... اس نے پمپ سے منہ ہاتھ دھویا۔ کافی دیر پمپ سے پانی نکلنے کا عمل اسے متاثر کرتا رہا پھر اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ارد گرد نظر دوڑائی، کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے کی طرف گئی۔ اس کا چھوٹا سا دروازہ تھا جو بند تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ اندر ایک قبر پر بوسیدہ سی چادر اور چند سوکھے پھول پڑے تھے جن میں کوئی مہک باقی نہ تھی اور نہ ہی کوئی شگفتگی...... کونے میں مٹی کا ایک دیا جس میں تیل نہ ہونے کے برابر تھا اور ساتھ ہی ایک ڈبیا پڑی تھی۔ دیواروں پر کہیں کہیں موٹے سفید کاغذوں کو کوٹ کر ان پر چند آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔ عجیب سی خاموشی چھائی تھی جو نہ ڈس رہی تھی نہ حیران کر رہی تھی۔ وہ وہاں بالکل تنہا تھی اس نے قبر کے گرد چکر لگایا اور آہستہ آہستہ اس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کی نظر ایک دم چھت کی طرف اٹھی...... ہاں اس کی

چھت بھی ہے...... اور دروازہ بھی...... اس کا مطلب ہے یہ مکمل ہے...... اس کا وجود ہے......تکمیل کا احساس اسے اندر ہی اندر اچھا لگنے لگا۔ وہ وہیں کونے میں بیٹھ گئی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ بے خوفی سے وہیں کونے میں بیٹھی تھی۔ دربار پر جانے سے جو اس میں شور اور تلاطم تھا اور کبھی کبھار سکون کی لہر اندر دوڑتی تھی اب یہاں پر مکمل سکون ہی سکون تھا نہ کوئی گھبراہٹ تھی نہ ہی کوئی اضطراب...... نہ بے چینی...... نہ بے قراری...... ایسا سکون تھا جیسے طوفان کے بعد لہریں آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتی ہیں اور یوں جیسے کبھی وہ طوفان سے آشنا ہی نہ ہوئی ہوں...... اس کو بھی عجیب سی مسرت تھی۔ کیسی اسے خود معلوم نہ تھا وہ صرف محسوس کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور سفید کپڑوں میں ملبوس دو بزرگ اندر داخل ہوئے۔ ایک کی دو تین انچ سفید داڑھی تھی اور چھوٹے چھوٹے سفید بال، چہرہ ایسا نورانی کہ آنکھیں اس کی چکا چوند سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ دوسرے کے چہرے پر سنہرے فریم کی عینک تھی اور وہ چہرے سے پڑھا لکھا مہذب انسان لگ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی کہ آہٹ کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر دونوں کی جانب دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

''آ......آ......ف......فریدی صاحب!'' اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔

فریدی صاحب کے چہرے پر ہلکا سا تبسم پھیلا۔

''نہیں عبدالرحمٰن......'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے......؟'' وہ قدرے روہانسی ہو کر بولی۔

''یہیں تھا......لیکن......'' دوسرے بزرگ نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے مزید کچھ کہنے کو روک دیا۔

''تمہیں انتظار کرنا پڑا...... اس کے لیے معذرت خواہ ہیں......ہمیں معلوم تھا تم آ گئی ہو......'' بزرگ بولے۔

''ک......ک......کیسے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''صاحب کھانا لائیے، بچی بھوکی ہے۔'' بزرگ نے فریدی صاحب سے کہا۔

اور وہ اٹھ کر باہر سے ایک خشک روٹی اور سالن لائے۔ انہوں نے اس کے آگے وہ کھانا رکھ دیا۔

''کھاؤ......'' بزرگ نے اشارہ کیا۔

''مجھے بھوک نہیں......'' وہ کھانے کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تمہیں بھوک بھی ہے...... اور اضطراب بھی...... ہم جانتے ہیں......حق نعمتوں کا ٹھکرانا پسند نہیں کرتا۔ وہ عطا کرنا جانتا ہے محروم کرنا اس کو پسند نہیں......'' بزرگ نے انتہائی شفقت و ملائمت سے کہا۔

اسے چار و ناچار چند ایک نوالے لینے پڑے۔

''پوری روٹی ختم کرو۔'' انہوں نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

اور اسے بمشکل کھانا پڑا......سوکھی روٹی مشکل سے ہی حلق سے نیچے اتر رہی تھی اور وہ پانی کے بڑے بڑے گھونٹوں کے ساتھ اسے نیچے اتار رہی تھی...... کھانے سے فارغ ہونے کے بعد فریدی صاحب نے اس کے سامنے سے برتن ہٹائے...... اور دونوں بزرگ اس کے پاس بیٹھ گئے۔ چند ثانیے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے وہ کچھ کہنے کی کوشش میں تھے اور وہ کچھ سننے کی۔

''نفس کی جس منزل سے تم گزر چکی ہو اب اس کے بعد تعین بہت ضروری ہے۔ بھٹکنا چھوڑو۔ اب عمل کی باری ہے۔ حرکت کی...... یا پھر آزمائش کی۔ یہ اس سے بھی مشکل مرحلہ ہے۔ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرو۔ اضطراب ختم ہو جائے گا۔ سوچ کے بعد عمل کا مرحلہ آتا ہے۔'' داڑھی والے بزرگ نے اسے سمجھایا۔

''کیسے؟......'' وہ حیرت سے بولی۔

''حق، تیاگ اور تپسیا سے......''

''میں سمجھی نہیں......'' اس کی آنکھیں چمکیں۔

''سمجھ جاؤ گی...... جہاں قدم پڑتے ہیں وہاں راستہ پہلے بنا ہوا ہوتا ہے۔ اٹھتے قدموں تلے زمین ضرور ہوتی ہے۔ ادراک اور شعور اس کی پہلی منزل ہے۔ لڑکھڑاؤ گی مگر گرنا نہیں، سنبھلو...... وجدان اور شعور کی آنکھ سے دیکھو...... ہر منظر صاف اور چمکدار ہو گا۔'' بزرگ نے سمجھایا۔

''لیکن کیسے......؟''

''سچائی، سچائی ہوتی ہے اس میں ملاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اگر اس میں ہلکی سی بھی

آمیزش ہو جائے تو وہ پھٹے دودھ کی مانند پھیل جاتی ہے۔ جب دودھ میں پھوٹ پڑتی ہے تو پھر اس کو یکجا نہیں کیا جاسکتا وہ ہمیشہ پھٹکیوں اور ذروں کی صورت میں علیحدہ علیحدہ منتشر اور مضطرب رہتا ہے...... وجود کچھ بھی نہیں، حقیقت اصل کی ہوتی ہے...... روح کی...... اور روح سچائی چاہتی ہے بغیر کسی آمیزش کے...... بغیر منافقت اور ملاوٹ کے...... حق جب اس کو تخلیق کرتا ہے تو وہ سچے موتیوں کی طرف صاف، شفاف، پاک اور چمکدار ہوتی ہے لیکن دنیا میں آکر اپنے مزاج سے لاپرواہ ہو جاتی ہے اس پر مکر وفریب اور ریا کے پردے نمودار ہونے لگتے ہیں اور جب آہستہ آہستہ پردوں پر پردے چڑھنے لگتے ہیں تو وہ ان غلافوں میں لپٹ کر اپنی ماہیت کھو دیتی ہے...... انسان نفس کا غلام بن جاتا ہے...... وہ اندر سے اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ ہوا کے ایک جھونکے کے سنگ تنکے کی طرح اڑتا پھرتا ہے......

جتنا نفس کمزور ہوتا جاتا ہے انسان اتنا ہی ذلیل اور مضطرب ہونا شروع ہو جاتا ہے...... اس کے اندر حق کی طلب باقی نہیں رہتی...... عشق تو کیا محبت کی ابتدا ہی ختم ہو جاتی ہے...... نفس بھٹک جاتا ہے...... انسان مایوس اور بے حوصلہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ تب روحیں بے تاب اور تشنہ ہو جاتی ہیں......توانائیاں......قوتیں...... ادراک اور شعور ختم ہو جاتا ہے۔ اجسام ٹھیکرے بن جاتے ہیں اور طبیعتیں ہذیان بکتی ہیں...... دماغ سوچنا چھوڑ دیتے ہیں......سوچیں منتشر ہو جاتی ہیں...... دل بے قرار ہو جاتے ہیں...... اور...... پھر انسان ریت کے ذرے کی مانند حقیر ہو کر ادھر ادھر اڑتا پھرتا ہے اور پھر سب کچھ بکھر جاتا ہے۔

بے شک انسان اپنے فطری تقاضوں کو نظر انداز کر کے اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اور ہادی فرماتے ہیں کہ ''انسان تاریکی میں پیدا کیا گیا ہے مگر حق اسے اپنی تجلیات سے منور کرتا ہے لیکن جب کوئی حقیقت کو پانے کی سعی کرتا ہے تو حق کشف کے حسن و جمال کو اس پر عیاں کر دیتا ہے۔ نفس کو جھٹلاؤ...... وگرنہ یہ نفس ناطقہ روح طیبہ کو منتشر کر کے رکھ دے گا۔ روح کو سرکشی سے بچاؤ...... ڈھونڈو خدا کو جو انسان میں ہے اور انسان کو جو خدا میں ہے...... اور جس کی پہچان اس کی تخلیق سے ہوتی ہے نفس کی جس منزل پر چل کر تم آئی ہو...... اگلی تک احتیاط لازم ہے...... گھڑا بھرا ہو تو قدم آہستہ آہستہ اٹھاتے ہیں کہیں پانی چھلک نہ جائے...... اور سنو ہمت...... حوصلہ اور اعتماد انسان کو بڑے ہتھیار دے گئے ہیں۔ قدرت کو اپنی تخلیق پر فخر ہوتا ہے...... جب وہ سب کچھ فنا کر دیتا ہے۔ اس کے لیے جس

سے انسان کو پیار ہوتا ہے۔'' اور اسی لمحے اسے حسن ایک دم یاد آ گیا ''عشق میں، یا عشق سب کچھ فنا کر دیتا ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے اور پھر خاموش ہو گئے۔

''ہم چلتے ہیں......'' اور وہ دونوں اٹھ کر باہر نکل گئے۔

''وہ وہیں فرش پر بیٹھی رہی، حیرت...... شوق یا وارفتگی اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ وجود میں ایک لہر سی سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی جس میں سرور ہی سرور تھا...... اس نے جو کچھ سنا تھا اس نے اتنا اثر کیا تھا کہ وہ خود حیران ہو رہی تھی۔ لہجے میں بے حد تراوت شگفتگی اور مٹھاس تھی اور الفاظ ایسے تھے جیسے ہر ہر لفظ شہد اور شیرینی سے نکالا گیا ہو۔ زندگی میں اس نے کبھی بھی کسی کو اس طرح بولتے نہ سنا تھا۔ اسے دکھ سا ہونے لگا کہ بعض اوقات انسان اپنے گرد وپیش سے کتنا بے خبر ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے اردگرد پھیلی نعمتوں اور رعنائیوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اسے یوں لگا جیسے منزل کا تعین ہو گیا ہو۔ اس کے بے قرار دل کو سکون سا آنے لگا...... وہ مسلسل انہی کے بارے میں سوچتی رہی اور نجانے رات کے کون سے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی ایک عورت آئی اور اس کے آگے چائے کا کپ رکھ کر چلی گئی۔ چائے پینے کے بعد وہ باہر نکلی اور دور دور تک نظر دوڑائی۔ ایک ویرانہ سا تھا۔ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی تھی ہلکی ہلکی ہوا کھیتوں سے لہرا کر گزرتی تو ننھے ننھے ڈنٹھل جھومنے لگتے درختوں سے چھیڑخانی کرتی تو وہ بھی مزا لے لے کر پھڑ پھڑانے لگتے۔ سورج آہستہ آہستہ اوپر جا رہا تھا اور اس کی حدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ دوپہر ہو گئی مگر کوئی بھی نہ آیا۔ پھر ایک نوعمر لڑکا روٹی اور ساگ اس کے سامنے رکھ کر جانے لگا۔

''سنو مجھے گھر جانا ہے۔''

لڑکے نے اس کی طرف ذومعنی نظروں سے دیکھا اور باہر نکل گیا۔

......۞......

(23)

دو دن سے مسز توفیق کا برا حال تھا۔ توفیق صاحب کو اچانک بیرون ملک جانا پڑ گیا اور جاتی دفعہ دونوں میں خوب گرما گرمی ہوئی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو ضحیٰ کی اس حالت کا ذمہ دار ٹھہراتے رہے......

''میں باہر سے آ کر کچھ فیصلہ کرتا ہوں......'' توفیق صاحب بیوی کو دھمکی دے کر گئے۔

مسز توفیق نے حسن کو فون کر کے بلایا تھا...... وہ بھی پریشان ہر جگہ اسے ڈھونڈتا رہا مگر کہیں سے کوئی خبر نہ مل رہی تھی اور اب ہر ملنے والے کا فون آ رہا تھا اور وہ شرمندہ پہ شرمندہ ہو رہے تھے۔ جواں بیٹی کا گھر سے یوں اچانک غائب ہو جانا نہ صرف ان کے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے لمحہ فکر یہ بن گیا تھا۔ کوئی ازراہِ ہمدردی دبے دبے لفظوں میں اسے مینٹل ہسپتال داخل کرانے کا مشورہ دیتا...... کوئی باہر لے جانے کا...... کوئی شادی کا...... اور کوئی جھاڑ پھونک کا...... اور مسز توفیق ان مشوروں سے تنگ آ گئی تھیں اور انہوں نے فون اٹینڈ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''آنٹی...... تھانے میں رپورٹ درج نہ کراؤں؟......'' حسن نے مشورہ دینا چاہا۔

''نہیں بیٹا...... تم اپنے انکل کی پوزیشن سے تو واقف ہو۔ کل ہی خبر اخبار میں لگ جائے گی اور رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔'' وہ قدرے تشویش سے بولی۔

''آپ ہی بتائیے میں کیا کروں...... تمام ہسپتال، دوست، کلب، ہر جگہ تو اس کو تلاش کر چکا ہوں۔'' وہ دکھ اور غم سے نڈھال ہو رہا تھا۔ شاید اس کے عشق کی بھی آزمائش ہو رہی تھی۔

''وہ آتی ہے تو میں تم دونوں کی شادی کر دوں گی۔''

''نہیں آنٹی شاید اب شادی کچھ نہ کر سکے۔'' وہ ناامیدی سے بولا۔

''کیا مطلب؟......'' وہ چونکیں۔

''وہ میرے سامنے رہے یہی کافی ہے......''

''حسن مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آخر اس کو کیا ہوا ہے۔ اس کا مسئلہ کیا ہے۔ کیا وہ واقعی تو پاگل نہیں ہو رہی......'' انہوں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں آنٹی وہ پاگل نہیں...... لیکن اس کے ساتھ کچھ ایسا ہے جو ہمیں سمجھ نہیں آ رہا......'' حسن متفکر لہجے میں بولا۔

''اب آئے تو میں کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھاتی ہوں۔''

''ہاں ملے تو......'' حسن بڑبڑایا۔

''اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی...... حسن نے فون اٹھایا...... حسن کی ماں اسے ڈانٹ رہی تھی اور جلد آنے کو کہہ رہی تھی۔

''آنٹی ممی کا فون ہے کسی کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور شاید مجھے ان کو لے کر شہر سے باہر جانا پڑے...... ڈرائیور گھر پر نہیں اس لیے مجھے جانا پڑے گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''تم بھی جا رہے ہو'' وہ آہستہ سے مگر تاسف سے بولیں جیسے بہت بڑا سہارا بچھڑ رہا ہو۔

''فکر نہیں کریں میں ہر حالت میں شام تک لوٹ آؤں گا۔''

وہ گھر پہنچا تو ساری فیملی کسی شادی میں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ حسن کو غصہ سا آنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، اس کی ماں پھٹ پڑیں۔

''کچھ تمہیں ہوش بھی ہے کہاں آوارہ بھٹکتے پھرتے رہتے ہو۔ اس پاگل لڑکی نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی دیوانہ بنا چھوڑا ہے۔ اپنا حلیہ دیکھو، مجھے تو سمجھ نہیں آتا کہ آخر تم کیوں اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہو...... کیا ہے اس میں...... ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی ہے نجانے تمہیں کیا ہو گیا ہے...... بس اب میں تمہاری شادی کر کے ہی دم لوں گی۔''

''نہیں ممی...... آپ ایسا نہیں کر سکتیں، مجھے کوئی شادی نہیں کرنی۔'' وہ افسردگی سے بولا۔

''کیا مطلب...... کیا حماقت ہے یہ...... اپنی طرف دھیان سے دیکھو...... تم بچے

نہیں رہے...... بلکہ بوڑھے ہو رہے ہو...... چند سال اور گزر گئے تو کوئی لڑکی بھی شادی کے لیے رضامند نہیں ہوگی۔'' وہ غصے سے بولیں۔

''میں نے کہا نا مجھے شادی نہیں کرنی، ضروری تو نہیں جو محبت کرے وہ شادی بھی کرے اور شادی تو ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتی...... اور پھر میں نے جس سے محبت کی ہے اگر اس سے شادی نہ کر سکا...... تو کیا فائدہ...... محبت کسی اور سے...... اور شادی کسی اور سے...... میں اپنی ذات کو بانٹنا نہیں چاہتا...... اگر وہ مجھے نہ مل سکی تو کسی اور سے مجھے کیا تسکین ملے گی۔'' اس نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

''یہ تو حماقت ہے، دیوانگی ہے اور پاگل پن ہے......'' اس کی ماں غصے سے بولی۔

''ہاں شاید...... لیکن جو کچھ بھی ہے میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ اب مزید مجھ سے اس سلسلے میں بات نہ کریں...... چلیں گاڑی میں بیٹھیں میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر آتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

سارا راستہ وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا اور ساتھ ساتھ مسلسل سموکنگ بھی کرتا رہا، ایک لمحے کے لیے بھی وہ سگریٹ نہ چھوڑتا...... اس کی ماں اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی وہ اپنے جواں سال بیٹے کو یوں لحہ بہ لحہ گھلتے نہ دیکھ سکتی تھیں۔

''تم مجھے اس لڑکی کے گھر لے چلو......'' ان کی آواز بھرا گئی۔

''کس لڑکی کے......''

''جس کو تم چاہتے ہو......''

''ایسا ممکن نہیں......''

''کیوں؟''

''معلوم نہیں......'' اور خاموشی سے گاڑی چلانے لگا۔

''حسن...... خدا کے لیے سموکنگ کم کردو...... پھینک دو اس سگریٹ کو......'' ماں نے افسردہ ہو کر کہا۔

اس نے ایک ٹک سگریٹ کو دیکھا اور پھر اسے مٹھی میں مسل دیا۔

''یہ تم نے کیا کیا؟'' اس کی ماں تڑپ اٹھیں۔

''کیا ہوا؟......'' اس نے ایسے پوچھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''تمہارا ہاتھ نہیں جلا......''

''نہیں تو ......'' اور اس کی آنکھوں میں ایک دم آنسو آ گئے۔ اسے اپنی چاہت ایک دم یاد آنے لگی...... شدت کے ساتھ...... وُہ کہاں ہو گی...... اور اس نے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے زور زور سے کھانسنا شروع کر دیا...... ماں نے محبت اور شفقت سے اس کی جانب دیکھا اور اپنا لرزاں بوڑھا ہاتھ آہستہ آہستہ اس کی پیشانی پر پھیرا جہاں پانی کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

''گاڑی واپس موڑو...... کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں'' اس کی ماں نے کہا۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔''

اور اسی بے خیالی میں وہ اس کی گاڑی کے پاس سے گزرا مگر کوئی توجہ نہ دی۔ ان لوگوں کو وہاں چھوڑ کر جب واپسی کے لیے مڑا تو شام کے سائے آہستہ آہستہ گہرے ہو رہے تھے...... راستے میں ضحیٰ نے اس کی گاڑی دیکھی...... اس نے اپنی گاڑی ریورس کی...... اور باہر نکل کر اسے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا اور پھر انہی کچے پکے راستوں پر چلنا شروع کر دیا جہاں پر دور دور تک کوئی نہ تھا...... نجانے کیوں دل میں ایک موہوم سی امید پیدا ہوگئی تھی کہ وہ یہیں کہیں ہو گی...... اسی سوچ کے ساتھ دل میں مسرت کا احساس سا پیدا ہوا...... کافی دیر چلنے کے بعد وہ اسے ایک ٹیوب ویل کی منڈیر پر سر جھکائے بیٹھی ملی۔ ایسے دیکھ کر وہ ٹھٹھکی اور پھر کھڑی ہو گئی۔

''ت...... تم...... حسن'' وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

حسن بھی ضبط جذبات سے مسکرا پڑا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے مگر اگلے ہی لمحے اس کے اٹھتے قدم رک گئے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ برف کا مجسمہ ہو جس کو اگر وہ ہاتھ لگائے گا تو اس کے ہاتھ کی حدت سے وہ پگھل جائے گی۔''

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' حسن نے حیرت سے پوچھا۔

''گاڑی خراب ہوگئی تھی اس لیے مجھے یہاں رکنا پڑا''

''لیکن یہاں تو کوئی آبادی نظر نہیں آ رہی......'' اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔

''چلو...... گھر چلتے ہیں...... میں بہت تھک گئی ہوں......'' اس نے اس کی بات کی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

سارا راستہ وہ خاموشی کے ساتھ چلتی رہی۔ جب وہ گاڑی ڈرائیو کرنے لگا تب اس نے اس کے ہاتھ پر گہری جلی ہوئی خراش دیکھی۔

''کیا ہوا؟......'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کس کو......؟''

''تمہارے ہاتھ کو......''

''اوہ...... کچھ نہیں...... بس یونہی......'' حسن نے ہاتھ کی طرف دیکھا۔

''تم اپنے آپ سے اتنے بے خبر کب سے رہنے لگے ہو کہ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔'' وہ قدرے خفگی سے بولی۔

حسن نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور زیر لب مسکرا دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہی بات تو میں تم سے پوچھ پوچھ کر تھک چکا ہوں۔

''پیچھے ہٹو میں ڈرائیو کرتی ہوں......'' اس نے اس محبت سے کہا کہ حسن کو اس لمحے وہ اپنی ماں سے قدرے مختلف نہ لگی۔

''میں ٹھیک ہوں......'' وہ آہستگی سے بولا۔

''نہیں میں نے کہا نا......'' وہ ڈانٹ کر بولی۔

''اور حسن کو چار و ناچار پیچھے ہٹنا پڑا۔ اسے ایک دم وہ اتنی بدلی بدلی سی لگی کہ وہ حیران رہ گیا...... اس ضحیٰ میں اور پہلی والی ضحیٰ میں...... اتنا تضاد......، اس کے چہرے کی بشاشت کسی بھی لمحہ یہ نہ بتا رہی تھی کہ وہ کبھی پریشان اور مضطرب بھی رہی تھی۔

''ضحیٰ اس کا مطلب ہے تم بھی مجھ سے......'' حسن نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ اس کی کسی بات کا جواب دیتی اس نے گاڑی تیز کر دی۔

سارا راستہ دونوں خاموش رہے وہ مسلسل ان کے بارے میں سوچتی رہی۔ جن سے مل کر آ رہی تھی اور حسن اپنے طور پر اس کی نفسیات جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مسئلہ ہے کہاں۔

مسز توفیق اتنے گندے حلیے میں اس کو دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں:۔

''کہاں تھی تم میری بچی؟...... تم کتنا دکھ دیتی ہو؟'' انہوں نے اس کو اپنے

ساتھ لپٹا کر کہا۔

''آئی ایم سوری مما...... اصل میں گاڑی خراب ہوگئی تھی اور مجھے کہیں رکنا پڑا۔''

''لیکن کہاں...... کوئی اطلاع تو دی ہوتی''

''بس قریب ہی گاؤں تھا۔ وہ لوگ آنے نہیں دے رہے تھے۔ بس مصروف رہی کہ اطلاع نہ دے سکی۔'' اس نے چور نگاہوں سے حسن کی طرف دیکھا۔

''مما میں ابھی فریش ہو کر آتی ہوں۔''

مسز توفیق کبھی حیرانگی سے حسن کی جانب اور کبھی اس کے نقش پا کی جانب دیکھتی رہیں۔

''آنٹی میں اب گھر چلتا ہوں...... بہت تھکاوٹ ہوگئی ہے'' وہ نقاہت سے بولا۔

''تھک تو تم واقعی بہت گئے ہو لیکن چائے پی کر جانا، اور انہوں نے بشیراں کو چائے لانے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد ضحیٰ آئی تو سب حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔

پنک کاٹن کے ڈھیلے ڈھالے سوٹ کے ساتھ بڑا سا دوپٹہ بڑے قرینے سے لیے وہ بڑی شائستگی سے اندر داخل ہوئی تو مسز توفیق مارے حیرت کے کچھ بول ہی نہ سکیں۔

''مما...... چائے کہاں ہے؟'' اس نے قدرے طمانیت سے پوچھا۔

''او...... آں...... ہاں......'' وہ چونک کر بولی۔

''اس نے چائے سب کو بنا کر دی۔ حسن کبھی مسز توفیق کی جانب دیکھتا اور کبھی اس کی جانب...... اور آہستہ آہستہ چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ مسز توفیق تو اس اچانک تبدیلی پر حیران ہونے کی بجائے پریشان ہو رہی تھیں کہ یہ کسی اور بڑے خطرے کا پیش خیمہ تو نہیں......''

''اچھا اب میں چلتا ہوں......'' اور حسن خاموشی سے اٹھ کر چلا آیا۔

(24)

پچھلی تمام باتیں...... ملاقات...... وہ لہجہ...... ایک فلم کی مانند اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا...... آنکھیں ظاہراً بند تھیں مگر تخیل اس قدر متحرک تھا کہ کہیں پر سٹاپ نظر نہ آ رہا تھا۔ سوچ کا دائرہ تین لفظوں تک محدود ہو گیا تھا......

"حق...... تیاگ...... تپسیا......" وہ سوچ سوچ کر تھک گئی۔

"مگر کیسے......؟"

اس کا دل پھر وہیں جانے کو چاہنے لگا...... لیکن ضروری نہیں کہ اس کی ملاقات پھر انہی سے ہو۔ اس نے فریدی صاحب کو فون کیا۔

"ہیلو فریدی صاحب......" وہ آہستہ سے بولی۔

"جی فرمائیے...... ضحیٰ بی بی...... کیسی ہیں آپ؟" ان کی آواز میں شناسائی تھی مگر پچھلی ملاقات کا شائبہ نہ تھا۔

"فریدی صاحب...... وہ بزرگ...... میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"خود ہی سب معلوم ہو جائے گا...... بس اسے بنیاد سمجھ کر قدم بڑھائیے...... لیکن سب سے پہلے خود ساختہ خول سے نکلنا پڑے گا...... ہمت کریں...... منزل آہستہ آہستہ آسان ہوتی جائے گی...... سوچنا چھوڑیں...... اب عمل کی باری ہے...... اچھا خدا حافظ...... میں اس وقت بہت مصروف ہوں" انہوں نے فون رکھ دیا۔

وہ ان سب باتوں پر غور کرتی رہی...... اور پھر نجانے کس وقت سو گئی۔ صبح جب بیدار ہوئی تو دل و دماغ میں ایک تحریک برپا تھی۔ کچھ کر گزرنے کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا۔ ایک غیر مرئی قوت اس کو مسلسل کچھ کرنے پر اکسا رہی تھی۔ کچھ ایسا...... جس کا مفہوم ہو...... جو اپنے آپ میں معنی رکھتا ہو...... لیکن کیا......؟ لیکن کیا؟ اس کو کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

وہ اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آئی اور چائے کے ساتھ ساتھ اخبار کو بھی ٹٹولنے لگی......

ایک دم نظر ایک خبر پر ایسی رکی کہ ہٹنے کا نام نہ لے رہی تھی...... بہت بڑا ٹرین حادثہ ہوا تھا...... کئی لوگ ہلاک اور کئی زخمی ہوئے تھے۔ وہ ہاسپٹل کا نام پڑھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہی ہو......؟" مسز توفیق نے حیرت سے پوچھا۔

"مما فکر نہ کریں...... کہیں نہیں جا رہی...... ابھی آ جاتی ہوں......" اس کے چہرے پر ایسی طمانیت اور سچ تھا کہ ان کو مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ ہسپتال پہنچی تو ہر طرف افراتفری اور خوف و ہراس پھیلا تھا۔ کیا خونیں منظر تھا۔ ہر طرف آہ و بکا...... زخمیوں کی نازک حالتیں اور لواحقین کی بے تابیاں...... پریشانیاں...... کوئی باپ کے لیے رو رہا تھا تو کوئی بھائی کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کوئی شوہر سے جدا ہوا تھا تو کوئی بچہ ماں کے لیے رو رہا تھا۔ عجیب سی بے بسی کا عالم تھا۔ کوئی نہ تو دوسرے کو تسلی دے سکتا تھا نہ دلاسا...... بس خاموش لبوں...... اور برستی آنکھوں سے سب ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ جیسے سب تصویریں ہوں ایک جیسی، یا آئینے ہوں جن میں سب ایک دوسرے کا ایک جیسا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ زندگی کا یہ روح فرسا منظر اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس لیے کانپ کر رہ گئی۔ وہ خاموشی سے ہر ایک بیڈ کے پاس سے گزری اور ان کی مشکلات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی...... ان میں سے چند ایک ایسے غریب و بے آسرا لوگ تھے جن کے پاس نہ خوراک کے لیے پیسے تھے نہ علاج کے لیے...... ہر ایک عجیب و غریب مشکل سے دوچار تھا...... وہ ایک بیڈ کے پاس سے گزری...... چار پانچ سال کا بچہ بے سدھ پڑا تھا...... اس کو کوئی ہوش نہ تھی...... اور کوئی اس کے بیڈ کے پاس بھی نہ تھا۔

"یہ بچہ کون ہے......؟" اس نے ایک نرس سے پوچھا۔

"ظاہر ہے زخمی ہے......" وہ تلخی سے بولی۔

"لیکن اس کے ماں باپ......؟"

"خدا معلوم کہاں گئے...... حادثے میں مر گئے یا کہیں کھو گئے...... کوئی بھی اس کے پاس نہیں آیا۔" نرس نے جواب دیا۔

"اور یہ اکیلا ہی پڑا ہے......" ضحیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......"

وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور مسلسل اس کی طرف دیکھتی رہی...... اس کے چہرے

پر بلا کی معصومیت تھی مگر کرب اور تکلیف کے سائے بھی لہرا رہے تھے...... اگر اس کے ماں باپ کھو گئے ہوئے تو یہ کہاں جائے گا...... یہ تو اتنا چھوٹا ہے کہ کچھ بتا بھی نہ سکے گا...... وہ اس کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔

"آپ اس بچے کی کیا لگتی ہیں...... جلدی سے یہ دوائیں لے آئیں" ایک نرس آئی اور جلدی سے ایک نسخہ اسے پکڑا کر چلی گئی۔

وہ اٹھی اور دوائیں لینے چلی گئی۔

"میں ابھی آتی ہوں......" اس نے نرس کو کہا۔

اور گھر فون کر کے اطلاع دی کہ اس کی دوست ہسپتال میں بیمار ہے اس لیے دیر سے آئے گی۔ وہ اس کے پاس بیٹھی کبھی اس کے ہاتھوں کو پیار سے سہلاتی کبھی اس کے منہ پر ہاتھ پھیرتی...... نرس سے بار بار اس کے رشتے داروں کے بارے میں پوچھتی مگر کوئی جواب نہ ملتا۔

شام کو دیر سے گھر لوٹی تو عجیب سناٹا سا تھا...... وہ ماں کے کمرے میں پہنچی تو وہ بیٹھی رو رہی تھی۔

"کیا ہوا مما؟......"

"کچھ نہیں......"

"بتائیں تو سہی"

"تمہارے پاپا آئے ہیں......؟"

"کہاں......؟"

"اب باہر گئے ہیں...... تمہارا پوچھ رہے تھے، میں نے بتایا کہ باہر گئی ہے" انہوں نے پھر جھگڑا کیا...... تمہارے تمام حالات کا ذمہ دار صرف مجھے ہی ٹھہراتے ہیں۔"

مما پھر رونے لگی۔

"آپ فکر نہ کریں...... میں خود پاپا سے بات کروں گی......" وہ آہستگی سے بولی۔

رات کو دیر سے توفیق صاحب لوٹے...... وہ ان کی ہی منتظر تھی اس لئے بڑی گرمجوشی سے ملی......

"پاپا آپ کب آئے......؟ ہم کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے تھے......" وہ ماں

کی طرف دیکھ کر بولی......

انہوں نے حیرت سے اس کی طرف اور پھر بیگم کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سب کھانا کھانے لگے۔

"ضحیٰ بیٹے میں انگلینڈ میں وہاں کے مشہور سائیکاٹرسٹ سے مل کر آیا ہوں اور اب تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" اس کے پاپا نے کہا۔

"لیکن کس لیے...... میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے حیرت سے جواب دیا۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں......" وہ ان کو پہلے سے بھی زیادہ خوش نظر آئی۔

"آخر تم کن چکروں میں ہو......؟" وہ زچ ہو کر بولے۔

"کسی میں بھی نہیں...... بس اپنے لیے ایک مصروفیت ڈھونڈی ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"حسن آیا تھا...... تمہارا پوچھ رہا تھا۔" اب کی بار مسز توفیق بولیں۔

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔

وہ روزانہ صبح اس بچے کے پاس جاتی اور کافی دیر اس کے پاس بیٹھ کر آتی۔ اتنے دنوں میں کوئی اس کے پاس آیا گیا نہ تھا۔ وہ روزانہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر جاتی۔ سب مریض آہستہ آہستہ فارغ ہو رہے تھے...... صرف وہی پیچھے تھے جو بہت سیریس تھے...... اور بہت دنوں کے بعد اس بچے کو ہوش آیا تھا۔

وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

"کیسے ہو بھئی...... بول کیوں نہیں رہے؟" اس نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ آپ کا نام کیا ہے......؟"

جواباً وہ پھر خاموش رہا......

"بتاؤ نا آپ کا نام کیا ہے......؟"

"حسن......"

"کیا......؟" وہ حیرت سے چونک کر بولی۔

"حسن......" وہ پھر بولا۔

"وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھتی رہی...... پھر قدرے نارمل ہوئی۔

''اچھا حسن...... یہ بتاؤ کہ آپ کدھر رہتے ہو؟''

''ممی کو پتا ہے......''

''ممی کدھر ہے...... اور پاپا''

''گاڑی میں......''

''اوہ آئی سی......''

''بی بی...... اب آپ اس بچے کو گھر لے جائیں...... یہ کافی بہتر ہے۔'' ایک نرس نے آ کر اسے کہا۔

''گھر......؟'' وہ حیرت سے بولی اور ایک دم حسن کی جانب دیکھا...... وہ بھی معصومیت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میری مما کہاں ہیں اور پاپا؟......'' حسن نے افسردگی سے پوچھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہی...... سوچتی رہی کہ کیا کرے...... اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا...... ایسی عجیب سی سچویشن تھی...... کہاں اس کو چھوڑے...... کہاں لے کر جائے۔

''حسن اٹھو گھر چلیں......'' وہ ایک دم فیصلہ کرتے ہوئے بولی۔

''گھر......'' وہ خوشی اور سکون سے بولا۔

اور اسے گھر لے آئی۔ اس کے ماں باپ دونوں حیران تھے۔ انہیں اس سے اس حماقت کی امید نہ تھی۔ لیکن مسز توفیق بہت دنوں سے اندر ہی اندر ڈر رہی تھیں کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر دکھائے گی اور اب یہی ہوا تھا۔

''ضحیٰ...... کس بچے کو گھر اٹھا لائی ہو۔ نجانے کون ہے...... تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا'' مسز توفیق غصے سے بولیں۔

''مما...... وہ مہمان ہے...... جب اس کے گھر والے مل جائیں گے تو یہ چلا جائے گا...... بچہ ہی تو ہے اور آپ ناراض کیوں ہو رہی ہیں'' وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

اور اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ عجیب سی سرشاری محسوس کر رہی تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی...... روح ہلکی پھلکی ہو گئی تھی...... اور ایسی مسرت جس کا اندازہ اسے ہوا تھا واقعی بے پایاں تھا۔

......❁......

(25)

بہت دنوں بعد وہ دوبارہ اس محفل میں پہنچی جس کا پتا فریدی صاحب نے اس کو دیا تھا۔ فریدی صاحب اس کے جانے سے پہلے ہی وہاں موجود تھے...... اور ایک اور بزرگ بھی ان کے ہمراہ تھے...... اس نے ایک ٹک ان کی طرف دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔

''در......انی صاحب...... آپ'' وہ حیرت سے بولی۔

''ہاں......'' وہ مسکرا کر بولے۔

''ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے......'' سفید باریش بزرگ بولے۔

''ہاں میاں جی...... تمہارا کئی بار پوچھ چکے ہیں۔'' اب کی بار فریدی صاحب بولے۔

''ہاں بس تھوڑی دیر ہو گئی...... معذرت چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... لیکن ہر بات کے لیے وقت بہت اہمیت رکھتا ہے...... وقت کی تو ساری بات ہوتی ہے...... وقت نہ رہے تو پھر کیا باقی رہتا ہے...... نہ وجود...... نہ اصل...... جیسے پنچھی ہاتھ سے اڑ جائے...... تو پھر کب ہاتھ آتا ہے۔'' میاں جی بولے۔

''ہاں تو کیسا رہا سفر......؟'' میاں جی نے پوچھا۔

''سفر......؟''

''ہاں دن...... کیسے گزرے......؟'' فریدی صاحب نے وضاحت کی۔

''بہت عجیب...... بہت مختلف سے...... ایسی سرشاری...... جو آج سے پہلے کبھی میں نے محسوس نہ کی تھی...... ایک ایسا احساس کہ جس کو میں بیان نہیں کر سکتی۔'' اس نے ساری بات بتائی۔

''اس کا مطلب ہے تم نے حقیقی خوشی پالی......'' میاں جی بولے۔

"اس کے لیے ایک Quotation ہے" درانی صاحب بولے۔

"Joy is a rare divine gift, sweet & tender like flowers, showered from the Heavens to appreciate one's deeds"

Yes! It's realy true میاں جی بولے۔

میاں جی کا انگریزی لب ولہجہ سن کر وہ حیران رہ گئی۔

آپ حیران نہ ہوں...... میاں جی نے سوشل سائنس میں ماسٹرز اور فلسفے میں ڈاکٹریٹ کیا ہے۔" فریدی صاحب بولے۔

"اور فریدی صاحب...... انہوں نے ایم ایس سی فزکس کیا ہے۔" درانی صاحب نے بتایا۔

اتنے پڑھے لکھے لوگ...... وہ حیران ہو رہی تھی۔

"آپ حیران نہ ہوں...... یہ کوئی خوبی نہیں...... صرف ادراک وشعور حاصل کرنے کی راہیں ہیں...... آپ بات بتائیں......" فریدی صاحب نے کہا۔

"بس میں بہت خوش رہی ان دنوں......" وہ ایک دم پھر خوش ہوئی۔

"ہاں تمہاری روح خوش تھی......" میاں جی بولے اور اس کے سوالوں کا جواب دینے لگے۔

"روح......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......روح" میاں جی بولے۔

"وہ کیا ہے...... کیا واقعی یہ سچائی ہے......؟"

"ہاں بہت بڑی سچائی...... بہت بڑی حقیقت...... یوں سمجھو جسم کثیف کے اندر ایک اور جسم لطیف جو بہت شفاف، صاف اور زندہ ہوتا ہے...... یہ انسان کے رگ وپے میں اس طرح سرایت کیے رہتا ہے جیسے کہ سبز شاخ میں پانی۔"

"لیکن نظر کیوں نہیں آتی......؟" اس نے سوال کیا۔

"قانون قدرت ہے کہ اس نے ظاہر کے اندر باطن بھی پیدا کیا ہے اور باطن کو مختلف نام دیئے ہیں۔ مثلاً دل کے اندر احساسات، جذبات...... ہیجان...... الہام...... وہم...... اور دماغ کے اندر سوچ...... تصورات...... تخیل...... زبان کے اندر ذائقہ، آنکھوں

کے اندر نور و بصارت کانوں کے اندر سماعت...... یہ سب قوتیں ہیں...... جن کے بغیر سب اعضاء بے کار ہیں۔ اسی طرح بدن کے اندر روح...... سب ظاہر کو تو نام دے سکتے ہیں مگر باطن کو صرف محسوس کر سکتے ہیں...... اس کو ٹھوس شکل میں پیش نہیں کر سکتے۔ مگر یہ سب اصل ہیں۔ یہی حقیقتیں ہیں...... ان کے بغیر کوئی بھی عضو کسی کام کا نہیں...... اسی طرح روح کے بغیر نہ جسم کی کوئی حقیقت ہے نہ اہمیت...... یہ تو ایک سانچہ ہے۔ خالی کھنکتا ہوا...... روح نکل جاتی ہے تو بے کار اور مردہ ہو جاتا ہے۔"

"مگر ہر باطن کی قوت کا مظاہرہ کسی مخصوص جگہ یا اعضاء سے ہوتا ہے...... روح کا تعلق کس سے ہے؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"روح کا تعلق تو جسم سے ہے مگر اس کی جائے قرار کے بارے میں خاص علم نہیں دیا گیا...... مختلف لوگوں کے خیالات ہیں کوئی کہتا ہے کہ اس کا ٹھکانہ دل ہے، کوئی پیٹ اور کوئی دل کے آس پاس بتاتا ہے...... مگر واضح طور پر کچھ نہیں بتایا گیا۔" میاں جی نے جواب دیا۔

"تو کیا ہر جاندار میں روح ہے......؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"ہاں...... لیکن انہیں اتنا ہی ادراک حاصل ہوتا ہے جتنا کہ انہیں اپنی زندگی گزارنے کے لیے کافی ہو۔ البتہ انسان کی روح کا دائرہ بہت وسیع ہے۔"

"لیکن روح کیسے خوش ہوتی ہے اور کبھی کبھار ہی کیوں؟" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"روح کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس کے تقاضے بھی جسم سے مختلف ہوتے ہیں۔ جسم ٹھوس ہے اس لیے مادیت کی طرف کشش پاتا ہے اور روح حقائق کی طرف متوجہ ہوتی ہے یا یوں کہہ لو جیسے جیسے انسان جسم کی آرائش میں زیادہ مشغول رہتا ہے اس کی روح دبتی جاتی ہے کیونکہ باہر کی آلائش، بناوٹ، منافقت انسان کی روح کو دبا دیتی ہے اور جیسے ہی انسان سچائی سے خلوص سے کوئی نیک کام کرتا ہے تو روح سرشار ہو جاتی ہے اور وہ جسم میں یوں پھڑپھڑاتی ہے جیسے ہوا میں پتے...... اور درخت کی خوشی کا راز پتوں کے پھڑپھڑانے میں ہی ہے۔ اسی طرح جب روح خوش ہوتی ہے تو جسم اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے...... جتنا زیادہ انسان اپنے جسم کی نفی کرتا ہے روح اتنی ہی زیادہ طاقتور

ہوتی جاتی ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ انسان کا اندر بہت طاقتور اور مضبوط ہو گیا ہے کہ اس پر باہر کے تغیر و تبدل آسانی سے اثر نہیں کر سکتے۔ کبھی تاریخ دیکھو تو پتا چلتا ہے کہ بہت سی نیک ہستیاں ایسی گزری ہیں جو ظاہراً کچھ بھی نہ تھیں مگر ان کی روحیں اتنی قوی تھیں کہ انہوں نے انسانی دنیا میں طرح طرح کے انقلاب برپا کر دیئے۔'' میاں جی نے اسے تفصیل سے سمجھایا۔

''اس کا مطلب ہے روح صرف نیکی میں ہی نمو پاتی ہے۔''

''یوں سمجھو کہ روح انسان کے اندر سچائی کا ایک میزان ہے جو ہر حالت میں باطن سے صرف سچائی کو ہی قبول کرتا ہے۔ اور سچائی ہمیشہ حق کی طرف لے جاتی ہے اور ''حق'' تو خود سچائی، خوبصورتی اور نیکی کا دوسرا نام ہے۔''

''میاں جی آپ ''حق'' کے لیے دوسرا لفظ کیا استعمال کریں گے؟'' اس نے وضاحت چاہی۔

''بہت سے...... اللہ، رحمٰن، رحیم اور بے شمار...... خوبصورت اسماء الحسنٰی''

''میں اکثر لفظ اللہ پر بہت سوچتی ہوں یہ کیا ہے؟''

''الف کا مطلب ایک ل، لافانی، ل، لاشریک، ہ، ہمیشہ رہنے والا۔ کائنات کی ساری خوبیاں اور اسرار، اسی لفظ میں تو مضمر ہیں۔''

''صاحب اب کھانا لایئے......'' میاں جی نے فریدی صاحب سے کہا۔

''اور وہ تھوڑی دیر بعد روٹی اور لسی لے آئے...... سب نے مل کر تھوڑا تھوڑا کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھی...... ان لوگوں کی غذا کس قدر سادہ ہے وہ کھانا کھاتے ہوئے سوچتی رہی کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھی۔

''اب میں چلتی ہوں'' میاں جی نے شفقت سے اسے پیار دیا۔

اب کی بار وہ پہلے سے زیادہ خوش، سرشار اور مطمئن لوٹی تھی۔

(26)

بہت دنوں بعد حسن آیا تھا، اب اس سے شناسائی اتنی رہ گئی تھی کہ وہ اس سے ملنے ضرور آتا...... حال احوال پوچھتا اور چلا جاتا۔ کبھی کبھار تو اس کی ملاقات ہی نہ ہو پاتی...... یہ ایسا نہ ہو سکتا تھا کہ وہ نہ آئے...... وہ تو اپنے عشق کی زیارت کرنے ضرور آتا تھا اور عقیدت کے پھول خاموشی سے اس کے قدموں میں نچھاور کر کے چلا جاتا...... اب بھی وہ اس کا منتظر تھا اس کو بہت دنوں بعد دیکھ رہا تھا۔

''حسن کیسے ہو......؟'' وہ خوشدلی سے مسکرا کر بولی۔

''شکر ہے تمہیں خیال تو آیا...... بہت خوش لگ رہی ہو'' حسن نے اس کے اندر ایک تبدیلی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا...... حسن...... تم میرے ایک چھوٹے سے دوست سے ملے ہو۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں...... اس وقت وہ سو رہا ہے۔'' وہ مسرور ہو کر اسے بتانے لگی۔

''کون......؟''

اور وہ اسے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''حسن...... حسن سے ملو'' وہ مسکرا کر بولی۔

''کیا......؟'' حسن نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے بابا اس کا نام بھی حسن ہے'' وہ مسکرا کر بولی۔

''اوہ آئی سی......'' وہ کھکھلا کر ہنسا۔

''یہ کہاں سے اٹھا لائی......'' حسن نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔

اور اس نے اس کو ساری کہانی بتائی......

''حسن تم اس کے گھر والوں کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرو گے نا۔''

''اگر یہ یہاں ہی رہ جائے تو کیا مضائقہ ہے؟......'' حسن نے رائے دی۔

''مما نہیں مانتیں......'' وہ مایوسی سے بولی۔

''اچھا...... ہم اخبار میں اس کی تصویر دے دیں گے...... اگر ملنا ہوا کسی کو تو مل جائے گا'' وہ بے دلی سے بولا۔

''حسن کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اسے یہاں لا کر غلطی کی ہے۔''

''نہیں تو...... بلکہ شکر ہے کہ کسی کو تو تم نے اس قابل سمجھا کہ اپنے قریب رکھا'' وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''بس تمہیں تو موقع چاہئے بولنے کا۔''

''یہ تو بتاؤ کہ اچھا بولتا ہوں کہ بُرا'' وہ کنکھیوں سے اسے دیکھ کر بولا۔

''مجھے نہیں پتا''

''ویسے تم میں حیرت انگیز حد تک تبدیلی آئی ہے...... کبھی تو بالکل دیوانی ہولق...... کبھی بہت سوشل...... آخر چکر کیا ہے؟'' حسن نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''تم نہیں سمجھو گے......'' وہ مسکرائی۔

''آج تم خوش کس بات پر ہو یا......؟''

''کیا مطلب......؟''

''کہ اس رنگ کا کمال ہے جو تم نے پہنا ہے......''

''رنگ کا کیا کمال ہوتا ہے......؟'' اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''جناب رنگوں کا بہت کمال ہوتا ہے...... انسان کی نفسیات پر...... مگر آپ نے کہاں...... خیر......'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''واقعی رنگوں کا کمال ہوتا ہے'' وہ سیریس ہو کر بولی۔

''ہاں...... تو اور کیا...... اگر نہیں پتا تو سنو:

پیلا رنگ انسان کے موڈ کو خوشگوار کرتا ہے اس میں گرمجوشی پیدا کرتا ہے دل و دماغ کو تیز کرتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار اس سے بندہ Aggressive بھی ہو جاتا ہے۔

اورنج جذبات کو ابھارتا ہے اور دھڑکنوں کو تیز کرتا ہے لیکن بہت زیادہ پہننے سے تھکاوٹ کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔

کاسنی موڈ کو خوشگوار اور ٹھنڈا کرتا ہے۔

سبز سکون کا احساس پیدا کرتا ہے۔ آنکھوں کے بوجھل پن کو ختم کرتا ہے اور نظر کو تیز کرتا ہے۔ بلڈ پریشر کو نارمل کرتا ہے اس لیے جب بھی تھک جاؤ اور بلڈ پریشر تیز ہونے لگے تو درختوں کو گھورا کرو۔

کالا رنگ جذبات انگیخت کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ ڈپریشن کی علامت ہے اور اس سے سخت گھٹن کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

براؤن، گرمجوشی، استحکام اور ذہنی ہم آہنگی کی علامت ہے۔

ڈارک بلیو، ذہن کو سکون دیتا ہے لیکن اداسی بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کا اثر بہت ٹھنڈا ہے۔

لائٹ بلیو، یہ بھی ٹھنڈا احساس پیدا کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ Remoteness کی Feelings بھی پیدا کرتا ہے۔

پنک اور دوسرے لائٹ کلرز سب سکون کی علامت ہیں۔

سفید پاکیزگی، تقدس، سکون اور ٹھنڈک کی علامت ہے۔''

''اس کا مطلب ہے مجھے سفید کلر پہننا چاہئے۔''

''کیوں......؟''

''اس میں سب سے زیادہ خوبیاں ہیں......''

''کیا صرف خوبیوں پر جاؤ گی افادیت پر نہیں......'' وہ مسکرا کر بولا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکی۔

''یونہی...... تمہاری مرضی ہے...... جو بھی پہنو...... انسان کو اتنا تو آزاد ہونا چاہئے کہ اپنی مرضی سے کھائے پیے اور پہنے۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''حسن ویسے اس سے پہلے مجھے تمہارا ہر چیز کے بارے میں اتنے گہرے مشاہدے کا علم نہ تھا۔'' وہ قدرے متاثر کن لہجے میں بولی۔

''شکر ہے آج اعتراف تو کیا...... کچھ ہی سہی لیکن کیا تو...... کیا زمانے تھے، یونیورسٹی میں ہر کوئی ہمارا معترف تھا......'' حسن فخریہ انداز میں بولا۔

''یونیورسٹی...... کہاں ہیں سب لوگ'' وہ ایک دم چونک کر بولی۔

"سب لوگ مصروف ہیں...... فیض پڑھنے کے لیے انگلینڈ چلا گیا ہے۔ لڑکیاں گھروں کو ہوئیں، عزیز نفسیات کا پروفیسر بن بیٹھا ہے اور ہم دیوانگی کے ہاتھوں مجبور ہیں۔" حسن نے ایک ہی سانس میں سب کے بارے میں تفصیلات بتا دیں۔

"بکو نہیں...... کبھی یونیورسٹی گئے ہو؟"

"ہاں کئی دفعہ...... پروفیسر درانی سے بڑی اچھی ہیلو ہائے ہے کبھی ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ بہت نفیس آدمی ہیں۔ تم تو ایسے ہی ان سے خار کھاتی رہی ہو۔"

جواباً وہ خاموش رہی۔

"تم چائے پیو گے......"

"یہی تمہارا مسئلہ ہے...... ہر بات کا خیال بہت دیر سے آتا ہے۔ اب میرا جانے کا وقت ہے اور تم چائے کا پوچھ رہی ہو۔" وہ اپنی رسٹ واچ دیکھ کر بولا۔

"تم رکو...... میں ابھی لاتی ہوں۔"

"رہنے دو پھر سہی مجھے کہیں ضروری جانا ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"کہاں......؟"

"پروفیسر درانی کے گھر...... ان سے کچھ ضروری باتیں ڈسکس کرنی ہیں۔"

"اوہ......" وہ زیر لب بڑبڑائی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پروفیسر درانی کا حسن کے ساتھ کیسا تعلق ہے؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

......✿......

(27)

ہر مہینے کے آخر میں مقررہ وقت پر وہ ان کے پاس پہنچ جاتی اور مختلف موضوعات اور مسائل زیر بحث آتے۔ سب ان پر اپنی اپنی رائے دیتے جو بہتر ہوتا اس کو سب اپنا لیتے۔

"میاں جی...... بہت دونوں سے میرے ذہن میں مذہب کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ میں نے کچھ کے بارے میں مطالعہ بھی کیا ہے لیکن بہت الجھ کر رہ گئی ہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر یہ ہے کیا اور کیا واقعی مذہب بہت ضروری ہے۔ کیا انسان اچھے طریقے سے زندگی گزارتا جائے یہی کافی نہیں۔ مذہب کا عمل دخل کہاں تک ہے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں...... مذہب زندگی میں بہت ضروری ہے...... یہ ایک نظریہ ہے ہر ارتقاء کی بنیاد ہے اگر نظریہ نہ رہے تو خیالات منتشر اور زاویے ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ سمتیں مختلف ہو جاتی ہیں اور انسان بھٹکنے لگتا ہے۔ سمجھو تو یہ اکائی ہے۔ جز ہے اصل ہے، بنیاد ہے...... میں نے بتایا تھا کہ روح سچائی چاہتی ہے...... اور مذہب سچائی کا منبع ہوتا ہے۔ یہ بھی انسان کی سرشت میں شامل ہے کہ جب تفکر کرتا ہے تو اصل کی طرف نظر دوڑاتا ہے جہاں سے ہر بات کا ہر جذبے کا آغاز ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ تفکر کرتا ہے اس پر اسرار کھلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ حقیقت کو پالیتا ہے اور حقیقت وہی ہوتی ہے جس میں اس کے سکوں کا راز مضمر ہوتا ہے۔ اب یہ کہ مذہب کیوں ضروری ہے؟ ہاں...... اس ضمن میں بہت سی تحریکیں چلی بھی اور ناکام بھی ہوئیں۔ سب سے زیادہ سوشلسٹ اس سلسلے میں اہم ہیں۔ پھر کمیونسٹ...... اصل میں مذہب نام ہے "ان نظریات کا جو وہ اپنے ماننے والوں کو فراہم کرتا ہے اور جن کا ماننا ان پر لازم ہوتا ہے اور یہ نظریات سوسائٹی کا اعلیٰ ترین انسان

وضع کرتا ہے جس کی سچائی پر کسی کو شک تو کیا کوئی اعتراض نہ ہو۔ جب ایک سچا انسان سچائی کا درس دیتا ہے تو دل و دماغ، اس پر فوراً لبیک کہتے ہیں اور سختی سے اس پر کاربند ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب مختلف تحریکیں کیوں ناکام ہوئیں کیونکہ ان میں کہیں نہ کہیں Flaw تھا۔ یا وہ عین فطرت کے مطابق نہ تھیں یا یوں کہہ لیں کہ بہت سے انسان ان پر عمل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ انسانوں کے نظریات سے ٹکراتی تھیں۔ مذہب چونکہ انسانی زندگی میں سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہے اس لیے اس میں اتنی آفاقیت ہونی چاہیئے کہ نہ صرف یہ پیروکاروں کو عمل کروا سکے بلکہ ان کو سکون بھی پہنچائے اور زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں ان کو شعور اور آگاہی بھی دے۔ رہی یہ بات کہ اچھے طریقے سے زندگی گزارنا کافی نہیں تو اس میں یہ پہلو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے کہ حیوان بھی اپنے اپنے طور طریقوں کے مطابق زندگی گزار کر چلے جاتے ہیں اور جب تک انسان کے پاس کوئی واضح نظریہ نہ تھا تب تک وہ وحشی اور جانور ہی تھا۔ مذہب انسان کو مہذب بنانے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔“

”لیکن دنیا میں تو بے شمار مذاہب ہیں ایسے میں انسان کیا کرے......؟“

”اگر مذاہب کا عمیق مطالعہ کرو تو پتا چلے گا کہ ہر مذہب سچائی ہے کیونکہ ہر سچائی کی بنیاد ذات کا عرفان ہے حق کی جانب سفر ہے۔ وجدان، گیان اور عرفان ایک ہی ذات سے وابستہ ہیں۔ صرف راستے مختلف ہو گئے۔ تم دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر جگہ خدا کی وحدانیت اور اپنی عبدیت کے بارے میں ہی بتایا لیکن لوگوں نے بعد میں یہودیت کے نام سے مخصوص طبقہ بنا کر مذہب کی اصل شکل ہی مسخ کر دی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ”عبدالرحمٰن“ ہونے پر فخر کیا وہ کہیں بھی عبدیت کے دائرے سے باہر نہیں آئے لیکن لوگوں نے ان کی تعلیمات کو بھی بگاڑ کر رکھ دیا۔ شہزادے گوتم سدھارتھ نے عیش وعشرت کی زندگی صرف اور صرف نرواں حاصل کرنے کے لیے تج دی۔ حق کے عرفان اور کی شناسائی کے لیے، اگرچہ ان پر حقیقت اس طرح عیاں نہ ہوئی جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہوئی۔ ان کے بارے میں پڑھو تو پھر پتا چلتا ہے کہ انہوں نے کس طرح چھ سال صرف اور صرف ”ابدی مسرت“ حاصل کرنے کے لیے کانٹے۔ اب دیکھا جائے کہ ان کو کس چیز کی تلاش تھی۔ صرف یہ کہ روحانی تشنگی کے لیے انہوں نے سنیاس لیا۔ وہ طمانیت اور سکون جو انہوں نے ایک سنیاسی

کے چہرے پر دیکھا تھا اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔“

”تو کیا ان کو وہ سچ مل گیا......؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں مل گیا لیکن بہت واضح صورت میں نہیں...... کچھ کچھ مبہم بھی ہے مثلاً انہوں نے صرف یہی بتایا کہ ایک ازلی، غیر مخلوق، مستقل، لازوال، غیر متغیر (حقیقت) جس کو انہوں نے ”نروان“ کا نام دیا، کہا کہ موجود ہے اور اگر یہ حقیقت موجود نہ ہوتی تو اس بے ثبات مخلوق اور متغیر دنیا سے نجات ناممکن تھی۔ لیکن چونکہ حقیقت موجود ہے اس لیے نجات بھی ممکن ہے۔“

”یہ نروان کیا ہے......؟“ وہ متجسس ہو رہی تھی۔

”بدھ کی تعلیمات میں چار عظیم سچ بہت اہمیت کے حامل ہیں جن کا نچوڑ دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کے عارضی ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ صرف اور صرف اندر کی تمام کیفیات کو تفصیل سے بیان کر سکے اور اس حقیقت کو انہوں نے ”نروان“ کا نام دیا لیکن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی طرح کوئی مخصوص کتاب نہ دے سکے۔ انہوں نے جو خود محسوس کیا وہی بتا دیا کہ ایک ایسی کیفیت موجود ہے جو نہ تو خاک ہے نہ پانی، نہ آگ ہے نہ ہوا، لامکانیت ہے نہ تو یہ دنیا ہے اور نہ دوسری دنیا، نہ وہاں سورج ہے نہ چارا، وہاں نہ آنا ہے نہ جانا نہ ٹھہرنا نہ گزر جانا اور نہ وہاں پیدا ہونا ہے بغیر کسی حرکت یا بنیاد کے، بے شک یہی دکھوں کا خاتمہ یعنی ”نروان“ ہے۔ پیدائش، بڑھاپا، بیماری اور دکھ، عیبوں کا مجموعہ ہوتے ہیں اور ان چیزوں کا شکار جو بھی اشیاء ہیں ان کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اس کی تلاش شروع کر دی جو بے غم، غیر مخلوق بے عیب اور ہر پابندی سے آزاد اور محفوظ ہو اس طرح انہوں نے اس کو اور نروان کو پالیا۔ اصل میں ان کی تعلیمات مبہم خیالات کا تانا بانا بنتی ہیں کہ جب تک انسان کا اندر طاقتور اور متحرک نہ ہو وہ حقیقت نہیں پا سکتا۔“

”اسی طرح جین مت میں خدا کا تصور ہی نہیں اس میں صرف روح کو بشیر الوہی صفات کا حامل مانا گیا ہے۔ اور بابا گورونانک اگرچہ پیدا تو سکھ گھرانے میں ہوئے لیکن انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح پر زیادہ زور دیا۔ جس طرح مہاتما بدھ کو جنگلوں میں ”نروان“ ملا اسی طرح بابا گورونانک بھی تین دن ندی میں رہنے کے بعد جب باہر نکلے تو

پہلا کلمہ ان کی زبان سے یہی نکلا نہ کوئی ہندو نہ کوئی مسلمان اور زندگی کے آخری سفر میں انہوں نے ایک حاجی اور مسلم فقیر جیسا حلیہ اختیار کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنا پیغام شعروں کی صورت میں دیا ہے۔ جس میں انہوں نے انانیت (میں) کی جڑ کاٹی ہے اور تمام نفسانی امراض کی جڑ اس کو ہی گنوایا ہے اور اس سے چھٹکارا پانے پر بہت زور دیا ہے۔ ان کے شعر بہت خوبصورت ہیں۔'' میاں جی نے ذہن پر زور دیا، ہاں کہتے ہیں:

ہُوں وچ آیا، ہُوں وچ گیا
ہوں وچ جمیا، ہوں وچ مویا
ہوں وچ دتا، ہوں وچ لیا
ہوں وچ کھٹیا، ہوں وچ گیا
ہوں وچ ہسے ہوں وچ روئیے
ہوں وچ بھریئے، ہوں وچ دھووے
ہوں وچ جاتی جنسی کھووے
ہوں وچ مورکھ، ہوں وچ سیانا
ہوں ے بوجھے تاں در سو جھے
گیان وہوڑاں لکھ لکھ لو جھے
نانک حکمی لکھیے لیکھ
جیہا ویکھی تیہا ویکھ

''بہت خوبصورت کلام ہے'' فریدی صاحب بولے۔

''میاں جی مجھے آخری چاروں کا مطلب سمجھایئے۔'' وہ بولی۔

''اس کا مطلب ہے، اگر انسان اس ''میں'' کی حقیقت کو سمجھ لے تو اس کو خدا کا دروازہ مل جائے۔''

''بنا معرفت انسان فضول بحث مباحثے میں پڑا رہتا ہے۔ نانک حکمی لکھیے۔ لیکھ اس کا مطلب ہے کہ نانک خدا کے حکم کے مطابق تقدیر لکھ دی گئی ہے اور آخری شعر کا مطلب ہے کہ جیسا انسان خدا کو سمجھتا ہے ویسا ہی خدا اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ مذاہب میں اختلافات لوگوں کے نظریات کے مطابق ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں کہہ سکتی ہو...... لیکن آسمانی مذاہب میں بنیاد ایک ہے۔ تعلیمات میں زمانے کے مطابق اختلاف ہو سکتا ہے لیکن نظریات ایک ہیں۔ حقیقت میں جب سب کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر صاحب کرامت نے وہی راستہ بتایا جو حق کی طرف جاتا ہے۔ فرق تو تب آیا جب توضیحات ہوئیں۔ اختلاف تو تب ہوا جب سچائی میں آمیزش کی گئی۔ ہیئت بدل گئی اور اصل ختم ہوگئی۔ جب حالات ایسے ہوں تو عقل کو بروئے کار لا کر سوچنا چاہئے اور وسیع مطالعہ کرنا چاہئے، عقل دین فطرت کی طرف راغب کرے گی۔'' میاں جی نے اسے سمجھایا۔

''اس کا مطلب......؟'' اس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''مطلب یہ کہ جو (اسلام) ہمیں ملا ہے اس پر ازل سے ہی مہر ثبت ہے۔ ذلک دین القیم۔ یہ عین فطرت کے مطابق اور انسان کے مزاج اور نفسیات سے ہم آہنگ ہے۔ سچائی کا مرقع اور آمیزش سے پاک ہے۔ فلاح اس کو سمجھنے اور عمل پیرا ہونے میں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے مذہب بہت ضروری ہے......؟'' وہ قائل ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں نظریہ ارتقاء کے لیے ضروری ہے...... اکائی کے بغیر کل کیسے ممکن ہے؟ جیسے عنصر کے بغیر مادہ......'' میاں جی نے جواب دیا۔

''تو عبادت کا کیا مقام ہے......؟''

''وہ بھی بہت ضروری ہے ایک پودا لگا دو...... ہوا بھی اپنا کام کرے گی اور سورج بھی...... مگر پانی نہ دو تو نہ سرسبز ہو گا نہ پھل لائے گا۔ اصل تو اس میں ہو گا مگر ہر اصل فروغ چاہتا ہے...... مذہب ہو، عبادت نہ ہو تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ٹنڈ منڈ درخت...... خزاں رسیدہ...... درخت تو کہلائے گا مگر نہ شجر بن سکے گا نہ ثمر دے سکے گا۔''

''میاں جی آپ کی باتوں سے یوں لگتا ہے جیسے میرا ذہن پھیلتا جا رہا ہے۔''

''ہاں...... دماغ کی طاقت سوچنے میں ہے۔ جتنا یہ زیادہ سوچتا ہے اتنا ہی اس کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ نئی نئی راہیں نکلتی ہیں۔ اچھی سوچ ذہن کی خوراک ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

''اب میں چلتی ہوں، شام ہو رہی ہے......'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

میاں جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُسے دعا دے کر رخصت کیا۔

❋

(28)

حسن اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ ہر وقت اس کے پیچھے پیچھے رہتا۔ اس کو پیار سے آپی کہتا تو وہ کھل اٹھتی۔ مسز توفیق کو اس کا ضحیٰ سے یوں گھلنا ملنا بہت ناپسند تھا۔ اس لیے اس نے حسن کو کہہ کر اس کی تصویر اخبار میں دی تھی۔ اس کے نتیجے میں کچھ لوگ اس سے ملنے بھی آئے۔ ایک عورت اپنے آپ کو حسن کی پھوپھو ظاہر کر رہی تھی اور آدمی چچا۔ وہ حسن کو لے آئی مگر وہ جانے کے لیے رضا مند نہ تھا۔ وہ اپنی ماں کے رویے سے بھی آگاہ تھی اس لیے اس نے حسن کو بھیجنے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ جاتے ہوئے بلند آواز سے رو رہا تھا۔ اس کا اپنا دل بھی نہ چاہ رہا تھا وہ زیادہ تر اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ دونوں اکٹھے کھاتے پیتے، اسی کے پاس وہ سوتا تھا اور پھر اکٹھے کھیلتے، گھومنے جاتے۔ اس کے جانے کے بعد گھر پر عجیب سی اداسی چھا گئی تھی...... وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اسے یاد کرتی رہی۔ اس کے جانے کے بعد اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایک دو مہینے میں وہ کس حد تک اس سے مانوس ہو چکی تھی۔ ایک دو بار تو اس کی یاد میں رو بھی دی۔ مسز توفیق اس کے اس رویے سے سخت نالاں تھیں۔

"ضحیٰ میں آج جو بات تم سے کرنے جا رہی ہوں اس کے بارے میں اب سنجیدہ ہو جاؤ۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جلد از جلد حسن اور تمہاری شادی کر دوں...... اور اگر تم نے یہ بات نہ مانی تو پھر جہاں میری مرضی ہو گی وہاں زبردستی تمہاری شادی کر دوں گی...... پھر بعد میں مجھے مت الزام دینا۔" وہ بہت غصے سے بولیں۔

"ٹھیک ہے مما...... مجھے تھوڑی سی مہلت دیں میں سوچ کر بتاؤں گی۔" اس نے اس تابعداری سے کہا تو وہ حیران رہ گئیں۔

"اچھا...... لیکن جلدی کرو۔"

ابھی وہ باتیں کر رہی تھی کہ بشیراں بھاگتی ہوئی آئی۔

"بی بی جی...... بی بی جی پتا نہیں نسرین کو کیا ہو گیا ہے...... اس کو سانس نہیں آ رہا ہے......" بشیراں بری طرح رو رہی تھی۔ نسرین، بشیراں کی بہت لاڈلی بیٹی تھی۔

وہ بھاگ کر بشیراں کے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں چلی گئی اور دونوں کو گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے گئی۔ نسرین ٹی بی کی مریضہ تھی اور اس کا مرض آخری سٹیج پر پہنچ چکا تھا۔ جب سے اس کے شوہر نے اس کو طلاق دی تھی وہ بستر کے ساتھ ہی لگ گئی تھی۔ بیوہ ماں کہاں تک علاج کرتی جب کبھی پیسے بچتے تو دوا دارو کر لیتی ورنہ کئی کئی مہینے دوا کے بغیر گزر جاتے۔ اس کو پہلی دفعہ پتا چلا تھا کہ نسرین اتنی شدید بیمار ہے ورنہ وہ تو ہمیشہ اس کو چاک و چوبند ہی تصور کرتی تھی۔

"نسرین کو تو اپنے شوہر سے بہت محبت تھی......؟" اس نے بشیراں کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بی بی...... یہ اس پر جان چھڑکتی تھی اور وہ بھی بہت محبت کرتا تھا پھر نجانے وہ منحوس کہاں سے آ گئی تو اس نے اس کا بچہ بھی چھین لیا۔" بشیراں روتے ہوئے بولی۔

"کون......؟"

"وہ کہتے ہیں نا کہ مرد پر وار ہمیشہ عورت کا ہی چلتا ہے۔ کمبخت شکل وصورت میں بھی اس سے کمتر تھی...... پتا نہیں اس کی عقل پر کیا پردہ پڑ گیا۔ بیوی کو چھوڑ دیا اس سے بچہ تک چھین لیا...... اور بچہ تو عورت کی جان ہوتا ہے اس کی روح ہوتا ہے۔ بس یہی غم اندر ہی اندر اس کو تڑپاتا رہا۔ اس غم نے تو اس کے کلیجے کو چھلنی کر دیا ہے۔" وہ رو دی۔

نجانے انسان کیا کیا غم اپنے اندر چھپائے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور دوسروں کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ جو کوئی سہتا ہے اپنی ذات پر سہہ کر چلا جاتا ہے۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ اس لمحے اسے حسن شدت سے یاد آیا...... وہ اس سے بچوں کی طرح پیار کرنے لگی تھی۔ خدا کرے خوش رہے جہاں بھی رہے۔ اس نے دل ہی دل میں اس کے لیے کتنی دعائیں کر ڈالیں۔

ڈاکٹرز نسرین کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ اب تو صرف خدا پر ہی تھا کہ وہ کتنی مہلت دیتا ہے۔ بشیراں اس کے سرہانے بیٹھ کر ورد کر رہی تھی۔

''بشیراں کیا پڑھ رہی ہو؟'' اس نے اسے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''پڑھ رہی ہوں اس رب کے نام سے جو سب پر رحم کرنے والا ہے، شاید مجھ پر بھی کرم کر دے۔'' بشیراں نے دکھی لہجے میں کہا۔

''لاؤ مجھے بھی دو......'' اس نے تسبیح اس کے ہاتھ سے لے کر پڑھنا شروع کر دی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے روح کے اندر ایک اور دروازہ بن گیا ہو۔ ہر طرف مکمل سکون اور اطمینان چھانے لگا...... جب اچانک بشیراں نے چیخ ماری تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ہوا......؟'' اس نے ہڑ بڑا کر پوچھا۔

''نسرین کو کیا ہو گیا ہے...... سانس نہیں آ رہی'' اس نے اس کو اچھی طرح ٹٹولا...... ڈاکٹر کو بلایا مگر وہ بھی خاموشی سے چلا گیا۔

بشیراں اونچی آواز میں رو رہی تھی وہ اس دنیا میں اب بالکل تنہا رہ گئی تھی صرف ایک بیٹی تھی اور اب وہ بھی نہ رہی تھی...... وہ ہر وقت اپنے کوارٹر میں خاموش پڑی رہتی۔ وہ اس کے پاس روزانہ جاتی اور ہر طرح سے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کرتی مگر اندر کے غم کب باہر کے دلاسوں سے شفا پاتے ہیں۔ یہ تو اندر ہی جنم لیتے ہیں اور اندر ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ مسز توفیق اس کے روز روز بشیراں کے پاس بھی جانے سے سخت ناراض ہوتی تھیں۔

''ٹھیک ہے اس کی بیٹی مر گئی ہے مگر ہر وقت اس پر سوار رہنا بھی کوئی عقلمندی نہیں۔'' مسز توفیق نے خونخوار نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''مما...... وہ بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔'' اس نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

''تو پھر...... بہت سے لوگ دنیا میں اکیلے ہیں۔ کس کس کے پاس جاؤ گی؟''

''جہاں تک ممکن ہو گا......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''پتا نہیں تمہارا تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہے...... اچھی خاصی ہم لوگوں کی اپنی سوشل لائف ہے اس کو چھوڑ کر کن چکروں میں پڑ گئی ہو کیا اپنی بھی فکر ہے؟ زمانہ کتنا ترقی کرتا جا رہا ہے اور تم دن بدن پیچھے آتی جا رہی ہو۔'' وہ غصے سے کہہ کر چلی گئی۔

کتنا فرق تھا اس کی اور اس کی ماں کی سوچ میں۔ جب سے شعور کے دروازے کھلے

تھے ساری دنیا ایک نئے مفہوم سے اس کے سامنے آ رہی تھی اور حقیقت سے لوگ کس طرح نظریں چراتے ہیں۔ آج اس کو ماں کے رویے سے اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے دکھ سے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد حسن آیا تو مسز توفیق نے اس کو ساری بات بڑھا چڑھا کر بتائی۔

''آنٹی...... کہاں ہے صفی اس وقت؟'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بولا۔

''اپنے کمرے میں......'' وہ غصے سے بولیں۔

وہ افسردہ سی بیڈ پر بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا کیوں پریشان ہو......؟''

''کچھ نہیں......''

''کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گی......''

''بتانے کو کیا ہے......''

''کچھ تو ہونا چاہیے......''

''حسن، مما کو میری ہر بات پر اعتراض کیوں ہے؟'' وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

''اچھا تو یہ بات ہے، کیا کہتی ہیں وہ......؟'' حسن متجسس لہجے میں بولا۔

''ہر وقت یہی کہ سوشل لائف کو Improve کرو شادی کرو۔''

''تو مان لو نا ان کی بات......'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''مجھے پہلے ہی پتہ تھا تم بھی ان کی زبان بولو گے...... میں شادی نہیں کرنا چاہتی، میں زندگی میں کچھ کرنا چاہتی ہوں...... کیوں مجھے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرنے دیتیں۔ حسن کو گھر لائی تو تب یہ ناراض...... بشیراں کے پاس جاؤں تو تب یہ خفا'' وہ بھی غصے سے بولی۔

''ہاں حسن سے یاد آیا...... کہاں ہے وہ؟'' حسن نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

''پتا نہیں...... میرا دل اس کے لیے بہت اداس ہے، پلیز تم ذرا اس کا پتہ کرو......'' وہ اس کے قریب ہو گئی۔

''شکر ہے تم کسی کو تو مس کرتی ہو۔'' حسن نے مسکرا کر کہا۔

''حسن کو دیکھنے نہ چلیں'' اس نے رائے دی۔

''ہاں ابھی چلتے ہیں۔'' اس نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''نہیں مما پھر ناراض ہوں گی۔''

''میں پوچھتا ہوں......''

''مسز توفیق اس کے سامنے کچھ نہ بولیں اور دونوں بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچے بہت بڑا گھر تھا، مگر بے حد خاموشی۔

''ہم لوگ حسن سے ملنے آئے ہیں۔'' اس نے چوکیدار کو بتایا۔

''جی وہ تو بیمار ہے۔''

''کیا......؟'' وہ ایک دم پریشان ہوگئی اور اندر کی جانب لپکی۔

''سنو بی بی...... وہ گھر نہیں ہسپتال میں ہے۔'' چوکیدار نے بتایا۔

اور وہ ہسپتال پہنچے، حسن کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اتنا کمزور و نحیف اس کا زرد چہرہ...... اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں...... اس کو سخت رنج ہوا اسے دیکھ کر۔ وہ دیوانہ وار آگے بڑھی اور بے اختیار اس کے ہاتھ پاؤں چومنا شروع کر دیئے۔ حسن بھی حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ واقعی یہ **Extremist** ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

''میں حسن کو لے جاؤں گی...... یہاں نہیں رہنے دوں گی...... میرے پاس وہ بالکل ٹھیک تھا۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

ایک دم حسن نے آنکھیں کھولیں۔

''آپی......'' اور وہ اس کے گلے لگ گیا۔

''آپی مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے...... میں نے ان کے پاس نہیں رہنا۔'' اس نے بیڈ کے پاس کھڑے رشتہ داروں کو دیکھ کر کہا۔

''ہاں ہاں میری جان میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گی۔ بس تم ٹھیک ہو جاؤ'' وہ پیار سے بولی۔

''حسن میں تمہیں جلد لینے آؤں گی......'' وہ بغیر کسی کی طرف دیکھے اور سنے باہر نکل گئی، اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دبیز تہہ تھی جسے صرف وہی دیکھ سکا مگر خاموش رہا۔

......❁......
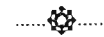
(29)

''میاں جی...... میں حسن کے لیے بہت بے چین ہوں...... نجانے اس کے لیے، میرے دل میں کہاں سے اتنی محبت پیدا ہوگئی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا وجود اس کے بغیر نامکمل ہے...... دعا کریں وہ مجھے مل جائے۔'' اس نے میاں جی کے پاس بیٹھ کر التجائیہ انداز میں کہا۔

''بہت محبت کرتی ہو اس سے......'' میاں جی زیرلب مسکرائے۔

''کیا اس کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہو......؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکی۔

''سمجھ جاؤ گی...... زندگی کا حُسن رشتوں کا یہی تانا بانا ہے۔ تم کسی سے محبت کرتی ہو، کوئی تم سے کرتا ہے۔ ایک کی دوسرے سے شعوری، لاشعوری محبت...... اچھا ہے جب تک بھرم رہے...... خدا محبت سے منع نہیں کرتا۔ وہ تو خود سراپا محبت ہے...... مگر محبت کی بھی بہت سی اقسام ہیں۔ لمحاتی، وقتی، جذباتی، دائمی، جنسی، جسمانی اور روحانی...... اور ایک باشعور انسان ان تمام اقسام کی محبتوں سے اپنی زندگی میں ضرور ہو کر گزرتا ہے...... کیونکہ یہ سرشت میں ہے اور سرشت کے تقاضوں کے بغیر انسان نامکمل ہے۔ فکر نہیں کرو، سب پتا چل جائے گا...... اپنے موضوع کی طرف آؤ...... ابھی بہت سی نامکمل باتوں کو مکمل کرنا ہے۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو؟'' وہ ہر دفعہ سوالات کی ایک اسائنمنٹ لے کر ان کے پاس آئی تھی۔ اس لیے انہوں نے پوچھا۔

''ہاں پچھلی دفعہ مذہب کا تصور تو آپ نے واضح کر دیا مگر مذہب کو ''قدیم'' کہہ کر جھٹلایا کیوں جاتا ہے اور سائنس کو ''جدید'' کہہ کر اپنانے کی روش جو چل نکلی ہے تو اس میں دونوں کا آپس میں کس حد تک تعلق واسطہ ہے۔''

''ہاں...... اس کی توضیح بہت ہی عجیب عجیب طریقے سے ہوتی ہے لیکن ادراک کی بات ہے، سمجھو تو سب کی بنیاد ایک ہی ہے۔ مذہب جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ یہ اصل میں نظریہ ہے ارتقاء کی طرف سفر...... لیکن درمیان میں ایک انتہائی اہم ''موڑ'' یا ''موضوع'' کہہ لو وہ بھی اہم ہے اور وہ ہے ''فلسفہ'' کچھ لوگ مذہب اور فلسفے کو جھٹلاتے ہیں لیکن سائنس کو اپنانا چاہتے ہیں حالانکہ فلسفہ حقائق کو عقلی دلائل سے ثابت کر کے ان سے منطقی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔''

''لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی معمولی سی بات کو شعوری اور منطقی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کی بات کو فلسفہ سمجھ کر جھٹلایا جاتا ہے۔ کیا فلسفہ زندگی میں اتنا ناقابل قبول ہے کہ لوگ اس سے بوریت محسوس کرنے لگتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

ایسی بات نہیں...... اصل میں جب عقلی توضیحات اور ترجیحات کسی چیز میں شامل کی جائیں تو عام فہم شخص اس کو قبول کرنے سے ڈرتا ہے جیسے سیلاب کے آنے سے پہلے لوگ حفاظتی تدابیر سوچنا شروع کر دیتے ہیں اس کے آنے سے ڈرتے ہیں چار و ناچار اس کو قبول کرتے ہیں لیکن جب یہ چلا جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ ضرور دے کر جاتا ہے......'' میاں جی نے آہستہ سے بتایا۔

''مگر سیلاب اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے بھی تو جاتا ہے اور پیچھے صرف تلخ حقائق چھوڑ جاتا ہے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''ہاں فلسفے میں بھی ایسا ہی ہے۔ یہ عام سوچ کو بہا کر لے جاتا ہے اور سوچ کو نئی جہت اور دھارا بخشتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ تلخ حقائق اور مضطرب سوچیں بھی چھوڑ جاتا ہے۔'' میاں جی نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''تو پھر کیا فائدہ...... اس میں ڈوبنے سے انسان کو پرہیز کرنا چاہئے؟''

''نہیں...... ہر چیز کی افادیت ہوتی ہے جو چیز شعور کو شائستہ اور قابل قدر بنائے اس کو ضرور اپنانا چاہئے جس طرح آگ جلانے سے پہلے ہی یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ آگ کس کس چیز کو جلائے گی...... یہ تو بعد کی بات ہے اور انسان پر منحصر ہے کہ وہ آگ کو زیادہ جگہ نہ گھیرنے دے اور بہت زیادہ چیزوں کو راکھ کا ڈھیر نہ بننے دے۔''

''اور سائنس......؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''مذہب نظریہ ہے...... فلسفہ نظریے کو عقلی دلائل سے ثابت کرتا ہے اور سائنس تجرباتی طور پر ان حقائق کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ سائنس بھی ذات کے عرفان کی جانب ایک اہم قدم ہے...... کائنات کی تسخیر اور انسان کا فاتح ہونا...... قدرت کے معجزوں میں سے ایک بڑا معجزہ ہے۔ سائنس نظریات اور دلائل کو عملی طور پر ثابت کرتی ہے۔''

''لیکن سائنس کو مذہب سے ہمیشہ علیحدہ کیوں سمجھا جاتا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ضحیٰ بی بی دراصل یہ رویوں میں تضاد کی وجہ سے ہے...... لوگ سائنس کو ''جدید'' اور مذہب کو ''قدیم'' سمجھتے ہیں۔ سائنس کو ''ترقی'' اور ''مذہب'' کو ''قدامت پسندی'' کی علامت تصور کرتے ہیں حالانکہ سائنس تو خود ہاتھ پکڑ کر قدرت کی طرف لے کر جاتی ہے بلکہ بعض مقامات تو ایسے ہیں کہ جہاں سائنس لے کر جاتی تو ضرور ہے مگر جب بے بس ہو جاتی ہے تو قدرت کے حوالے کر دیتی ہے اور پھر قدرت اس کا جواب دیتی ہے لیکن قدرت جب عقلی دلائل شروع کرتی ہے تو انسان عملی اور تجرباتی ثبوت مانگتا ہے اور اس معمہ کو ''معجزہ'' جان کر حل کیے بغیر ہی لوٹ آتا ہے مثلاً سائنس کہتی ہے کہ ابتداء میں یہ کائنات یونہی تھی کچھ بھی واضح شکل میں موجود نہ تھا۔ نہ آسمان نہ زمین یوں جیسے کھولتے ہوئے سیاہ مادے کا سمندر...... صرف توانائی یعنی روشنی کا وجود تھا۔ اسی نے بعد میں مادہ کی شکل اختیار کی یہ مادہ ابتدا میں گیس یا ''دخان'' کی شکل میں ظاہر ہوا، بعد میں اس میں سے بادلوں کی طرح ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر قدیم وجود میں آئے جس سے کہکشائیں بنیں۔ اس عمل کے لیے بھی دو طریقے بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک ''کائناتی جوہر'' کا اور دوسرا ''حالت قائمہ'' کا پہلے نظریے کے مطابق شروع میں ایک بہت بڑا جوہر تھا جس میں الیکٹرون اور پروٹون منتشر حالت میں ٹھسے ہوئے تھے۔ پھر ایک دھاکہ کے ساتھ یہ جوہر پھٹا اور مادہ پھیل گیا۔ الیکٹرون اور پروٹان کی ترتیب قائم ہوئی جس سے گیسی مادہ تیار ہوا۔ دوسرے نظریے کے مطابق توانائی سے رفتہ رفتہ مادہ کی شکل اختیار کی اور قدیم وجود میں آئے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور کائنات میں وسعت پیدا ہو رہی ہے اور یہی قدیمی عمل انجماد سے ستاروں کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر ان ستاروں میں انشراق کا عمل ہو کر سیارے بنے جس میں سے ایک سیارہ زمین ہے جو نظام شمسی سے مربوط ہے...... اب توانائی یا روشنی کا مرجع یا ماخذ کیا ہے یہ روشنی کہاں سے آئی۔ سائنس اس کا جواب نہیں ڈھونڈ سکی۔''

''البتہ قرآن اس بارے میں کہتا ہے کہ ''ارض و سمٰوٰت پہلے ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے زندہ چیز پیدا کی۔''

''اب سائنس پھر یہاں اس چیز کی تصدیق کرتی ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ پانی کے وجود سے پہلے حیات کا ظہور ہو سکے۔ اب حیات کی تخلیق کس طرح ہوئی وہ بھی پہلے طریقے کے مطابق کائنات کی سماوی اور ارضی اشیاء کی اصل دو امر ہیں مادہ (ایتھر) اور اس کی قوت (حرکت) اور عناصر حرکت کے ذریعہ مادہ کے اس اجزاء کے اجتماع سے پیدا ہوتے ہیں جو کہ شمار میں ساٹھ سے بھی زیادہ ہیں اور عناصر کے مجتمع ہونے اور خاص طور پر ملنے کی وجہ سے معدنیات اور جاندار اجسام وجود میں آئے اب یہ کیسے وجود میں آتے ہیں ان کی بنیاد ایک قسم کا زلال مادہ ہوتا ہے جو نہ تو بالکل جما ہوتا ہے اور نہ پتلا بلکہ ان دونوں کی درمیانی حالت رکھتا ہے۔ جس کا نام پروٹو پلازم ہے اب اس کے کیمیائی اجزاء آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن، نائٹروجن، فاسفورس، سلفر، کلورین، کیلشیم، سوڈیم اور میگنیشیم وغیرہ بھی دریافت کر لیے گئے ہیں مگر انتہائی کوشش کے باوجود پوری دنیائے سائنس ان اجزاء و عناصر کو باہم ملا کر پروٹو پلازم بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ ان اجزاء کو لاکھ طریقے سے ملاتی ہے۔ مگر وہ پروٹو پلازم میں بمشکل اس کو مجتمع ہونے سے وہ خول تیار ہوتے ہیں جن سے جسم کے اعضاء کی بناوٹ ہوتی ہے اور اس کے جمع ہونے سے حیوانات اور نباتات ابتدائی حالت میں پیدا ہوئے ہیں۔

سائنس قدرت کے ان چاروں قوانین کی تصدیق کرتی ہے جن کے مطابق تمام نباتات اور حیوانات نمو پاتے ہیں۔ پہلا قانون ''تبائن افراد'' ہے جس میں کوئی فرد مکمل طور پر اپنی اصل کے مشابہہ نہیں ہو سکتا بلکہ ان تبائنات کے نر اور مادہ کے ہوتا ہے۔''

''دوسرا ''قانون فروع'' ہے جس میں جداگانہ خصوصیات اختیار کرنے کے علاوہ تبائنات یا خصوصیات کا منتقل ہونا ہے (جو وراثت کے قریب ہے) اس کی وجہ سے افراد میں کوئی قوی، ضعیف یا کمزور ہوتا ہے۔ کوئی خارجی صدمات کا متحمل ہوتا ہے کوئی نہیں۔''

''تیسرا قانون باہم افراد میں باقی رہنے کے بارے میں ''منازعت'' کا واقع ہونا ہے جس کا نام قانون تنازع و بقا ہے جس کے مطابق بعض کمزور اور نحیف ہونے کے باعث خارجی طاقتوں کو برداشت نہیں کر پاتے اور ختم ہو جاتے ہیں اور کچھ قوی ہونے کے

باعث باقی رہ جاتے ہیں۔''

''چوتھا قانون طبعی یا فطری انتخاب ہے اور اس سے فطرت کا نہایت عمدہ اور کامل شئے کو انتخاب کر کے حفاظت کرنا مراد ہے۔ چنانچہ سائنس کا کہنا ہے کہ لاکھوں برس گزرنے پر حیوانات اور نباتات مادہ کے اجزاء کی اضطراری حرکت و فطرت کے ان چاروں قوانین کے مطابق رفتار اختیار کرنے کے بعد ترقی کر کے آج اس حالت کو پہنچ گیا ہے یعنی ان کے مطابق انسان بھی ایک قسم کا حیوان ہے لیکن فطری انتخاب کے قانون کے موافق، عمدگی اور خوبی کے اعتبار سے ترقی کر کے اس موجودہ حالت پر پہنچ گیا ہے۔''

''یعنی کہ **Darwin** کی **Theory** اس سے ملتی جلتی ہے۔''

''ہاں...... اس پر بحث ہو چکی ہے......'' اب کی بار درانی صاحب بولے۔

''اب آپ باشعور ہیں کہ دوسروں کے نظریات اور اپنی سوچ میں فرق کر سکیں اور صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں......'' فریدی صاحب نے بھی بحث میں حصہ لیا ورنہ میاں جی کی موجودگی میں وہ لوگ بہت کم گفتگو میں حصہ لیتے۔

''آنکھیں کھول کر دیکھو...... تو پھر علم ہوتا جائے گا کہ کس قدر سچائی، حقیقت ارد گرد بکھری پڑی ہے بات تو صرف سمجھنے کی ہے اور قدرت بھی بار بار تفکر، سوچ، غور و فکر، سمجھنے اور عقل استعمال کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ خدا نے ہمیں ''فطرتِ سلیم'' پر پیدا کیا ہے اور ''عقل سلیم'' کو استعمال کرنے کا بار بار حکم دیتا ہے۔ یہ ہمارے مذہب کی خوبی ہے کہ ہر عمل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی تاکید کی ہے جہاں شک پیدا ہوا سے چھوڑ دو۔ جس پر دل مطمئن ہو جائے اس کو اپنا لو۔ ایسا شفاف نظریہ کہیں اور نہیں ملے گا اور ہم جو تمہارے نظریات و خیالات کی تاویلیں بتاتے ہیں اس کا مقصد ہی یہی ہے کہ قدرت تک پہنچنے کے لیے قدرت میں جھانکنا بہت ضروری ہے۔ اس راہ کے مسافر کو ہر شعبے کا قطعی و حتمی علم ہونا چاہیے جب ''علم'' پر ''عقل'' مہر ثبت کرتی ہے تو پھر بے اطمینانی کبھی پیدا نہیں ہوتی یہ بھی روحانی تربیت کا حصہ ہے۔'' میاں جی نے بھرپور وضاحت کی اور درانی صاحب کو اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد درانی صاحب کھانا لے آئے اور سب خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ میاں جی سے دعائیں لے کر رخصت ہو گئی۔

......۞......

(30)

کافی دنوں سے وہ گھر میں بالکل تنہا تھی۔ ممی پاپا بزنس ٹور کے سلسلے میں جرمنی گئے تھے اور واپسی پر کافی ملکوں سے ہو کر آنا تھا۔ وہ گھر میں بہت خوش تھی۔ ہر طرف سناٹا ہی سناٹا۔ ورنہ ہر وقت مما اس کو ڈانٹتی ہی رہتی۔ زندگی کا بھی عجیب قانون ہے کبھی بہت پرسکون اور آسودہ حال تو کبھی ایسے بے چین دن اور ایسی بد حالی و بے اطمینانی کہ وہ تنگ سی پڑ جاتی لیکن آہستہ آہستہ سمجھنا شروع ہو گئی تھی کہ کس طرح خوشحالی بدحالی کے پیچھے اور بدحالی خوشحالی کی منتظر رہتی ہے۔ بات تو بس دنوں کی ہے۔ نہ زندگی ایک ڈگر پر چل سکتی ہے نہ حالات۔ نہ ہی انسان۔ اب اس کا ذہن یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ ہر کرائسس گزر ہی جاتا ہے۔ جلدی یا دیر سے مگر ضرور...... حسن آتا خیریت پوچھتا اور چلا جاتا۔

"میرا حسن سے ملنے کا دل چاہتا ہے۔" ایک دن اس نے حسن سے کہا۔

"لیکن سنا ہے وہ لوگ اس کو باہر لے گئے ہیں۔" حسن نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیوں......؟" وہ چونکی۔

"علاج کے سلسلے میں"

"کیا وہ زیادہ سیریس ہے......؟"

"معلوم نہیں......"

"تمہیں کیسے پتہ چلا۔"

"ایک دن میں ہاسپٹل گیا تھا تو وہاں سے پتا چلا۔"

"تو مجھے کیوں نہیں بتایا......؟"

"فائدہ......؟"

"حسن تم ہر بات میں فائدہ نقصان کیوں سوچنے بیٹھ جاتے ہو......؟" وہ جھنجلا

کر بولی۔

"اس کے بغیر زندگی کچھ نہیں"

"زندگی اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"مثلاً......؟" اس نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"میں اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں...... میں پریشان ہوں اور تم......"

"میں بھی بہت سنجیدہ ہوں، تم سے کوئی مذاق تو نہیں کر رہا"

"اچھا ناراض مت ہو...... میں چائے لے کر آتی ہوں"

"میں نے چائے نہیں پینی...... میں جا رہا ہوں جب بھی موڈ آف دیکھتی ہو چائے آفر کرتی ہو...... پتا بھی ہے ایسے میں میں کبھی چائے نہیں پیتا۔" وہ بھی خفگی سے بولا۔

"تو ناراض کس بات پر ہو رہے ہو......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کسی پر نہیں...... صرف اپنے آپ پر۔"

"Dont be so Cynical"

"حالات انسان کو ایسا بنا دیتے ہیں......" وہ کہہ کر چل دیا اور وہ خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی...... کہ آہستہ آہستہ اس میں کتنی تلخی آ رہی تھی۔

"اگلے دن اچانک اسے خبر ملی کہ واپسی پر اس کے مما پاپا کا Plane کریش ہو گیا ہے وہ اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھی...... ایسا شدید دھچکا لگا کہ وہ کئی دنوں تک بے ہوش رہی...... نہ کوئی بہن نہ بھائی، صرف حسن اور اس کے گھر والے اس کو سنبھالتے رہے۔ بہت کوشش کی مگر ان لوگوں کی لاشیں بھی نہ مل سکیں۔ وہ ان کے جانے کے بعد تو بالکل ہی تنہا اور بکھر کر رہ گئی۔ ہر وقت گم صم بیٹھی رہتی۔ حسن اس کو بہت سمجھاتا، دلاسے دیتا اور ہر طرح سے اس کے دکھ میں شریک ہوتا مگر بعض دکھوں کا تعلق صرف انسان کے اندر سے اس کے باطن سے ہوتا ہے اور جن کا کرب صرف انسان خود ہی محسوس کر سکتا ہے کنارے پر کھڑا کس طرح سمندر کی گہرائی کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کے اندر کیا کیا چھپا ہے۔ وہ تو صرف یہی دیکھتا ہے کہ سمندر بہت بڑا اور گہرا ہے۔ اس کے اندر کتنی کڑواہٹ اور کتنی تلخی ہے۔ یہ صرف اس کو ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایسی ہی کڑواہٹ اور تلخی نے اس کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ کئی دنوں سے گھر سے باہر بھی نہ نکلی تھی

اب تو کوئی روک ٹوک بھی نہ تھی مگر اس کا دل بالکل باہر جانے کو نہ چاہتا تھا۔ والدین کی وفات ہی اس کے لیے صدمہ نہ تھی مزید افتاد یہ پڑی کہ پاپا کی وزارت میں جتنی کرپشن ہوئی تھی اب سارے سکینڈلز منظر عام پر آنے لگے تھے۔ ہر روز اخبارات نئے نئے واقعات سے بھری ہوتیں۔ آہستہ آہستہ جتنی جائیداد تھی وہ ضبط ہونے لگی...... سارا کچھ ہاتھ سے نکلنے لگا مگر وہ بھی ان کو واپس لینے کی تگ و دو نہ کرتی...... حسن اس کو بار بار سمجھاتا، پیروی کرنے کو کہتا مگر ہر بار وہ خاموش رہتی۔ وہ جھنجھلا کر خود ہی چلا جاتا...... اس کو ان چیزوں سے اب کوئی دلچسپی نہ رہی تھی کہ وہ ان کے حصول کے لیے تگ و دو کرتی۔
یہ سب چیزیں اب اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں صرف گھر اور ایک پلازہ بڑی مشکل سے حسن نے تگ و دو کر کے بچایا تھا۔ ساری شان و شوکت ختم ہو کر رہ گئی...... سارے ملازم رخصت ہو گئے۔ بشیراں اپنے گاؤں چلی گئی...... اب تھوڑے پیسوں پر ایک ملازمہ رکھ لی تھی...... حالات نے ایسا دائرہ تنگ کیا کہ زندہ رہنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ ہر روز کوئی نیا تقاضا، کوئی نیا نوٹس منتظر ہوتا۔

حسن کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر گیا تھا اور عدالت نے گھر کے بارے میں اسے پھر طلب کیا تھا کیونکہ اس پر کسی اور نے دعویٰ کر دیا تھا کہ یہ اس کی ملکیت تھی مگر دھونس سے لی گئی تھی۔ وہ بے حد پریشان تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے...... کہ اچانک میاں جی...... درانی صاحب اور فریدی صاحب آ گئے، وہ ان کو دیکھ کر حیران رہ گئی...... اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''میاں جی...... میرے مما، پاپا!'' وہ ان کو دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔

''ہاں...... علم ہوا...... بہت دکھ ہوا...... انسان ہر رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ مصلحتوں کے تحت بدل لیتا ہے مگر ماں باپ کبھی نہیں...... یہ قدرت کا بڑا انعام اور عطیہ ہیں اگر خالق اوپر بیٹھ کر نگہبانی کرتا ہے تو وہ زمین پر محافظ ہوتے ہیں۔ سوچو ان سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جو پہلے اپنے وجود سے اولاد کو تخلیق کرتے ہیں پھر اپنے خون پسینے پر ان کو پروان چڑھاتے ہیں، کون ایسا کر سکتا ہے......؟ کون......؟ کوئی بھی تو نہیں...... ان کا نعم البدل واقعی کوئی نہیں...... اولاد کے دکھ سمیٹنے کے لیے اپنی چادر کو تار تار کر دیتے ہیں۔ ان کی بقا کے لیے اپنی فنا قبول کرتے ہیں...... واقعی ان کی موت بہت بڑا زیاں ہوتی

ہے...... لیکن جو اس کی مرضی...... ہم کون ہیں جو اس سے سوال کر سکیں وہی ہے جو ہمیں ایسی ہستیاں دیتا ہے پھر ان کے لیے بے پناہ محبت بھی دلوں میں ڈال دیتا ہے اور پھر چھین بھی لیتا ہے۔ ہماری مرضی اور عمل دخل تو کہیں نہیں۔'' وہ دلاسا دیتے رہے اور وہ کافی دیر روتی رہی۔

''مت روؤ...... ان کے لیے جو ہمارے تھے بھی اور نہیں بھی......'' انہوں نے پھر تسلی دی۔

''مگر انسان دل رکھتا ہے احساسات اور جذبات بھی تو خدا نے دیے ہیں۔ جب وہ ودیعت کرتا ہے تو آزمائش بھی وہی کرتا ہے...... اس آزمائش پر انسان کیا کرے......؟''

''شکر...... ہر حال میں شکر......'' میاں جی نے سانس کھینچ کر کہا۔

''شکر بہت مشکل ہے...... کیا دکھ ہو اور انسان روئے بھی نہ۔ یہ کیسے ممکن ہے...... انسان صبر تو کر سکتا نہیں شکر کیسے کرے۔'' وہ بمشکل بولی۔

''ہاں...... مشکل تو بہت ہے مگر عبدیت کا تقاضا ہی ہے کہ وہ شکر کرے جب نہ ملے اور جب ملے تب بھی۔'' میاں جی نے پھر کہا۔

''میاں جی انسان بہت کم حوصلہ واقع ہوا ہے...... صبر اور شکر بہت مشکل ہے......'' وہ بولی۔

''ہاں...... اس کو سب معلوم ہے اس لیے تو صبر اور شکر کا زیادہ تقاضا کیا گیا ہے صبر تو جانور بھی کر لیتے ہیں تمام مخلوق جو بولتی نہیں صبر ہی تو کرتی ہے کیونکہ اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں اور انسان کو زبان دے کر اس کے صبر و شکر کا امتحان لیا گیا ہے...... انسان قسمت پر شاکر رہے جو ملتا ہے یا مل رہا ہے وہ سب لکھ دیا گیا ہے نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔''

''تو پھر انسان بالکل ساکت بیٹھا رہے جو ملنا ہے مل کر رہے گا۔''

''نہیں...... حرکت بہت ضروری ہے۔ تمہیں بتایا تھا نا کہ کائنات میں ایک ایسا مادہ ہے جس کی حرکت سے حیات وجود میں آتی ہے۔ اس طرح انسان کی حرکت سے اعمال وجود میں آتے ہیں اور اعمال پر ہی انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ پانی کا گلاس اٹھائے بغیر منہ میں پانی کیسے جائے گا...... یہ نظام کائنات ہے اگر ہر ایک کو یونہی بیٹھے

بٹھائے ضرورت کی چیزیں پہنچتی رہیں تو قانونِ حرکت تو ختم ہو گیا۔ کائنات ساکن و منجمد ہو جائے گا۔ پھر یہ دنیا نہ رہے گی۔ بلکہ جنت تو پھر یہیں بن جائے گی۔ پھر عمل کہاں اور جزا و سزا کہاں؟'' میاں جی نے وضاحت کی۔

میں اپنے آپ کو بہت سمجھاتی ہوں...... مگر اضطراب بڑھتا ہی جاتا ہے۔'' وہ بے چینی سے بولی۔

''ہاں...... یہ فطری عمل ہے...... ہر بات، ہر واقعہ اپنے آپ میں اہمیت رکھتا ہے اور وقت اس کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ پھر یہی وقت آہستہ آہستہ اس پر دھول مٹی کی تہیں جمانا شروع کر دیتا ہے اور واقعات منوں مٹی تلے دبتے جاتے ہیں انسان کی طرح...... پھر جس طرح زمانہ انسان کو بھلا دیتا ہے اس کو بوسیدہ کھنکتی ہڈیوں میں اور پھر راکھ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح واقعات چھوٹے ہوں یا بڑے انسان کے اندر دفن ہو جاتے ہیں...... پھر جس طرح کبھی کبھی کسی انسان کی نشانی ملتی ہے جیسے کوئی کھوپڑی، کوئی ہڈی...... اس طرح کوئی بات انسان کے اندر دفن واقعات کو باہر لے آتی ہے...... مگر کسک کے ساتھ...... بس یہی زندگی ہے...... یہ تو چلتا ہی رہتا ہے...... گھبراؤ مت...... کل درانی اور فریدی تمہیں کہیں لے کر جائیں گے میری طبیعت ٹھیک نہیں...... تم ان کے ساتھ چلی جانا، قدرت ہر قدم پر تمہاری رہنمائی کرے گی۔ ہر تکلیف ایک آزمائش اور ہر آزمائش کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے۔ یہی قدرت کی منصوبہ بندی ہے اور قدرت اپنی منصوبہ بندی میں بہت جامع اور اٹل ہے۔'' میاں جی نے توضیح کی۔

''کہاں......؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''تمہارا اضطراب ختم کرنے کی کوشش کریں گے...... اگر دل رونے کو چاہتا ہے تو ضرور رو...... آنسو بھی تو دل کا غبار ہوتے ہیں جو آنکھوں کے دھوئیں کو، ان کی گندگی اور جالوں کو کم کرتے ہیں۔ یہ بھی قدرت کا عطیہ ہیں...... انسان کے اندر جب لاوا ابلتا ہے تو آنسو اس کا Catharsis کرتے ہیں......'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تینوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔

٭

(31)

اگلے دن فریدی صاحب اور درانی صاحب اسے اپنے ریسرچ سنٹر لے گئے۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلی عمارت جس کے مختلف Phases تھے وہاں کس قدر منظم طریقے سے کام ہو رہا تھا وہ حیران رہ گئی۔

''فریدی صاحب یہ سب کیا ہے......؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ ہمارا ریسرچ سنٹر ہے۔ بزنس کے ساتھ ساتھ ہم لوگ یہاں ریسرچ بھی کرتے ہیں۔''

''کیسی ریسرچ......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جانوروں اور پودوں پر......''

''کیا مطلب......؟'' اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''ادھر آیئے...... یہ دیکھیے......'' انہوں نے اسے طرح طرح کے پودے دکھائے جن کی نسل تو ایک تھی مگر اقسام بے شمار...... کسی کے رنگ میں فرق تھا تو کسی کی شکل میں، کسی کے قد میں تو کسی کی جسامت میں...... اب ان مختلف اقسام کو ہم بہت سے ممالک سے اکٹھا کر کے اپنے اس ریسرچ سنٹر میں لاتے ہیں...... یہ دیکھیے یہ گھاس ہے۔ کتنی انواع کی گھاس ہے۔ اس کا رنگ گہرا براؤن ہے، اس کا ہلکا...... اس کا سبزی مائل ہے، اس کا سبز۔ اسی طرح ہم مختلف پھولوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ جیسے گلاب ہے تو ایک نام مگر اس کی کتنی اقسام ہیں۔ ان سب کو ہم یہاں اکٹھا کرتے ہیں۔''

''کس لیے......؟'' وہ حیرانگی سے بولی۔

''سب سے پہلے تو ہم ان کی افزائش کے جو دو طریقے ہیں جنسی اور غیر جنسی اس پر تحقیق کرتے ہیں۔ جنسی طریقے کا مقصد اس پودے کے مقابلے میں جس سے یہ پیدا ہوا ہے ایک جدید منفرد وجود کا اظہار ہے اور غیر جنسی افزائش نسل کا طریقہ جو نامیاتی وجود

کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے ظہور میں آتا ہے۔ جو اصل پودے سے جدا ہو گیا ہو اور اس طریقے سے ترقی پا گیا ہو کہ وہ پھر اسی پودے سے واصل ہو جائے جس سے وہ نکلا تھا۔ عالم نباتات میں جنسی افزائش نسل ایک ہی پودے پر نر اور مادہ کے ملاپ سے جنسی تشکیل کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ یا جداگانہ پودوں پر قائم ہو جاتی ہے۔ اب ہم ان کی افزائش کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف قسم کے ماحول میں ان کو پروان چڑھا کر نہ صرف ان کی نفسیات کا جائزہ لیتے ہیں بلکہ ان پودوں کو کشید کر کے ان سے جو عرق نکلتا ہے اس پر ریسرچ کرتے ہیں کہ وہ کس کس طرح انسانوں کے لیے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔"

"واقعی......؟" وہ حیران رہ گئی۔

"لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور لطف کی بات یہ ہے کہ قدرت کے شاہکاروں کو جانچنے سے قدرت کی کاریگری کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ سوچ نہیں سکتیں کہ انسانوں کی طرح ان کی بھی پوری کائنات ہے۔ کوئی ایک بھی دوسرے سے نہیں ملتا مگر اندر سے خاصیت کے اعتبار سے بہت کچھ ملتا ہے۔ اور بعض ایسے ایسے نفیس اور نازک احساسات کے مالک ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مثلاً بعض اتنے حساس ہوتے ہیں کہ ذرا سا ہاتھ لگاؤ تو چھوتے ہی باہم مل کر یوں سکڑ جاتے ہیں جیسے شرما گئے ہوں...... نفسیاتی طور پر بعض انسان بھی ایسے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض اتنے دیوقامت، مضبوط اور توانا درخت ہیں کہ نظریں تھک جاتی ہے مگر ان کی لمبائی ختم ہونے کو نہیں آتی۔ کچھ بارش کے محتاج ہیں کچھ کے لیے پھوار اور کچھ کے لیے نمی ہی کافی ہے۔ اتنے اتنے خوبصورت رنگ برنگے پھول ہیں کہ ایک کی شکل، خوشبو اور خاصیت دوسرے سے نہیں ملتی۔ اسی طرح پھلوں میں اتنا اختلاف، ان کے ذائقوں، شکلوں، رنگوں میں اتنا فرق...... جو ذائقہ چھلکے میں ہے وہ گودے میں نہیں۔ تخم اور پتوں میں فرق۔ انسان تو صرف بیج بو کر مٹی ہموار کر کے پانی دیتا ہے اور قدرت اس کو مختلف شکلیں دیتی ہے۔ ایک درخت کے ریشے تنے، پتے، پھول، تخم، پھل میں جدا جدا خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جوز ہندی یعنی نارجیل کا ایسا درخت ہے جس کے پھل کے پکنے سے پہلے اس سے شراب بنائی جاتی ہے اور پکنے کے بعد جو اس سے بنتا ہے وہ دودھ کے مشابہہ ہوتا ہے۔ ترکاری کے طور پر اس کے پتے پکتے ہیں اس کے پھول کے عرق سے شکر بنتی ہے۔ اس کی لکڑی اور پھول کے چھلکے

سے برتن، پیالے اور گھڑے تیار ہوتے ہیں۔ اس کی چھال کے ریشوں سے کپڑے، چھلنیاں، بورے اور رسی تیار ہوتی ہے۔ اس کے پھلوں سے گری کا تیل نکالا جاتا ہے اور لکڑی کے برادہ سے لکھنے کی روشنائی، پتوں سے لکھنے کا کاغذ بھی بنایا جاتا ہے اور اسی طرح کائنات ایسے عجائبات سے بھری پڑی ہے اور ابھی تسخیر کرنے کو بہت کچھ رہتا ہے۔ جو معلوم ہوا ہے وہ تو صرف چار پانچ فیصد ہے اور ہمارے اس ریسرچ سنٹر میں اسی قسم کی تحقیقات ہوتی ہیں۔ صرف یہی نہیں ایک اور کائنات ہے مگر بہت چھوٹی جس کو صرف مائیکروسکوپ سے دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے کہ کائی جو پانی کی سطح پر تیرتی ہے۔ اس قدر چھوٹے اور دبے ہونے کے باوجود ان میں پھول اور تخم سب کچھ ہوتا ہے ادھر آؤ یہاں دیکھو۔ انہوں نے ایک مائیکروسکوپ اس کے حوالے کی اور وہ نیچے ذروں کے برابر چلتے پھرتے بیکٹیریاز کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اب ادھر آؤ...... وہ اسے فیز نمبر 4 میں لے گئے...... وہاں رنگ برنگی طرح طرح کی اقسام کے پرندے...... طوطے، چڑیاں، کوے، کبوتر، چیلیں...... اور بے شمار انواع و اقسام کے عجوبے تھے۔ ان پر بھی ایسی ہی ریسرچ ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ ایسی ایسی رطوبتیں خارج کرتے ہیں جس کو طرح طرح سے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ ہم ان کو یہاں پالتے ہیں ان کی نفسیات کا تجزیہ کرنے کے لیے اور ان کے اندر چھپی مختلف صلاحیتوں کو جانچنے کے لیے، نفسیاتی تجزیات درانی صاحب کرتے ہیں۔ اسی طرح حیوانی دنیا بھی اپنے اندر ایک کائنات رکھتی ہے جس میں بے شمار اسرار اور فوائد ہیں۔ کچھ انسانوں کے لیے خطرناک بھی ہیں مگر کسی نہ کسی طرح ان میں بھی پلس پوائنٹس ہیں۔"

"تو اس ریسرچ سے فائدہ......؟"

"اگر دیکھا جائے تو ریسرچ میں ہی سب راز پوشیدہ ہیں۔ خدا نے کائنات بنا کر انسان کے حوالے کر دی ہے کہ اس کو جھنجھوڑو، الٹو، پلٹو، دیکھو اور نکالو اس میں جو کچھ ہے اور زمین ابھی تک نجانے کیا کیا اگلتی آ رہی ہے پہاڑ اپنے اندر کیا کیا چھپائے بیٹھے ہیں۔ سب ریسرچ سے ہی باہر نکلے ہیں اور صحیح انسان بھی تو ریسرچ سے ہی باہر آتا ہے۔ کیا آپ نے ریسرچ نہیں کی......؟" فریدی صاحب نے ایک دم پوچھا۔

وہ ایک لمحے کو چونکی۔

''حیران مت ہوں ہم نے تو ابھی چھوٹے پیمانے پر ریسرچ کی ہے۔ دنیا میں تو نجانے کیا کیا کام ہو رہے ہیں۔ ہر جگہ کائنات آپ کو حیران کرنے کے لیے کھڑی ہے۔ مثلاً عالم کواکب کی طرف آئیں تو وہ بھی انسانی عقل کو حیران کرنے کے لیے تیار ہیں۔ سیارے، ستارے، آفتاب، ماہتاب سب اپنی اپنی ذات میں مختلف اور بے مثال خوبیاں لیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض کا نور سرخ، سفید، زرد اور کئی رنگوں کا ہے۔ بعض کا نور اصلی ہے جیسے آفتاب کا اور بعض دوسروں سے نور حاصل کرتے ہیں جیسے قمر اور باقی سیارے۔ بعض میں حرارت کی بالکل ہی رمق نہیں، بعض بہت گرم ہیں اور بعض بہت سرد، بعض میں دوسروں کی وجہ سے گرہن ہے اور کچھ میں سرے سے یہ خصوصیت ہے ہی نہیں۔ پھر قوانین قدرت کے نہایت مستحکم نظام کے تحت یہ مختلف برجوں اور منزلوں میں طرح طرح کی گردشوں اور حرکتوں کے ساتھ چل رہے ہیں۔ جن سے اوقات کا تعین ہوتا ہے۔ کوئی منزلیں اور راستے متعین کرتے ہیں، یہ برسوں، مہینوں دنوں اور گھنٹوں کا پتہ بتاتے ہیں۔ ان کی ترتیب عقل کو دنگ کرتی ہے اس کے علاوہ ان میں مخلوقات یعنی نباتات، حیوانات، معدنیات کے ذخائر بھی موجود ہیں جن کی پرورش ان کے انوار کی حرارت سے ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق ہر ایک کو غذا بھی مہیا کی جاتی ہے۔ اسی طرح آسمان پر تیرتے ان بادلوں کی بھی دس بڑی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں تین قسم کے بادل کافی بلندی پر ہوتے ہیں دو قسم کے متوسط بلندی پر، تین قسم کے نہایت کم بلندی پر، دو قسمیں ایسی ہیں جو نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہیں اور ان کی بلندی بعض اوقات کئی میل ہوتی ہے اوپر کے بادلوں میں اتنی ٹھنڈ ہوتی ہے کہ پانی کے بخارات منجمد ہو کر برف کے تراشے بن جاتے ہیں۔ اس لیے ان سے بارش ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ متوسط بادلوں میں سے ایک قسم اور زیریں بادلوں میں دو قسمیں ایسی ہیں جن سے بارش ہونے کا امکان ہوتا ہے۔

اسی طرح کائنات کی جانب دیکھو تو پتا چلتا ہے کہ تمام مخلوقات کے لیے ہوا کس قدر ضروری ہے اس لیے زیادہ مقدار میں اس کو مہیا کیا گیا ہے ہوا کی بھی کئی اقسام اور افعال ہیں کہیں شرقی، غربی، خشک، تر، گرم، سرد، مرطوب، نرم، کہیں رات کو اور کہیں دن کو چلتی ہے۔ کہیں بے قاعدہ اور کہیں باقاعدہ چلتی ہے۔ کہیں آہستہ کہیں جھکڑوں کی صورت میں۔ کہیں اس کی چال کی تیزی فی گھنٹہ سات میل سے لے کر اکانوے میل تک ہوتی ہے، کبھی اتنی تیز و تند کہ فی گھنٹہ ایک سو بیس میل یا اس سے بھی زیادہ۔ کہیں گرد باد اور بگولے ہوتے ہیں کہیں بادلوں کو ہانکتی ہے کہیں حرارت کو لطیف کرتی ہے کہیں بیج اڑا کر بکھیرتی ہے کہیں سمندروں میں، جہازوں کو چلنے میں مدد دیتی ہے الغرض جدھر دیکھو کائنات کو انسان کے لیے مسخر کیا گیا ہے۔

''بادلوں میں گرج چمک کیسے پیدا ہوتی ہے؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں...... ان کی بناوٹ بہت عجیب ہے، ان میں رعد و برق بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس میں سائنسی نقطہ یہ ہے کہ نور اپنی حرارت اور حرکات کی وجہ سے اور رعد اپنی کپکپانے والی حرکات کے باعث پانی کو پگھلاتے ہیں اور پھر بارش کا پانی برستا ہے جس میں انسانوں کے لیے فائدہ ہی فائدہ ہے۔

اسی طرح جو برف سارا سال پہاڑوں پر گرتی ہے اور نشیبوں میں جمع ہوتی رہتی ہے بالآخر اپنے مسکن سمندر کی جانب جاتی ہے جہاں ایک اور جہان آباد ہے اور پھر سمندر کے پانی کو ہر وقت متحرک اس لیے بنایا گیا ہے کہ اگر وہ ساکن ہو جائے تو اس میں تعفن پیدا ہو جائے اور اس کے اندر مخلوق ایک لمحہ بھی زندہ نہ رہ سکے اور سمندر کی لہریں بڑے بڑے جہازوں کو چلنے میں مدد دیتی ہیں اور اس میں ایک اور قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے، ہر مہینے چاند کی چودھویں کو جب چاند اپنے عروج پر پہنچتا ہے تو اس سے خاص قسم کی کشش خارج ہوتی ہے۔ اس کشش سے سمندر کی لہریں بہت متحرک ہو جاتی ہیں اور اوپر چاند کی طرف لپکتی ہیں ان کی اٹھان بہت اونچی اور تیز ہوتی ہے اگرچہ کشش تو ایک سی ہوتی ہے مگر زمین اس کشش کو اتنا قبول نہیں کرتی جتنا کہ پانی۔ اگرچہ سورج سے بھی ایسی ہی کشش نکلتی ہے مگر دوری کی وجہ سے اس کا اثر نہ زمین پر ہوتا ہے نہ سمندر پر۔ اب سمندر کتنا وسیع ہے اور اس کے اندر مخلوق بھی بہت زیادہ ہے۔ اس مخلوق کی زندگی کی ضمانت لہروں کے بہت زیادہ متحرک ہونے میں ہے۔ چنانچہ چاند کی کشش کے باعث یہ لہریں بڑی بڑی چٹانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں اور لہریں آزادانہ طریقوں سے حرکت کرتی ہیں اور پھر اس میں انسانوں کے لیے بھی معاشی فوائد ہیں کہ بڑے بڑے ٹینکوں میں پانی جمع کر دیا جاتا ہے اور ہائیڈرو الیکٹرک پلانٹ اور بڑے بڑے جنریٹرز بھی اس کی مدد سے

چلتے ہیں اور اس طریقہ سے توانائی یعنی بجلی حاصل کی جاتی ہے۔

جس طرف نگاہ دوڑاؤ قدرت کے خزانے بھرے ہوئے ہی نظر آتے ہیں۔
پہاڑوں کو دیکھو تو کئی طرح کے پہاڑ، کہیں سنگلاخ، کہیں دیو قامت، کہیں پوٹھوہاری بھربھری مٹی کے اور ان کی ڈھلوانوں پر دیوقامت درخت، کہیں پر سبزہ، کہیں برف پوش چوٹیاں، آتش فشاں، پھر ان میں چھپی دھاتیں، معدنیات...... ہر ایک کا مخصوص فعل ہے، فائدہ ہے۔ زمین کا معتدل حالت میں ہونا کہ زندگی صحیح طریقے سے پنپ سکے، اگر زمین پتھر کی طرح سخت ہوتی تو اس میں اتنی چیزوں کی صلاحیت نہ پائی جاتی۔ نرم ہوتی تو مخلوق کے قدم ہی اندر دھنسے رہتے۔ الغرض سارا نظام اتنا Compact ہے کہ جس جس پہلو کو بھی لے کر انسان تحقیق کرنا شروع کرتا ہے زندگیاں اس میں گزر جاتی ہیں مگر اسرار ہیں کہ کھلتے ہی چلے جاتے ہیں اور وہ اس تحقیق کو باقاعدہ ایک مخصوص علم کا نام دے کر اس کو مختلف شاخوں میں تقسیم کر کے واپس لوٹ آتا ہے اور آنے والے لوگوں کے لیے راستہ بنا آتا ہے۔ پھر دوسرے تحقیق کرتے ہیں۔ اسرار تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح مختلف علوم جنم لیتے ہیں۔ ذہن ہموار ہوتے ہیں۔ انسان کی عقل اور شعور پختہ ہوتی ہے۔ سوچ نئی نئی جہتیں دریافت کرتی ہے اور انسان کائنات کو تسخیر کرنے کے لیے اور زور وشور سے بھرپور قدم اٹھاتا ہے۔ ہم بھی اسی جدوجہد میں ہیں کچھ نہ کچھ تو ضرور ملے گا پھر اس بات پر بھی یقین ہے کہ جب انسان کسی نیک کام کا ارادہ کر کے ہمت باندھتا ہے تو پھر راہوں پر راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ صرف ارادہ شرط ہے۔" فریدی صاحب نے اسے تفصیلاً بتایا۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی ہے یہ سب دیکھ کر......" وہ مسکرا کر بولی۔

"اصل میں سوچ کی ترقی میں ہی انسانیت کی ترقی ہے۔ اچھی سوچوں اور نظریات کو پروان چڑھانے کے لیے جو بھی موقع ملے ضروری حاصل کرنا چاہئے۔" درانی صاحب بولے۔

"اس کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ ان دنوں جو آپ بہت مایوس ہوئی تھیں۔ کائنات کو دیکھنے سے مایوسی ختم ہوتی ہے۔ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کائنات کا اتنا کچھ صرف اور صرف انسان کے لیے ہے۔ تو یہ سوچ اس کا مان بڑھاتی ہے اس کے اندر عزت اور فوقیت کا احساس، اردگرد کی پریشانیوں اور مایوسیوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔" فریدی صاحب مسکرائے۔

جواباً وہ بھی مسکرائی۔ اس کے اندر ایک اور دروازہ کھلا تھا۔ جس نے اسے اپنے خالق کے اور قریب کر دیا تھا۔ بے شک اس کی قدرت میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں قرآن نے یونہی تو دعویٰ نہیں کیا۔ اس کی ہستی پر اس کا اعتماد اور پختہ ہو گیا۔

......☼......

(32)

وہ گھر لوٹی تو قدرے مطمئن تھی اور ذہن بھی بہت آسودہ تھا۔ مگر جیسے ہی اندر داخل ہوئی تو ایک چیز کی کمی اس نے شدت سے محسوس کی پہلے وہ ہمیشہ ڈری ڈری گھر داخل ہوا کرتی تھی۔ مما ہمیشہ بے صبری سے انتظار کرتی تھی اور اس کے آتے ہی اس پر برس پڑتی تھی مگر آج اسے کوئی بھی پوچھنے والا نہ تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔ زندگی کے آخری دنوں میں مما پاپا اسے بہت پیار کرنے لگے تھے۔ اسے ماں شدت سے یاد آنے لگی ان کا پیار ان کی ڈانٹ، پاپا کی خفگی وہ جتنا یاد کرتی اتنی ہی محبت اور شدید ہونے لگی۔ وہ وہیں صوفے پر آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ کافی دیر بعد بیدار ہوئی تو بھوک بہت ستا رہی تھی اس نے ملازمہ کو کھانا لانے کو کہا۔

''بی بی جی کھانے کے لیے تو کچھ بھی نہیں۔ نہ آپ نے کچھ پکانے کو کہا اور نہ کوئی پیسے دیئے میں کہاں سے پکاتی؟'' اس جواب کا اسے زندگی میں پہلی بار سامنا ہوا تھا ورنہ اس سے قبل کسی چیز کی نہ فکر تھی نہ ہوش...... اب زندگی کے یہ تقاضے بھی پورے کرنے پڑیں گے اس نے کرب سے سوچا۔

''فریج سے کچھ لے کر پکالیتی......'' اس نے پریشانی سے کہا۔

''بالکل خالی ہے جی...... آپ جہاں جاتی ہیں اتنا ٹیم لگا دیتی ہیں، ضرورتوں کا تو آپ کو خیال ہی نہیں، میں کیا کروں۔ بندے کو اور بھی ہزار کام کرنے ہوتے ہیں۔ اب میں تو لانے سے رہی۔'' نجانے وہ کب سے بھری بیٹھی تھی سارا زہر ایک دم اگل دیا۔

ضحیٰ ان لہجوں کی عادی نہ تھی، بشیراں نے کبھی اونچی آواز میں اس سے بات تک نہ کی تھی اور یہ کیسے پٹر پٹر بول رہی تھی۔

''اپنے کام سے کام رکھا کرو...... زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں اور سنو مجھے یہ

لہجہ بالکل پسند نہیں...... یہاں رہنا ہے تو اپنے آپ کو بدلو'' وہ بھی غصے سے بولی۔

بھوک اسے مسلسل ستا رہی تھی اور باہر جانے کو اس کا بالکل دل نہ چاہ رہا تھا۔ مجبوراً گئی اور کھانا پیک کروا کر لائی۔ واپس آئی تو حسن اس کا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ میں پہلی دفعہ یوں کھانا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ زرینہ نے ساری کہانی اسے پہلے ہی سنا دی تھی۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے فون کر دیا کرو'' حسن ناراضگی سے بولا۔

''نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں......'' وہ خشک لہجے میں بولی۔

''تم ہمیشہ مجھے اپنے آپ سے جدا سمجھتی ہو......'' حسن نے شکایتاً کہا۔

''زرینہ کھانا لے آؤ......'' اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اس کو آواز دی۔

''چلو کھانا کھالو......'' اس نے حسن کو کہا۔

''مجھے بھوک نہیں۔''

''تھوڑا بہت......''

''کہا نا مجھے بھوک نہیں......'' وہ بھی تلخ ہونے لگا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہ دینے کی قسم کھا رکھی ہے۔'' حسن غصے سے بولا۔

''میرے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں۔'' وہ بھی اس لہجے میں بولی۔

''ضحیٰ تم جس کرائسس سے گزر رہی ہو مجھے سب علم ہے۔ آخر تم شیئر کیوں نہیں کرتی۔'' حسن پھٹ پڑا۔

''کوئی کرائسس نہیں بس حالات کا ہیر پھیر ہے۔ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ کبھی آسودگی تو کبھی بد حالی...... اچھا وقت ہو تو انسان قہقہے لگائے اور برا ہو تو سب کو رو رو کر بتائے۔ تم کیا چاہتے ہو...... کہ میں رو رو کر تمہیں بتاؤں'' وہ بھی اسی لہجے میں بولی۔

''میں صرف چاہتا ہوں کہ تم ہر بات ہر دکھ مجھ سے ڈسکس کر لیا کرو۔ شیئر کرو۔''

''بہت سی باتیں شیئر کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''اس کا مطلب ہے تم کسی پر بھی ٹرسٹ نہیں کرتی یا واقعی میں تمہارے اعتماد کے قابل نہیں۔''

''اس کی کیا گارنٹی ہے کہ جس پر ہم ٹرسٹ کرنے جا رہے ہیں اس کو بھی اپنے اوپر اعتماد ہے کہ نہیں کیا وہ واقعی ہی اس قابل ہے کہ آنکھیں بند کر کے اس پر اعتماد کیا

جاسکتا ہے......'' وہ اپنی ہی لے میں بولی۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو......؟'' حسن نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

''عام سی بات کر رہی تھی چھوڑو اس بات کو چائے تو پیو گے کہ اب ہمارے حالات پر ترس کھا کر وہ بھی نہیں پی سکتے۔'' اس نے بھرپور چوٹ کی۔

''Dont be silly...... پی لوں گا...... ورنہ......'' وہ بھی طنزیہ مسکرایا۔

''زہر کا گھونٹ......'' وہ تلخی سے ہنسی۔

بہت دنوں بعد آج وہ ہنسی تھی اور حسن اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

''حسن تمہارے بال کتنے سفید ہو گئے ہیں۔'' ایک دم اس نے کنپٹیوں کے پاس تیزی سے سفید ہوتے ہوئے بالوں کو دیکھ کر کہا۔

''اچھا...... یہ تو بہت عرصے کے ایسے ہیں حیرت ہے تمہیں آج احساس ہوا۔لیکن شکر ہے ہوا تو سہی۔ ویسے بھی تم ہر بات دیر سے کرتی ہو۔'' وہ پرمعنی خیز انداز میں بولا۔

''اس کا مطلب ہے بڑھاپا شروع ہو گیا ہے......؟'' وہ مسکرا کر بولی۔

''کب کا...... اب تو شاید ختم ہونے والا ہے'' وہ بھی ہنس کر بولا۔

''تو تم شادی کیوں نہیں کرتے......؟'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''کس سے......؟''

''کسی بھی اچھی لڑکی سے......''

''اور اگر وہ لڑکی نہ ملے تو......'' حسن نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''تو پھر کسی اور سے...... دنیا میں بہت سے اچھے لوگ ہیں۔ ایک سے دنیا ختم تو نہیں ہو جاتی۔''

''لیکن ایسی کمی ہوتی ہے کہ دنیا کا کوئی اور خزانہ اور انسان اس کو پر نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی ہر انسان کا ایک آدرش، ایک سوچ اور ایک نظریہ ہوتا ہے جس کی وہ ساری زندگی حفاظت کرتا رہتا ہے۔ کبھی ان کو اصولوں کا نام دیتا ہے کبھی مصلحتوں کا۔ اسی طرح میری بھی ایک سوچ ہے کہ میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتا جس میں دو انسان ندی کے دو دھاروں کی طرح ساری زندگی ایک ہی سمت چلتے رہیں مگر پھر بھی نہ مل سکیں۔...... ان میں کوئی قدر نہ مشترک ہو کتنی مضحکہ خیز بات ہے...... ہے نا'' اس نے معنی خیز انداز میں اس سے پوچھا۔

''مگر کب تک......؟''

''پتا نہیں کبھی کبھی سوچتا ہوں میری یہ سوچ ہی میرے لیے آزمائش ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی، ویسے بھی بڑھاپے میں ایسے کام زیب نہیں دیتے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ وہ شعر تو تم نے سنا ہے نا۔

ہم محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں فراز
ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھا

وہ متبسم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں زرینہ چائے لے کر آ گئی۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو میں مارکیٹ جا رہا ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''کس لیے......؟''

''بھئی آج برتھ ڈے ہے کسی کی......'' اس نے ٹٹولنے کے انداز میں کہا۔

''کس کی...... لگتا ہے کوئی بہت عزیز ہے'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں یونہی سمجھ لو...... کچھ چاہئے''

''نہیں...... کچھ بھی تو نہیں'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

اور وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

عرصہ ہو گیا تھا اسے برتھ ڈے Celebrate کیے ہوئے۔ ایک لمحے کے لیے اسے پرانا زمانہ یاد آنے لگا جب مما بہت اہتمام سے اس کی سالگرہ مناتی تھی اور ہمیشہ ان لوگوں کو بلاتی تھی جن سے Social Terms اچھے ہوتے تھے۔ ایک تلخی سے چھانے لگی اس نے فوراً ہی اس خیال کو جھٹک دیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد حسن کیک اور سموسے لایا اور اسے پکڑاتے ہوئے بڑی محبت سے برتھ ڈے وش کی۔

وہ حیران اسے دیکھتی رہی۔

''تمہیں واقعی یاد تھی......'' ضحیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں جن سے محبت ہوتی ہے اور جو زندگی میں داخل ہوتے ہیں وہ بہت اہم ہوتے ہیں اور جو اہم ہو جائیں ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں، دکھ...... رنج سب یاد رہتے

ہیں۔ اس سے بہت خوشی ہوتی ہے اور محبت بڑھتی ہے اور جب محبت بڑھتی ہے تو انسان حقیقی خوشی کے زیادہ قریب ہوتا ہے اور وہ لمحے بڑے امر ہوتے ہیں جب انسان حقیقی خوشی حاصل کرتا ہے...... مجھے تو تمہاری زندگی کی سب تلخیاں اور خوشیاں یاد ہیں...... میں کبھی بھی تمہاری برتھ ڈے نہیں بھولا۔ پچھلے تمام سالوں کے کارڈز تمہاری الماری میں پڑے ہیں۔ ہر دفعہ لا کر آنٹی کو دیتا تھا...... اور یہ رہا اس دفعہ کا کارڈ......" اس نے کوٹ کی جیب سے کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

"اس کی چوائس کے عین مطابق...... حسین اور ہلکے رنگوں کا ٹھنڈا میٹھا خوبصورت امتزاج...... کارڈ کی ایک جانب اس نے خوبصورت میں انداز میں تحریر کیا تھا۔

My love for you just
grows and grows
As every day goes by
There's none else in all the world
I've ever loved so dearly
And dear Zoha!
It's love that grows
Daily, weekly, yearly.

حسن کی اس شدید محبت پر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے حسن کی طرف دیکھا وہ بھی متجسس نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی حسن نے بھی مزید رکنا مناسب نہ سمجھا۔

زندگی میں کبھی کبھی کتنے خوبصورت اور پیار کرنے والے لوگ مل جاتے ہیں کہ کاسہ تنگ پڑ جاتا ہے مگر ان کی محبت کے پھول کم نہیں ہوتے...... اب اسے کچھ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا...... حسن جا چکا تھا اسے سخت ندامت ہونے لگی، کس چاہت سے وہ سب لایا تھا اور اس نے اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ وہ ان لمحات میں کتنی کمزور سی پڑ گئی تھی اور وہ اندر سے کتنی کمزور ہے اس بات کو جان کر اسے شدید دھچکا لگا...... کاش انسان کو وہ قوت مل جائے جس سے وہ ان نازک لمحوں پر قابو پانا سیکھ لے...... اس نے دکھ سے سوچا۔

اس نے جلدی سے حسن کو فون کیا مگر وہ گھر نہیں تھا۔ اسے پریشانی ہونے لگی کافی دیر بعد وہ خود ہی آ گیا۔

"تم کہاں تھے......؟ میں نے گھر فون کیا تھا"

"ہاں مجھے پتا ہے......"

"کیسے......؟ تم تو گھر پر نہ تھے......" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"حیرت ہے یہ تم پوچھ رہی ہو...... جو لوگ محبت کرتے ہیں نا وہ محبوب کی ہر ہر بات اور ادا کو جانتے ہیں...... اور تم بھی یہ جانتی ہو...... اب بنو مت" وہ مسکرا کر بولا۔

"لیکن تم تھے کہاں......؟"

"کہیں بھی نہیں یونہی آوارہ گھوم رہا تھا...... تنہا...... اداس" وہ اداسی سے بولا۔

"کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں"

وہ شرارت سے بولی تو دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے...... آج بہت عرصے بعد وہ یوں کافی دیر ہنستی رہی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"آج میں بہت خوش ہوں......" حسن ایک دم بولا۔

"کیوں......؟" وہ چونکی۔

"تمہیں ہنستا دیکھ کر...... ہمیشہ ہنستی رہا کرو" وہ مسکرا کر بولا۔

"اگر ہر دم ہنستی رہوں تو پاگل کہلاؤں گی اور سب سے زیادہ پتھر تم ہی مارو گے۔"

"تم ہمیں پتھر مارنے والوں میں سے سمجھتی ہو یا سمیٹنے والوں میں سے......"

"اچھا اب زیادہ نہ پھیلو...... میں چائے لاتی ہوں......"

"چائے یا کچھ اور......؟" وہ شرارت سے بولا۔

"بکو مت...... بہت عرصہ ہوا چھوڑ دیا سب کچھ۔" وہ بھی اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

"واقعی...... زبردست انقلاب" وہ مسکرا کر بولا۔

(33)

جب سے وہ عملی زندگی کی تلخیوں سے آگاہ ہوئی تھی آہستہ آہستہ تلخ ہوتی جارہی تھی۔ گھر کے لیے بار بار نوٹس پر نوٹس آرہے تھے۔ اس نے حسن کو کچھ نہ بتایا...... اور اپنے طور پر نمٹنے کی کوشش کرتی رہی۔ سارا دن کبھی کہیں جاتی، کبھی کسی وکیل کے پاس...... عجیب مصیبت پڑ گئی تھی۔ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا۔ کاغذات بھی جعلی نکلے...... گھر اسے ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اگر یہ گھر بھی چلا گیا تو وہ کہاں جائے گی۔ یہی سوچ سوچ کر پریشاں تھی۔ اس سے وہ بہت جھنجھلا جاتی تھی کبھی اپنے آپ سے الجھ جاتی کبھی ملازمہ سے اور کبھی کبھی حسن سے بھی تلخ ہو جاتی لیکن ہر تلخی کے بعد شدید احساس ندامت چھا جاتی۔ جب بھی کوئی ایسی بات ہو جاتی نفس شدید ملامت کرتا اور وہ احساس اتنا تکلیف دہ ہوتا کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی۔ وہ لمحے اس قدر گراں گزرتے کہ دنیا کی ہر آسودگی اور خوبصورتی بری لگتی۔ دل بار بار کٹتا...... اور یوں مضطرب ہو جاتا کہ جسم سے باہر نکلنے کو بے تاب ہو جاتا، جس چیز سے بچنے کی کوشش کرتی وہی راہ میں حائل ہو جاتی...... یہ پہلو بھی بہت عجیب سا تھا۔ جس دن وہ کیس ہار کر گھر لوٹی تو بہت پریشان تھی۔ صبح کی وہ بھوکی بھی تھی۔ گھر میں قدم رکھا تو کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کا دماغ ہلا کر رکھ دیا۔

''زرینہ بڑی خوشبو آرہی ہے کیا بات ہے کیا پکایا ہے......؟'' وہ بے دلی سے بولی۔

''اے لو جیسے آپ تو سب کچھ دے کر جاتی ہیں ناں...... میں انتظار کرتی رہی۔
پھر حسن صاحب آئے ان کو بتایا اور وہ سب کچھ لے کر دے گئے ہیں......'' زرینہ غصے سے بولی۔

''کیا کہا...... تم نے حسن سے چیزیں منگوائی ہیں......'' اس کو یوں لگا کہ آج اس کا سارا بھرم اس کا مان ٹوٹ گیا ہو۔ اس کی انا کو شدید ٹھیس لگی تھی۔

''ہاں تو اور کس کو بتاتی...... وہی آتے ہیں ان کو ہی بتانا تھا؟'' وہ بھی اپنی لے میں بولی۔

اس کا لب و لہجہ اس کے اندر خنجر کی طرح پیوست ہو رہا تھا۔

''تمہیں کیسے جرأت ہوئی کہ میری ذاتیات میں یوں دخل اندازی کرتی پھرو اور سنو صبح تم مجھے اس گھر میں نظر مت آؤ۔'' وہ اتنے غصے میں تھی کہ قریب تھا کہ اس کے منہ پر تھپڑ لگا دیتی لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔

اس رات کچھ ذلت کا احساس بھی بہت شدید تھا اور کچھ ندامت کا بھی۔ ساری رات وہ روتی رہی...... نہ کچھ کھایا نہ پیا۔

صبح صبح زرینہ اسے بتانے آئی کہ وہ جارہی ہے۔ تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کہاں جارہی ہو......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کہیں بھی...... مگر یہاں نہیں'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''دیکھو مجھے معاف کردو...... میں بہت غصے میں آگئی تھی......''

''کوئی بات نہیں ہم تو عادی ہو جاتے ہیں ایسی جھڑکیوں اور ایسی ڈانٹ کے۔'' وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بولی۔

''تم کہیں نہیں جاؤ گی...... میرے پاس رہو گی...... بس تم کسی سے کچھ نہ کہا کرو۔ چاہے ہمارے گھر کے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہو جائیں...... زیادہ سے زیادہ ہم بھوک سے مر جائیں گے...... اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے......'' اس نے پیار سے اسے سمجھایا۔

وہ اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی...... ذہن کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ اب وہ بھی تو اس گھر میں چند دنوں کی مہمان تھی...... اور شادی کا جو فیصلہ اس نے کیا تھا وہ ان حالات میں حسن کو نہیں بتانا چاہتی تھی جب حالات سازگار ہوں گے تب وہ حسن سے شادی کرے گی...... جب سے اس نے یہ فیصلہ کیا تھا حسن کو کوئی بھی گھریلو مسئلہ بتانے سے کتراتی تھی۔ نجانے کیوں اس کی انا آڑے آجاتی تھی۔

وہ بہت پریشان تھی جب میاں جی کے پاس چلی آئی۔ آج وہ اکیلے تھے۔

''میاں جی...... میں بہت پریشان ہوں...... زندگی بہت تلخ ہوتی جارہی ہے۔ ایسی

ایسی مصیبتیں آرہی ہیں کہ کبھی کبھی میرا دل کہیں فرار کو چاہتا ہے۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"ایسا سوچو بھی مت...... کیا زندگی سے گھبرا کر بھاگنا چاہتی ہو...... اس کا دم بھی بھرتی ہو اور اس سے مایوس بھی ہوتی ہو۔" میاں جی نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا کروں...... جہاں زندگی کی تلخیاں بڑھنے لگی ہیں وہاں مزاج بھی تلخ ہوتا جارہا ہے۔ سوچتی ہوں کہ حجروں اور ڈیروں پر بیٹھ کے حق سے شناسائی طلب کرنا زیادہ آسان ہے یوں انسان ہر لحہ کچوکوں سے اور اندر کے طعنوں سے تو محفوظ رہتا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"نہیں...... جو مخلوق سے دور ہوتا جائے وہ خالق کو کس طرح پائے گا۔ دنیا کی ان دلفریبیوں کو اور مصیبتوں کو کچھ نہ سمجھ کر زندگی گزارنا ہی تو اصل بات ہے۔ حجروں میں رہنے سے کبھی اس ذات سے شناسائی نہیں ہوتی یہ تو بہت بعد کی بات ہے...... اس کو ڈھونڈو دوپہروں میں...... اس کی تخلیقات میں...... دلوں میں...... دکھوں میں...... تکلیفوں میں...... مسکراہٹوں میں...... جب انسان یہ مرحلہ سر کر لیتا ہے اور دنیا کو قدموں تلے روند ڈالتا ہے تو چاہے پھر حجروں میں رہے یا صحرا میں...... دیا جل چکا ہوتا ہے شمع کی لو بھڑک چکی ہوتی ہے...... اب اس کی قید نہیں ہوتی کہ دیے کو طاق میں رکھے یا ہتھیلی پر۔ اس نے تو اب جلنا ہی ہے ہر حال میں۔ جب انسان اسرار کی حقیقتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اصل کو پالیتا ہے تو پھر کس چیز کی تمنا رہ جاتی ہے۔ جب رضا حاصل ہو جاتی ہے تو پھر دنیا کی کیا پرواہ......؟ لیکن رضا یونہی تو حاصل نہیں ہوتی...... وہ تو ذات کی نفی کر کے ملتی ہے۔ خواہشوں کو تج کر، جب ذات کا شعور حاصل ہوتا ہے تو دنیا سمٹ کر ایک حقیر ذرہ بن جاتی ہے۔ پھر جو مانگو ملتا ہے مگر نفی کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ پھر کچھ بھی طلب کرنے کو دل نہیں چاہتا سوائے اس کی رضا کے...... اور یہ خودی کی وہ منزل ہے جس کے لیے انسان تخلیق کیا گیا ہے۔ پھر کائنات اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے کیونکہ انسان جب اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اپنے اندر کی مخفی طاقتوں سے آگاہی حاصل کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ پوری کائنات تو خود اس کے اندر ہے خیر، شر، غم، غصہ، نفرت، حسد اور تمام رزائل اور خصائل پر صرف اور صرف محبت قابو پاتی ہے۔"

"کس کی محبت......؟" اس نے نادانستہ سوال کیا۔

"اس کی جو سب پر حاوی ہے...... تم مزاج کو ٹھنڈا رکھا کرو اور حقیقت جاننے کی کوشش میں لگی رہو یہ اسرار تو زندگی کی آخری سانسوں تک کھلتے رہتے ہیں۔"

"کس کی حقیقت......؟" اس نے جاننے کے باوجود بھی سوال کیا۔

"خدا اور انسان کی...... خدا جو نور ہے اور جس کے نور سے انسان حرکت پاتا ہے اور اس کا گوشہ گوشہ یوں منور ہوتا ہے جیسے شمع سے کوٹھڑی کی تاریکی دور ہوتی ہے۔ کبھی اس کی مہربانیوں اور عطا کو سمجھو اور انسان کی کوتاہیوں کو بھی نظر میں رکھو۔"

"کبھی کبھار تو غصہ بالکل ہی قابو سے باہر ہو جاتا ہے......" وہ پوری سچائی سے بولی۔

"ہاں...... نفس میں ہر جذبہ لہروں کی مانند موجود ہے اتنا ہی توانا، پر جوش اور طاقتور جتنی کہ لہریں، جب کسی بھی جذبے کو اس کی اصلی ہیئت میں بغیر کسی روک ٹوک کے بہنے کی اجازت دے دی جائے تو وہ قابو سے باہر ہوتا جاتا ہے اور پھر اس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تمام منفی جذبوں کو قابو میں رکھنا ہی اصل فتح ہے۔ جب انسان تمام لگامیں اپنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ ان شوریدہ سر جذبوں پر عقل سے بند باندھنے کی کوشش کرو ورنہ یہ پہلے سے بھی زیادہ شور اور طاقت سے سر اٹھائیں گے۔"

"درانی اور فریدی کے ساتھ جہاں گئی تھی وہاں کیا دیکھا......؟" انہوں نے اچانک سوال کیا۔

"بہت کچھ...... یوں لگا کہ چند گھنٹوں میں پوری کائنات کا مطالعہ کر لیا ہو۔ ان لوگوں کی کاوشیں واقعی قابل قدر ہیں۔ سوچتی ہوں کئی ایسے لوگ اندر ہی اندر "انسانیت" کی بقا کے لیے کوشاں ہیں۔" اس نے حیرت سے جواب دیا۔

"ہاں نجات ہی انسانیت میں ہے...... تم نے دیکھا کہ قدرت نے چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز جو اس کائنات میں سانس لے رہی ہے صرف اپنی مخلوق کے لیے تخلیق کی ہے۔ زمین کو بے بہا خزانوں سے صرف مخلوق کے لیے ہی بھرا ہے اور ان خزانوں کو تسخیر کرنے کا اختیار بھی انسان کو دیا ہے۔ تو جب انسانیت ہی بھٹک رہی ہو...... ذلتیں، رسوائیاں ان کا مقدر ہو جائیں جب ہر جگہ ان کے حقوق کچلے جا رہے ہوں، عزتیں محفوظ

نہ ہوں کھانے کو نوالہ نہ ہو رہنے کو کوئی چھت نہ ہو تو ایسی انسانیت کے لیے نہ مذہب کوئی اہمیت رکھتا ہے نہ فلسفہ نہ طب نہ سائنس کی ترقی۔ جب انسانوں کی بنیادی ضروریات ہی پوری نہ ہو رہی ہوں تو ان کو نظریات، ارتقاء اور تسخیر سے کیا کام...... ان کے لیے تو کائنات سمٹ کر ایک ناقابل بیان تلخ حقیقت رہ جاتی ہے، پھر کوئی چیز...... کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ رسوا اور غیر محفوظ انسان کہاں سے شعور لائے۔ کہاں سے حق کو ثابت کرے...... کہاں آدرش پالے...... لاکھ سائنس ترقی کرے جب تک انسانیت دکھ میں مبتلا رہے گی کچھ فائدہ نہیں ہوگا...... کوئی ترقی نہیں کر سکے گا...... بھوکے ننگے، پیٹ کہاں سے ذہنی ارتقاء اور شعور لائیں...... انسانیت کی فلاح اور اس کی ترقی ہر ریسرچ اور سائنس کا مقصد ہونا چاہیے اب دیکھو کہ ''دنیا میں جتنے بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے وہ معاشی تنگ دستی اور بدحالی سے تنگ آ کر انسانوں نے شروع کیے...... جیسے French Revolution''

''ہاں...... اور پھر یکے بعد دیگرے بے شمار لوگوں نے کافی نظریات دیئے جیسے Fascism[20]، Socialism[21]، Communism[22]، Marxism[23]، Scholasticism[24]، Solipsism[25]، Transcendantalizm[26]، اور اسی طرح بے شمار۔ اصل میں جہاں اور جب کبھی انسانوں کا بہت زیادہ استحصال شروع ہوتا ہے تو لوگ کسی نہ کسی طرح اس سے نجات حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں۔ پھر انقلابی روحیں مل جاتی ہیں اور اس طرح دنیا میں انقلابات آتے ہیں۔ بہرحال اس دنیا کا سب سے بڑا شاہکار اور معجزہ، تو انسان ہی ہے۔ جب وہی رسوا ہوگا تو کیسی ترقی......؟ اس لیے ایک انسان کو دوسرے کی عزت کرنی چاہیے۔ اس کے رتبے کی وجہ سے نہیں...... اس کے انسان ہونے کے ناتے سے۔'' اور اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا، ان کو اپنی غلطی کا پھر احساس ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میاں جی نے اس کی غلطی پکڑ لی ہو اور مبہم انداز میں اس کی سرزنش بھی کر رہے ہوں۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ اٹھ آئی اور سینے پر بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔

(34)

گھر خالی کرنے سے پہلے وہ کوئی معقول گھر حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے وہ پراپرٹی ڈیلرز کے پاس چکر لگا رہی تھی۔ اس دن بھی وہ صبح سے نکلی تھی اور دوپہر ہونے کو آ رہی تھی جب اس کا گزر ایک ہاسپٹل کے پاس سے ہوا اسے یوں لگا جیسے وہاں حسن کھڑا ہو...... وہ گھبرا گئی اور گاڑی ریورس کی اور قدرے بھاگتے ہوئے اس کے پاس گئی۔

حسن...... تم یہاں کیسے......؟'' وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

''ضحیٰ...... تم'' حسن نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں...... میں...... لیکن تم بتاؤ تم یہاں کیوں......؟'' اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ارے بابا...... ریلیکس...... دم تو لو...... ایسی کوئی بات نہیں...... مگر تم بتاؤ، تم یہاں کیسے آئی......؟'' اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''تم میری چھوڑو، اپنی بتاؤ...... تم یہاں کیسے اس ہاسپٹل میں آئے ہو؟''

''پلیز مجھے جلدی بتاؤ...... ورنہ؟''

''ورنہ...... کیا......'' اس نے معنی خیز نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔

''میں تمہارے اس انداز سے سخت عاجز ہوں...... جب بھی کوئی ایسی سچوایشن ہوتی ہے خواہ مخواہ ہی بات کو لٹکاتے ہو...... میں جو پوچھ رہی ہوں وہ بتا نہیں رہے اور الٹی سیدھی ہانک رہے ہو...... اگر نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ میں پھر تم سے ملنے کبھی نہیں آؤں گی۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''بے فکر رہو اب بار بار تردد نہیں کرنا پڑے گا'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''کیا مطلب......؟'' ضحیٰ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں شاید موت کی طرف سفر ہو چکا ہے......" وہ سانس کھینچ کر بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو...... کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ انتہائی بے یقینی سے بولی۔

"مجھے ڈاکٹروں نے کینسر بتایا ہے...... شاید کچھ دن نکل جائیں...... شاید نہیں،" وہ بہت حوصلے سے مگر آہستہ آہستہ بولا۔

"نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا......" وہ بے بسی سے بولی۔

"کیوں نہیں ہوسکتا...... میں انسان ہوں اور انسانوں کے ساتھ کیا نہیں ہوتا اور اس دنیا میں جتنی Uncertain life انسان گزار رہا ہے کوئی اور نہیں اور آج کل کے دور میں Survive کرنا کتنا مشکل ہو گیا ہے یہاں تو کسی چیز کی کوئی گارنٹی ہی نہیں۔" وہ اپنا حوصلہ یکجا کرتا ہوا بولا۔

"لیکن اتنی جلدی یہ سب...... یہ نہیں ہوسکتا" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"جلدی کیا یا دیر کیا...... جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے اور جو نہیں ہونا ہوتا چاہے لاکھ کوشش کرو نہیں ہوتا...... جتنا انسان نے سمیٹنا ہوتا ہے صرف اتنا ہی سمیٹتا ہے اور چلتا بنتا ہے اور جو نہیں سمیٹ سکتا چاہے اس کے لیے لاکھ سر پٹخے کتنی بھی خواہش کرے کچھ نہیں ملتا۔ صحیح میں جیسے جیسے موت کے قریب جارہا ہوں مجھ پر ایسی ایسی حقیقتیں کھل رہی ہیں کہ میں خود ہی حیران ہورہا ہوں...... ایسی سچی اور تلخ کہ میں سوچتا ہوں کہ میں نے پہلے کبھی کیوں ان کے بارے میں نہ سوچا تھا۔" وہ ایک دم موڈ بدلتے ہوئے بولا۔

"کیسی حقیقتیں......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ انسان اس دنیا میں کس قدر بے بس ہے...... قدرت نے اس کو وسیع دائرے کے اندر کھڑا کر دیا ہے اور وہ دیوانہ وار دائرے کے اندر بھاگتا رہتا ہے اور دائرے کے اندر دوڑ کو کبھی اپنی محنت کا نام دیتا ہے کبھی اپنی کوشش کا اور جب کبھی دائرے کے اندر اوپر ٹیلوں پر چڑھتا ہے تو اسے اپنی خوش قسمتی کا نام دیتا ہے اور اس خوش بختی کے نشے میں وہ بار بار اس دائرے کو پھلانگنے کی کوشش کرتا ہے مگر منہ کے بل گرایا جاتا ہے اور اس کو بتایا جاتا ہے کہ یہ تمہاری قسمت کی باؤنڈری لائن ہے جس کو تم کبھی بھی پار نہیں کرسکو گے...... بس یہی ہے انسان...... یہی ہیں اس کے اختیارات...... اور جب وہ قسمت کے ہاتھوں بار بار گرایا جاتا ہے تو اس کی وقعت اس کی حقیقت خود اس پر عیاں ہوتی ہے کہ وہ کیا ہے...... محض ایک ذرہ...... ایک بے حقیقت وجود جس کو چاہے تو قدرت اس طرف لے جائے چاہے تو اُس طرف...... چاہے اس پر بادنسیم چھوڑ دے چاہے [illegible] کے بگولے...... چاہے اس پر موسلا دھار مینہ برسائے چاہے پھوہار یا پھر بجلی کی کڑک وہ کچھ بھی نہیں...... محض پانی کا بلبلا......" وہ افسردگی سے بولا۔

وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھتی رہی...... حسن جس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں تھیں...... آج کس طرح تلخ سچ کو بیان کر رہا تھا...... وہ رونا شروع ہو گئی۔

"تم کیوں رو رہی ہو...... اپنے حواس پر قابو رکھو...... میں تمہارے لیے کبھی بھی اہم نہیں تھا...... اور شادی کبھی بھی نہیں کرسکوں گا۔ خیر مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں، تمہاری اپنی کمٹ منٹس ہیں۔ مجھے صرف یہ افسوس رہے گا کہ تم نے مجھے کبھی اس قابل نہیں سمجھا کہ اپنی Fellings اور Emotions مجھ سے شیئر کرتی۔ خیر یہ بھی قسمت کی بات ہے۔ بعض لوگوں کو بن چاہے اتنا مل جاتا ہے کہ سمیٹنے کے لیے جگہ نہیں رہتی اور بعض ساری زندگی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترستے رہتے ہیں اور جب مشکل سے کوئی خوشی ملتی ہے تو وہ اپنا مفہوم کھو چکی ہوتی ہے۔ پھر وہ خوشی نہیں رہتی بلکہ نامکمل خواہشات کی کسک کی صورت میں ہمیشہ چبھتی رہتی ہے۔ کتنی عجیب سی بات ہے کبھی کبھی ہم لاحاصل جذبوں کے پیچھے اتنا بھاگتے ہیں کہ پاؤں شل اور ہمتیں جواب دے دیتی ہیں۔ مگر طلب پھر بھی کم نہیں ہوتی کیا انسان پھر پہلے والا ہوسکتا ہے جو ان چیزوں کی خواہش سے پہلے ہوتا ہے...... شاید کبھی نہیں۔" وہ نجانے کیا کچھ اپنی ہی لے میں بولتا جارہا تھا۔

"حسن خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں تم کیوں اتنے ناامید اتنے مایوس ہو گئے ہو۔" وہ قدرے روہانسی ہو کر بولی۔

"اصل میں جب حقائق بہت زیادہ کھلنے لگیں اور وہ بھی تلخ حقائق تو انسان تلخ سچ بولنا شروع کر دیتا ہے جس کو ہم Pessimism کا نام دیتے ہیں...... خیر کیا بتاؤں کہ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں جس کے بارے میں خود ہی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے......" باتیں کرتے ہوئے وہ اسے اپنے کمرے میں لے گیا جہاں ہر طرف ڈسنے والی خاموشی تھی...... کوئی بھی تو اس کے پاس نہیں تھا...... اتنی ویرانی...... اتنی مردنی...... اتنی اداسی...... اتنا دکھ......

"حسن تم یہاں اکیلے ہوتے ہو؟" وہ حیرت سے بولی۔

"نہیں...... انسان اکیلا کب ہوتا ہے اس کے ساتھ اس کی اچھی بری باتیں سب ہوتی ہیں...... ایسے بھیانک وقتوں کے لیے خدا نے انسان کو کتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے...... یہ یادیں......" اس نے گہری سانس لی۔ "امی تو آنا چاہتی ہیں مگر میں نہیں آنے دیتا۔ جب تک چل پھر رہا ہوں ٹھیک ہے جب زیادہ سیریس ہو گیا تو پھر وہ آجائیں گی...... ابھی بھی میں ان کو بھیج کر آرہا ہوں......" وہ بہت حوصلے سے بولا۔

"حسن میں اپنے آپ کو تمہارا مجرم سمجھتی ہوں...... تم نے میرے لیے اپنی زندگی تباہ کر دی...... شاید اس کے لیے میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر سکوں۔" اس نے پہلی بار اعتراف کرنا چاہا۔

"ضحیٰ شکر ہے تمہیں آج اس بات کا احساس تو ہوا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں لیکن مجھے بھی ہمیشہ ایک ہی خواہش رہی ہے وہ ہے چاہے جانے کی کاش تم بھی مجھ سے کہو کہ حسن میں تمہیں اتنا چاہتی ہوں...... اتنی محبت کرتی ہوں...... اتنا عشق کرتی ہوں جتنا خالق مخلوق سے...... دھرتی آکاش سے...... چکور چاند سے...... بھنورا پھول سے...... ہوا خوشبو سے...... آفتاب کرنوں سے...... ہریالی ساون سے...... برکھا بادل سے...... لہریں ساحل سے...... اور ایک دل دوسرے دل سے...... دیکھو تو ہر ایک فنا ہونے کے عمل میں ہے دوسرے کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا ہے...... اور اس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ ایک دوسرے کو کبھی گرفت میں نہیں لے سکے گا...... مگر مسلسل بھاگتا رہتا ہے...... یہاں تک کہ ختم ہو جاتا ہے فنا ہو جاتا ہے...... مگر ازلی محبت کو جو اس کی سرشت میں رچ بس گئی ہوتی ہے کبھی ختم نہیں کر پاتا...... لیکن شاید اس میں بھی تمہاری کوئی مجبوری ہو...... کیونکہ ہر انسان مجبوریوں اور مصلحتوں کے ہاتھوں ہی تو پابند ہوتا ہے...... ورنہ وہ تو اپنی فطرت میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہتا ہے۔ لیکن مجبوریوں کے بند اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ بار بار اس کو پیچھے ہٹنا پڑتا ہے...... مگر یاد رکھو میں اس وقت تک نہیں مروں گا جب تک تم سے اقرار نہ سن لوں"...... اور وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا......

"میں بھی کتنا بے وقوف ہوں...... وہ طلب کر رہا ہوں جس کا دینے والے کو شاید خود بھی یقین نہ ہو بقول شاعر

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ میں کیا چاہتا ہوں

وہ کتنی ہی دیر ہنستا رہا...... یوں لگا کہ کوئی ٹیس اٹھی ہو...... اس کے چہرے پر اتار چڑھاؤ سے آنے لگے...... پھر وہ ایسا خاموش ہوا کہ دوبارہ کچھ نہ بولا اور خاموشی سے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھتی رہی...... آنسو بہاتی رہی اور خالی خالی نظروں سے ہر جانب دیکھتی رہی...... حسن تم جیسے شخص کے لیے یہ کمرہ...... یہ گھٹن...... یہ دیواریں...... یہ بندش بہت نامناسب ہے...... وہ کبھی اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھتی رہی...... کبھی اس کی لمبی گہری سانسوں کو توجہ سے سنتی رہی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہی مجرم تھی...... وہ شکستہ پر طائر کی مانند اندر سے پھڑ پھڑا رہی تھی...... حسن یوں اچانک بچھڑ جائے گا اس نے کبھی نہ سوچا تھا...... ایسا ناقابل برداشت صدمہ...... اور وہ تو اس سے شادی کرنے جا رہی تھی...... اس کو خوشیاں دینے جا رہی تھی...... اور ایسے وقت میں جب کہ وہ بالکل تنہا تھی...... کس طرح اچانک یہ سب کچھ ہو گیا۔ وہ رو دی۔ وہ کافی دیر وہاں بیٹھی رہی...... حسن سو رہا تھا...... پھر وہ باہر نکل آئی برآمدے سے گزر رہی تھی کہ اس کا سامنا ایک عورت سے ہوا جو بلند آواز میں رو رہی تھی...... دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے......

"بی بی سنو...... خدا کے لیے مجھے ایک پانچ سو روپے دے دو میرا بیٹا شدید بیمار ہے اور مجھے اس کی زندگی بچانی ہے...... خدا کے لیے رحم کھاؤ......" وہ اس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگی مگر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔ اس وقت اس کے پرس میں صرف پانچ سو کا نوٹ تھا اور اسے کافی دن گزارنے تھے...... وہ عورت اس کی گاڑی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"نہیں ہیں میرے پاس پیسے...... چھوڑو میرا پیچھا" اور اس نے جھٹکے سے گاڑی سٹارٹ کی۔

حسن بھی تو مر رہا ہے...... میں کس کے پاس جاؤں...... کس سے فریاد کروں...... اس نے دل ہی دل میں سوچا...... آہستہ آہستہ وہ عورت اس کے ذہن سے محو ہوتی گئی اور حسن مضمحل سا۔ بیمار اور پریشان سا اس کے حواسوں پر چھانے لگا...... سارا وقت وہ حسن ہی کے بارے میں سوچتی رہی وہ ساری رات اس کی صحت کے لیے دعائیں

مانگتی رہی...... دوسرے دن وہ صبح سویرے ہسپتال پہنچی تو ہسپتال میں کہرام مچا ہوا تھا۔ وہ سیدھی حسن کے پاس اس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ کمرے میں نہیں تھا...... کافی دیر انتظار کرتی رہی......تھوڑی دیر بعد آیا تو اس کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"تم کب آئی......؟"

"کافی دیر ہوگئی، مگر تم کہاں تھے......؟"

"باہر ہی......"

"اس نے بوکے اور **Get well soon** کا کارڈ اسے تھما دیا......" حسن نے بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تھینک یو......"

"تم باہر کیا کر رہے تھے......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... باہر ایک بچے کی ڈیتھ ہوگئی ہے اس کی ماں بیچاری کل سے بہت پریشان تھی...... دواؤں کے لیے پیسے نہیں تھے۔ سنا ہے بیچاری نے بہت لوگوں کی منتیں کیں لیکن کوئی بھی کام نہ آسکا۔ لوگ کس قدر مجبور اور بے بس ہیں...... اتنے دکھی کہ جینا تک دشوار ہوگیا ہے...... اور دوسرے لوگ کتنے کٹھور اور بے رحم ہیں جو دوسروں کی مجبوریوں کو نہیں سمجھتے...... کس قدر ظالم ہیں یہ لوگ......" وہ آنسو آنکھوں میں بھر کر چھت کو گھورنے لگا۔

ضحیٰ کو یوں لگا کہ چھناکے سے کوئی چیز اندر ٹوٹ گئی ہو...... اس کا رنگ ایک دم پیلا پڑنے لگا...... اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری...... اور بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی...... اس سے جو خطا سرزد ہوئی تھی اس کی چبھن بڑی شدید تھی...... وہ سارا راستہ اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی...... مگر اندر تو ہر جانب شور ہی شور تھا۔ جس نے اس کے سارے وجود کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔

......✿......

(35)

وہ شدید ڈپریشن سے دوچار تھی۔ اس کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے درانی صاحب کو فون کیا مگر وہ گھر پر نہ تھے۔ فریدی صاحب کا فون مسلسل انگیج جا رہا تھا۔ تنگ آکر وہ خود ہی فریدی صاحب کے پاس چلی گئی...... وہ سر جھکائے لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے اس کو دیکھ کر ٹھٹھکے اور سب کو باہر جانے کا مشورہ دیا۔

وہ ان کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ نادم سی شرمندہ سی اور وہ بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے رہے۔

"فریدی صاحب مجھ سے بہت بڑی خطا سرزد ہوگئی ہے۔" وہ قدرے ندامت سے بولی۔

"ہاں جانتا ہوں......" وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔

"کیا کروں...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"میں کیا کہوں...... میرا خیال ہے اب آپ کو خود ہر بات کا احساس ہو جانا چاہیے۔ میں مزید کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ان کے لہجے میں چھپی خفگی کو اس نے شدت سے محسوس کیا۔ تھوڑی دیر وہاں رکنے کے بعد وہ چلی آئی اور میاں جی کے پاس پہنچی مگر اس وقت وہ وہاں بھی نہ تھے...... وہ وہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگی...... مسلسل پریشانی، ندامت، ملامت، اور اندر کی ٹوٹ پھوٹ نے اس کو مکمل طور پر شکستہ کر دیا تھا...... وہ ندامت کے آنسو بہاتی رہی مگر دل کو سکون نہیں مل رہا تھا۔

شام ہوگئی مگر میاں جی کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا۔ وہ گھر نہیں جانا چاہتی تھی جب تک خود میاں جی سے مل نہ لیتی رات ہونے کو آئی تو دو عورتیں آئیں اس کے سامنے کھانا رکھا اور ایک بولی۔

"بی بی...... بیبیوں کے حجرے میں بچھونا لگا دیا ہے چل کر سو رہو۔"

"اچھا......" وہ خاموشی سے اٹھ کر چل دی۔

بغیر کھانا کھائے بستر پر لیٹ گئی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کو بار بار حسن کا لہجہ اور وہ الفاظ یاد آتے تو اور شرمندہ ہو جاتی۔ میں حسن کا سامنا کس طرح کروں گی...... حسن کتنا عظیم انسان ہے...... جس کے دل میں سب کا درد ہے اور وہ اس کے مقابلے میں کتنی کمتر نکلی...... اس خیال سے اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اندر ایک الاؤ روشن تھا جس کے شعلے لپک لپک کر باہر آ رہے ہوں...... اس نے اٹھ کر پانی پیا۔ مگر شعلے اور بھڑک اٹھے...... اس نے ننگے پاؤں نم مٹی پر چلنا شروع کر دیا اور مسلسل اس پر پاؤں مسلتی رہی مگر سکون تو ایک لمحے کو بھی نہیں مل رہا تھا۔

دوسرا دن بھی میاں جی کے انتظار میں گزر گیا جوں جوں انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی جاتیں وہ شدید کرب سے دوچار ہوتی...... کبھی حسن یاد آتا تو رو رو کر اس کے لیے دعائیں شروع کر دیتی۔ حسن یاد آتا تو وہ الفاظ بھی کچوکے دینے لگتے اور پھر ان کے ساتھ ہی اس عورت کی آہ و بکا...... عجیب سی کیفیت سے دوچار تھی۔ اس طرح کی وقتی کیفیتوں سے تو وہ بارہا گزری تھی مگر اب تو اس کا دورانیہ بہت طویل ہوتا جا رہا تھا۔ دکھ، افسوس اور پچھتاوے کے ملے جلے جذبات نے اس کے اندر کے سکون کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ بعض اوقات لمحوں کی خطائیں مستقبل کی کتنی بڑی آزمائش بن جاتی ہیں اس کا اندازہ آج اس کو پہلی بار ہوا تھا۔ اس نے دانستہ تو ایسا نہیں کیا تھا...... وہ تو خود اس لمحے بہت پریشان...... اور منتشر تھی...... مگر خطا تو اس کی ذات سے وابستہ تھی...... اگر وہ اس لمحے حسن کے بارے میں سوچ رہی تھی تو وہ تو سوچ میں تھا...... سامنے تو اٹل حقیقت تھی...... وہ سوچ میں ہی کیوں کھوئی رہی کہ حقیقت کو جھٹلا دیا...... اور اب وہی حقیقت آزمائش بن گئی تھی۔ وہ ہزار طرح سے اپنے دل کو دلائل دے کر سمجھانے کی کوشش کرتی مگر سکون کہاں تھا...... وہ بہت سی وجوہات دیتی مگر بے سود...... اور واقعی بعض اوقات وجوہات اور ہوتی ہیں مگر حالات ان کو اتنا مختلف بنا دیتے ہیں کہ لوگ واقعات جاننے کی بجائے حالات سے ہی نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور یہ سب اتنا یکلخت اور جلدی ہو جاتا ہے کہ انسان نہ تو کوئی دلیل دے سکتا ہے نہ حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے...... اس کے ساتھ بھی تو یہی ہو رہا تھا...... خود حسن جس کی

سوچ میں وہ ڈوبی تھی...... اس نے اسے کتنی باتیں سنا ڈالی تھی۔

رات کو میاں جی آ گئے وہ ان کو دیکھ کر کھل سی گئی...... وہ بھی ایک لمحے کو رکے...... بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔ اسے شدید دکھ سا ہونے لگا...... کیسی کیسی خطائیں ہوتی آئیں تھیں مگر میاں جی نے کبھی اس سے منہ نہ موڑا تھا اور فریدی صاحب نے بھی ہمیشہ اس کو تسلی دی تھی...... اگر میاں جی اور فریدی صاحب جیسے صاحب دل لوگ اس قدر ناراض ہیں تو خدا نجانے کس قدر ناراض ہو گا...... وہ ملامت کے شدید احساس سے دوچار ہونے لگی...... اسے معلوم نہیں تھا کہ لاشعوری میں اس کی بے حسی اس کو یوں شدید دھچکا لگائے گی۔ وہ ساری رات روتی رہی۔

"میاں جی...... میں اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک آپ مجھ سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کریں گے...... میں بہت تکلیف میں ہوں...... ایسی اذیت جس کا اندازہ مجھے پہلی بار ہو رہا ہے...... آپ میرے لیے دعا کیجیے......" وہ قدرے پریشانی سے بولی۔

"مجھے تم پر یہ افسوس ہے کہ تم ان آزمائشی لمحوں کو کیوں نہ سمجھ پائی...... یہ چھوٹی موٹی باتیں ہی تو آزمائش ہوتی ہیں" بالآخر وہ بولے۔

"کیا......؟" وہ حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگی۔

"ہاں تو اور کیا آزمائشیں خود اپنے منہ سے کہتی ہیں کہ ہم آزمائش ہیں۔ باہر کے چھوٹے چھوٹے حالات و واقعات کس طرح انسان کو مضبوط بناتے ہیں یہ انہیں باتوں سے تو پتا چلتا ہے۔ اور جو بار بار لڑھک جائے وہ انسان نہیں ہوتا۔ قدرت کی نظر میں وہی معزز ہیں جو ایک ہی دھارے میں پرزور طریقے سے بہتے چلے جاتے ہیں اور باہر کی آندھی، طوفان...... گرج، چمک، ریت، کنکر ان کے بہاؤ کو نہیں روک سکتے...... بلکہ وہ خود ان کو بہا کر لے جاتے ہیں...... گھر جاؤ اور خدا سے بہتری کے لیے دعا کرتی رہا کرو۔" میاں جی کے لہجے میں تلخی تھی۔

وہ دو دنوں میں اس قدر مضمحل اور کمزور ہو گئی تھی کہ چلنا دوبھر ہو گیا تھا...... نیند پوری نہ ہونے کے باعث بھی سر مسلسل چکرا رہا تھا...... وہ بمشکل گھر پہنچی تو زرینہ اس کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"بی بی جی...... آپ کو کیا ہوا......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں......ایک گلاس پانی کا لاؤ" وہ نقاہت سے بولی۔

وہ جلدی سے پانی لائی۔

"بی بی جی......آپ کہاں تھیں......؟"

"کیوں......؟"

"وہ جی حسن کی امی جان کا بار بار فون آرہا تھا......"

"کب......؟"

"کل بار بار آرہا تھا مگر آج تو کوئی نہیں آیا......"

وہ مضطرب سی ہو کر اٹھی۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اسی کپکپاہٹ میں گلاس اس کے ہاتھ سے گرا اور چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اس نے کرچی کرچی ہوتے گلاس کو بغور دیکھا اور رونا شروع ہوگئی۔

......۞......

(36)

"ضحیٰ کہاں تھی تم......؟ حسن کو آخری بار دیکھنے بھی نہیں آئی" دوسری جانب سے حسن کی ماں بول رہی تھی۔

"کیا مطلب......؟" وہ چونکی۔

"آج اس کے قل تھے...... وہ آخری دم تک تمہارا منتظر رہا...... وہ بہت اذیت میں تھا، بہت تکلیف میں...... کاش تم آخری لمحوں میں اسے دیکھتی......" انہوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑ کر فرش پر بیٹھ گئی...... "حسن آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں بہت تنہا ہو گئی ہوں...... تم تو میری ڈھال تھے...... میرے دکھوں کے ساتھی...... میرے احساسات کو سمجھنے والے...... میری تکلیفوں پر تڑپ اٹھنے والے...... میرے سوئے جذبوں کو جلا بخشنے والے...... میری بند آنکھوں کی روشنی...... تم کس قدر عظیم تھے۔ کتنے خوبصورت انسان...... تمہارا اندر باہر تمہاری آنکھوں کی طرح کتنا شفاف، چمکدار اور خوبصورت تھا...... اور میں...... تمہیں نزع کے عالم میں چند الفاظ تسلی کے نہ کہہ سکی...... کاش تم میرا انتظار کر لیتے......! کاش آخری وقت میں، میں تمہیں خود اپنی ادھوری آرزوؤں، نامکمل خواہشات کے سنگ رخصت کرتی...... اپنے اندر چھپے تمام جذبوں کو تمہاری نذر کرتی...... تم جو سننا چاہتے تھے وہ سب کچھ کہتی...... کاش وقت کا پہیہ کچھ دیر کے لیے رک جاتا...... کاش قدرت تمہیں کچھ مہلت دے دیتی...... میں بالکل تنہا ہو گئی ہوں...... بالکل ٹوٹ گئی ہوں...... تم جو میری ذات کا حصہ تھے اور میری ذات کا محور بھی تھے آج میں اپنے آپ کو بالکل بے خانماں محسوس کر رہی ہوں...... یوں لگ رہا ہے جیسے میرے سر سے چھت اڑ گئی ہو...... میرے ماں باپ آج اس دنیا سے رخصت ہوئے

ہوں...... حسن تم اپنے جذبوں میں بہت صادق نکلے...... تمہارے عشق کی انتہا ہو گئی...... مگر مجھے ساری زندگی ملال رہے گا کہ میں تمہارے لیے اذیت کا باعث بنی رہی۔ کبھی کبھی کس طرح دو انسان ایک دوسرے کے لیے آزمائش بن جاتے ہیں۔ ایک ہار جاتا ہے اور دوسرا جیت جاتا ہے...... حسن تم زندگی ہار گئے...... مگر پھر بھی جیت گئے ہو۔ وہ روتی رہی اور سوچتی رہی۔

وہ تعزیت کے لیے حسن کے گھر گئی...... ہر اٹھتی نظر میں اس کے لیے سوال تھا اور وہ اس سوال کو اچھی طرح جانتی تھی مگر وہ کس کس کو توجیہہ دیتی...... وہ تو خود اتنی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی کہ اب تمام شکستہ حوصلوں کو یکجا کرنا مشکل نظر آ رہا تھا...... حسن کی والدہ مسلسل اسے دیکھتی رہی پھر ایک لفافہ اس کی جانب بڑھایا۔

"حسن جاتی دفعہ تمہارے لیے یہ خط چھوڑ گیا ہے۔" اس کی ماں نے لفافہ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"اب میں چلتی ہوں......" وہ خط لے کر اٹھی۔

"کبھی کبھار آ جایا کرو...... یوں لگتا ہے جیسے حسن میرے سامنے ہو...... اس کی خوشبو اردگرد پھیل گئی ہو...... وہ تم سے شدید محبت کرتا تھا مجھے اس کا اندازہ تھا مگر نجانے کیوں تم دونوں کا ملاپ نہ ہو سکا میں نے تو بہت کوشش کی۔ شاید قسمت کو منظور نہ تھا...... شاید اس نے دنیا میں زیادہ دیر زندہ نہ رہنا تھا اس لیے، مگر آ جایا کرو......" ان کے لہجے میں التجا تھی اور انہوں نے اس کے سر پر پیار دیا۔

اور وہ چلی آئی کمرے میں جا کر اس نے خط کھولا...... خط دو صفحوں میں منقسم تھا۔ شاید آدھا حصہ کچھ دن پہلے لکھا تھا...... اس کی تحریر واضح تھی۔

Dear Zoha,

This isolation and loneliness covering me outside and inside is teasing me a lot. I want to see you and tell you how much my heart is saturated with love for your. Listen

Somebody loves you

Loves your smile

And the heart warming things

That you do

Some body loves the sound

of your voice

And any time

spent with you

Some body loves

your wonderful ways

of seeing things

others don't see

Some body loves

Every thing that you are

You don't know the person who loves you more than you perhaps he's Hasan - - -

Unable to survive more.

دوسری تحریر میں بلا کی شکستگی تھی جو شاید اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ ظاہر کر رہی تھی۔ آڑے ترچھے لفظ بری طرح تڑے مڑے تھے۔

"ضحیٰ آج بھی میں نے سارا دن تمہارا انتظار کیا مگر تم نہیں آئیں...... سمجھ میں نہیں آتا کیوں......؟ اس وقت ہر طرف خاموشی ہے رات بہت گہری ہو رہی ہے۔ شاید میں کل اٹھ سکوں یا نہ...... اس وقت میرے سارے جسم میں شدید درد ہی درد ہے...... کاش تم اندازہ کر سکو کہ میرا دل اس وقت کتنا پھٹ رہا ہے...... اندر باہر طوفان ہی طوفان برپا ہے...... کاش تم بھی مجھے سمجھ سکتی۔ کاش آج کچھ لمحوں کے لیے ہی تم میرے پاس ہوتی...... تو میں تمہیں بتاتا کہ تم میری زندگی کے ان آخری لمحوں میں بھی میری سانسوں کے اندر خون کی طرح گردش کر رہی ہو۔ تم میری سانسوں میں، میری روح میں اس طرح رچی بسی ہو جیسے پھول میں خوشبو، مگر شاید پھول ہمیشہ کے لیے مرجھا جائے۔ مگر وعدہ کرو کہ ہمیشہ

خوشبو کی طرح مہکنا...... میں تمہیں حاصل نہ کر سکا۔ شاید میرے جذبوں کی صداقت میں...... میرے خلوص میں کسی چیز کی کمی تھی۔ میں نے کہا تھا نا کہ عشق کا دوسرا نام فنا ہے...... آج شاید کچھ لمحوں کے بعد میں فنا ہو جاؤں یہ زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے مگر یاد رکھنا کہ کسی شخص نے اپنی آخری سانسوں تک تمہیں اپنے تمام تر جذبوں کی شدت اور خلوص سے چاہا تھا...... مگر تمہیں حاصل نہ کر سکا۔ شاید دنیا میں کچھ باتیں، کچھ چیزیں، کچھ انسان صرف چاہے جانے کے لیے ہی ہوتے ہیں ان کا حصول ناممکن ہوتا ہے اور اگر وہ حاصل ہو بھی جائیں تو اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ اب اس امید پر تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ شاید اگلی دنیا میں ملاپ ہو سنا ہے پاک روحوں کا ملاپ وہاں ہو گا...... اور اگر جذبے صادق ہوں تو آرزوؤں کی تکمیل ضرور ہوتی ہے...... میری خواہش تھی کہ زندگی کے آخری لمحات میں تم میرے سامنے ہوتی...... جب میری آنکھیں بند ہوتیں تو تم میری آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے سما جاتی...... لیکن میری یہ خواہش بھی ادھوری رہ گئی ہے مگر شاید خدا کو ہی منظور نہیں۔ مجھ سے مزید نہیں لکھا جا رہا...... شاید بہت تھک گیا ہوں...... تمہارے لیے بہت سی دعائیں اور پیار...... اک ادھورا انسان"

خط پڑھ کر اس نے والہانہ انداز میں اس کو چومنا شروع کر دیا...... اس قدر شدت کے ساتھ جیسے کبھی وہ اس کی وحشتوں پر حیران ہوتا تھا اور ایسے وقتوں میں ہمیشہ اس کو Extremist کہا کرتا تھا۔

⁂

(37)

وہ اس کی یاد میں ہر وقت روتی رہتی اتنا کہ شاید اپالو (Apollo) بھی ہائی سنتھ کی وفات پر نہ رویا ہوگا...... اگر وہ بھی حسن کی قبر پر جا کر روتی تو شاید کوئی اور پچھتاوے کا پھول اس کی قبر سے رونما ہو جاتا...... مگر وہ تو ہر لحہ بھیگی پلکوں کے ساتھ، اپنے کمرے میں ہی بند رہتی...... وہ کیا شخص تھا جو سارے شہر کو ویراں کر گیا تھا...... جس کی وجہ سے اس کے اندر کے در و بام منور تھے...... اب وہاں کوئی بھی نہ جا سکے گا...... وہ ایک دروازہ جو ہمیشہ اس نے اس کے لیے کھلا رکھا تھا اب وہ ہمیشہ کے لیے خود بخود بند ہو گیا تھا...... محبت کیا جذبہ ہوتا ہے...... کتنا الوہی...... کتنا میٹھا اور کتنا نایاب...... میاں جی نے صحیح کہا تھا کہ ہر انسان اپنی زندگی میں مختلف قسم کی ساری محبتوں کا تجربہ کرتا ہے...... اور اس کی یہ محبت وقتی نہ تھی بلکہ دائمی تھی جو شاید ہمیشہ اس کے ساتھ آخر تک جائے گی۔

دوسرے دن فریدی صاحب کا فون آ گیا...... اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو ہی تھے......

"ضحیٰ بی بی...... حسن صاحب کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا...... مگر جو خدا کی مرضی...... ہر کام میں اس کی مرضی اولین حیثیت رکھتی ہے...... ہم کیا...... ہمارے دعوے کیا۔ اپنے آپ کو سنبھالیے...... ہم کیا دلاسے دیں جو خود اپنی سانسوں پر قادر نہیں۔ بہر حال ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔" وہ نرم لہجے میں بولے۔

"شکریہ فریدی صاحب......" وہ بمشکل کہہ سکی اور اس نے فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد درانی صاحب آ گئے...... ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔

"ضحیٰ...... حسن کی وفات میرے لیے بھی ناقابل تلافی نقصان ہے...... وہ میرے بچوں کی طرح تھا...... اور ہاں وہ ہم سب کے پاس اسی طرح آیا کرتا تھا جیسے تم......"

"ک......ک......کیا......؟" وہ حیران رہ گئی۔

"لیکن نہ حسن نے مجھے کبھی بتایا نہ ہی آپ نے......؟" اس نے شدید حیرت کا اظہار کیا۔

"ہر ایک کی اپنی اپنی ذات...... اپنی اپنی حقیقت...... اپنے اسرار...... اور اپنی شناسائی ہوتی ہے آپ میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں گی۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"ہاں...... اسی لیے شاید وہ زندگی کے آخری لمحوں میں اتنی حقیقت پسندانہ گفتگو کرتا تھا۔"

"ہاں...... وہ میرے پاس آیا کرتا تھا...... فریدی صاحب اور میاں جی سے اس کی ملاقات صرف ایک دو بار ہی ہوئی...... ہم اکثر زندگی کے بارے میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے...... وہ واقعی بہت شاندار انسان تھا...... ایسا انسان...... جن پر انسانیت بھی فخر کرتی ہے...... بہت محترم...... قابل قدر ایسے انسان...... میٹھی یادوں کی طرح ساتھ رہتے ہیں۔"

درانی صاحب تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلے گئے اور وہ وہیں بیٹھ کر سوچتی رہی......

گھر اس کو ایک دو دن میں خالی کرنا تھا...... پلازہ اس نے بیچ دیا تھا اور ایک چھوٹا سا گھر لے لیا تھا...... اس نئے گھر میں جانے کو اس کا بالکل دل نہیں چاہتا تھا...... بالکل تنہا کیسے وہ وہاں جائے گی...... لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آ رہا تھا......" وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

"بی بی جی آپ سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔" زرینہ نے آ کر اسے اطلاع دی۔

"کون...... ان کو اندر بٹھاؤ میں آتی ہوں۔"

"وہ اسی طرح ویران حلیے میں ڈرائنگ روم میں گئی...... تو حیران رہ گئی حسن اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آیا تھا......

"آپ لوگ......؟" اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

حسن دوڑ کر اس کے ساتھ لگ گیا...... وہ انتہائی بیمار اور کمزور نظر آ رہا تھا جیسے بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ......

"حسن بیٹا کیسے ہو......؟" اس نے اس کو اپنے ساتھ چمٹا کر پوچھا۔

"ہم حسن کو آپ کے پاس چھوڑنے آئے ہیں۔ ہم اس کو باہر بھی لے کر گئے

تھے مگر یہ وہاں بھی بیمار رہا...... نجانے وہ چند دن جو آپ نے اس کے ساتھ گزارے ہیں کیونکر نہیں بھول پا رہا...... ہم نے لاکھ کوشش کی مگر اس کی صرف یہی ضد تھی کہ آپ کے پاس جانا ہے اور مجبوراً ہم اس کو یہاں چھوڑنے آئے ہیں...... اس کی کچھ جائیداد اس کے ماں باپ نے چھوڑی ہے...... اگر وہ آپ کسی طرح نہ لینے کی ذمہ داری قبول کریں تو حسن آپ کے پاس ہمیشہ کے لیے رہ سکتا ہے۔" آدمی نے کمال ڈھٹائی سے کہا۔

اس کو اب اندر کی ساری بات سمجھ آ گئی تھی...... وہ لوگ کیوں اس کو اتنے دنوں بعد لینے آئے تھے اور حسن کیونکر ان کی محبت کا گرویدہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

"میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ جائیداد کیا ہے......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ گھر جس میں ہم رہتے ہیں...... حسن کی ماں کے چھوڑے ہوئے زیورات اور کچھ دکانیں ہیں۔" اب کی بار عورت بولی۔

"حسن کی زندگی کے لیے مجھے اور حسن کو کچھ نہیں چاہئے صرف یہ کہوں گی کہ دولت تو آنی جانی شے ہے...... ایسے یتیم اور لاوارث بچوں کا صرف وہی آسرا ہوتی ہے...... اگر آپ کے اندر تھوڑی سی بھی انسانیت ہے تو اس پر ضرور سوچئے گا کہ حقدار کو اس کا حق ملنا چاہئے...... ورنہ تو ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جب جنم لیتے ہیں تو پینے کے لیے دو قطرے دودھ تک نہیں ہوتا مگر قدرت ان کو اپنے پاس سے بے حساب نوازتی ہے۔ بات تو صرف "سوچنے" کی ہے...... آپ لوگوں کو جب کبھی احساس ہو تو چلے آیئے گا ورنہ نہ حسن کبھی آئے گا نہ میں۔" اور وہ حسن کو لے کر اندر چلی گئی۔

حسن تو اس کے لیے نعمت تھا...... وہ اندر ہی اندر قدرت کی شکر گزار تھی جس نے اس کی تنہا اور سونی زندگی میں حسن کو بھیجا تھا۔ اب اس کو زندہ رہنے کا Cause مل گیا تھا...... واقعی جب کوئی cause نہ رہے تو زندگی کس قدر بدمزا اور پھیکی ہو جاتی ہے...... وہ حسن کے سنگ چھوٹے سے نئے گھر میں شفٹ کر گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ حسن کا مشاہدہ کر رہی تھی کہ وہ بہت حد تک نفسیاتی مریض بن گیا تھا...... اور کسی حد تک اس کی Growth بھی رک گئی تھی...... رات کو سوتے ہوئے وہ عجیب و غریب باتیں کرتا رہتا تھا۔ جیسے اس کا ذہن ایک لمحے کے لیے بھی پرسکون نہ ہوتا ہو...... چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوف زدہ ہو جاتا...... باہر کوئی کھٹکا سن کر اس کے ساتھ یوں لپٹ جاتا کہ وہ حیران رہ جاتی۔

ان لوگوں کے پاس جانے سے پہلے وہ ایسا نہ تھا اور اب تو بالکل ہی بدل چکا تھا۔ وہ اسے لے کر سائیکاٹرسٹ کے پاس گئی...... تو حیران رہ گئی۔ چند ثانیے کے لیے تو اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔

”فیض...... تم......؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑی۔

”ہاں...... لیکن تم یہاں کیسے......؟ سچی بات ہے کہتے ہیں نا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں جب سے انگلینڈ سے لوٹا ہوں تم سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا...... تمہارے گھر بھی گیا مگر تم وہاں سے شفٹ کر گئی تھی...... تم کہاں ہو اب...... اور یہ بچہ کون ہے......؟“ فیض نے بھی حیرانگی کا اظہار کیا۔

”یہ حسن ہے......“

”کیا...... اور ہمارا حسن......؟“ اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

”تمہیں شاید علم نہیں...... حسن اب اس دنیا میں نہیں......“ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”کیا تم اور حسن......؟“ وہ بھی چونکا۔

”ہاں...... ہم ایک تھے......“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”آئی سی...... بہت دکھ ہوا...... بہت نفیس انسان تھا...... خیر بتاؤ کیسے آئی ہو؟“

”حسن کو لے کر آئی ہوں......“

”اچھا تو یہ بھی حسن ہے...... کیا آواگون کا کوئی چکر ہے“ فیض مسکرا کر بولا۔

”نہیں......“ وہ بھی مسکرا دی۔

”آؤ بھئی ادھر کیا مسئلہ ہے......“ اور وہ اسے حسن کے بارے میں اس کی بیماری کے بارے میں بتاتی رہی۔ وہ سنتا رہا اور پھر اس کو علاج اور دوائیں بتائیں۔

”ضحیٰ...... تم بہت بدل گئی ہو......“

”کیا مطلب......؟“

”کافی حد تک ٹھہراؤ آ گیا ہے تم میں...... اور تم کافی سنجیدہ بھی ہو گئی ہو...... پہلے سے زیادہ پرکشش......“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اچھا اب زیادہ نہ بناؤ......“

حسن کی وجہ سے اس کی زندگی میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ ہر وقت بے شمار چھوٹے چھوٹے کام اس کے منتظر رہتے تھے...... اس کو وہ بہت گھماتی پھراتی بھی رہتی۔ ساتھ اپنا بھی کوئی نہ کوئی سوشل ورک جاری رکھتی...... اس کی اتنی توجہ کی وجہ سے حسن بھی آہستہ آہستہ نارمل ہو رہا تھا...... اس کی صحت بھی پہلے سے بہتر ہو رہی تھی...... اس نے اسے سکول میں بھی داخل کرا دیا تھا۔ اس لیے زندگی اور مصروف ہو گئی تھی...... حالات میں جو ایک دم گردش تھی اب کافی حد تک اس میں ٹھہراؤ آ گیا تھا...... عسرت کے بعد اب عجیب سی مسرت زندگی میں آ گئی تھی جو شاید حسن کی وجہ سے تھی۔

ایک دن فیض آ گیا۔ بالکل اچانک اور وہ حیران رہ گئی۔

”تم بالکل تنہا رہتی ہو...... یہاں......؟“ فیض نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں...... بہت سی یادیں ہیں......“

”ہاں...... حسن تمہیں بہت چاہتا تھا...... جب وہ یونیورسٹی آیا تھا تو میں نے تمہارے لیے اس کی پسندیدگی کو دیکھ لیا تھا اور شاید تم بھی...... اسی لیے تو میں پیچھے ہٹ گیا......“

”کیا مطلب......؟“ اس نے چونک کر سوال کیا۔

”وہی جو تم سمجھ رہی ہو......“ فیض نے اس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو سب باتیں...... چائے پیو گے......“ اس نے موضوع بدلنا چاہا۔

”نہیں ہاسپٹل جانا ہے مجھے...... نجانے ہر بات میں مجھ سے دیر کیوں ہو جاتی ہے......؟“ وہ رنج سے بولا۔

”بہت سے لوگوں سے نادانستہ بہت دیر ہو جاتی ہے...... شاید؟“ وہ آہ بھر کر بولی۔

اور حسن ایک دم اس کے حواسوں پر چھانے لگا...... اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے اور فیض اس کی طرف دیکھے بنا ہی باہر نکل گیا۔

......✿......

(38)

حسن کی وفات کے ساتھ ہی زندگی کی ڈگر بھی بدل گئی...... اس نے ایسا لباس زیب تن کرنا شروع کردیا جس سے وہ ادر سنجیدہ نظر آتی تھی...... فیض سے کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی...... ورنہ وہ ہر وقت حسن کو سکول لانے لے جانے اور اس کے کاموں میں مصروف رہتی...... بہت دنوں سے اسے میاں جی کی یاد ستا رہی تھی۔ حسن کو سکول چھوڑ کر وہ سیدھی میاں جی کے پاس پہنچی...... انہوں نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا پھر مسکرائے۔

''میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا......'' وہ مسکرا کر بولے۔

''واقعی......؟''

''ہاں...... اور جب سچے دل سے کسی کو یاد کیا جاتا ہے اسی لمحے وہ بھی یاد کر رہا ہوتا ہے۔ شرط خلوص کی ہے اور سناؤ زندگی کیسی گزر رہی ہے۔'' میاں جی بہت متانت سے بولے۔

''ٹھیک ہوں...... حسن نے مصروف کر دیا ہے۔''

''ہاں...... بعض لوگ ساری زندگی کے لیے فرصت ہی فرصت دے جاتے ہیں اور بعض سارا وقت مصروف رکھتے ہیں...... زندگی میں یہ تو چلتا رہتا ہے...... اب تم اور فارغ ہو جاؤ گی...... یہاں آنے کا بھی تردد نہ کرنا پڑے گا۔'' میاں جس نے پر سکون لہجے میں آنکھیں بند کر کے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکی۔

''میرے بعد فریدی سے رابطہ رکھنا......'' میاں جی آہستگی سے بولے۔

''نہیں...... ایسے نہیں ہو سکتا...... میں تو بہت مشکل سے سنبھلی ہوں'' وہ بے صبری سے بولی۔

''ہر ایک کا وقت، تعین اور مقدار مقرر ہے۔ قانون قدرت ہے...... یہ تو تسلسل

کا قانون ہے...... ہماری جگہ بھی تو کسی نے لینی ہے کہ نہیں...... آنا جانا تو لگا رہتا ہے...... بس قدم مضبوط رکھنا...... ڈگمگانا مت...... پھر جو طلب کرو گی، ملے گا۔ بس کوشش کرنا کہ خالق کے پاس کاسہ خالی لے کر نہ جاؤ......'' میاں جی نے شفقت سے سمجھایا۔

''میاں جی...... انسان بہت کمزور ہے جدائی کا تصور ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے...... اس کو کم ہمت کر دیتا ہے'' وہ افسردگی سے بولی۔

''انسان کمزور نہیں...... جب انسان پہلی دفعہ کسی پریشانی کا تصور کرتا ہے تو اس کو یوں لگتا ہے جیسے وہ **Survive** نہیں کر سکے گا...... پھر جب پے در پے پریشانیاں مایوسیاں اس کو گھیرتی ہیں تو پھر اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ پھر وہ لمحاتی شکستگیاں اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں رکھتیں...... سونے کو کندن بننے سے پہلے کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر کہیں جا کر اس میں وہ خاصیت پیدا ہوتی ہے۔ پریشانیاں، دکھ، تکلیفیں، مصائب...... آزمائشیں، کرب، جدائی، انتظار، ملال، رنج سب کا تعلق انسان سے بتایا گیا ہے اور جو چیز انسان کے لیے بنائی گئی ہے اس کا استعمال بھی ضرور ہو گا...... فطرت تو اپنے تقاضے اور مطالبے پورے کر کے رہتی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ طمانیت، سکون، مسرت، خوشی...... محبت اور یکسوئی بھی انسان کے لیے رکھی گئی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ دنیا کا کوئی انسان مکمل خوشی اور مسرت کے ساتھ زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہو اور نہ ہی کوئی مسلسل کرب میں...... بات تو بس یہ ہے کہ انسان کس چیز سے زیادہ سبق سیکھتا ہے کس سے نہیں...... انسان کس طرح عظیم ہوتا ہے۔ عقل سے یا کہ تجربے سے تو دونوں ہی ضروری ہیں...... عقل کے ساتھ جب تک تجربہ نہ ہوگا تو وہ شعور اور پختگی کچھ بھی فائدہ نہ دے سکے گی...... ہمت کرنا...... اور سنو اخلاقیات کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا...... یہ ہر وقت اور ہر جگہ بہت ضروری ہے...... جب تک انسان کا کردار مضبوط نہ ہو...... وہ وحشی درندہ...... اور کم فہم رہتا ہے...... جیسے جنگل کا جانور...... جیسے شیر...... ارد گرد سے حوصلہ پا کر طاقتور تو بن جاتا ہے مگر رہتا تو درندہ ہی ہے...... جس سے ہر وقت خطرہ ہی لاحق رہتا ہے چاہے اس کو کتنا مرضی سدھاؤ...... کتنی تربیت کرو...... انسان بھی ایسا ہی ہے...... اپنی فطرت میں قوی...... اور وحشی بھی...... وہ عقل و شعور اور تجربے سے توانا تو بن جاتا ہے مگر کردار کی مضبوطی کے بغیر وہ بھی شیر کی طرح رہے گا...... جو کسی وقت بھی کسی کو پھاڑ کھائے گا......

اس لیے کردار ہر جگہ ہر وقت بہت ضروری ہے بلکہ بہت بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں پا سکے گا کیونکہ اس میں منافقت ہو گی...... اس کی سوچ اور کردار میں فرق ہو گا اور جہاں بھی ملاوٹ ہو گی...... وہاں کوئی ترقی نہیں ہو گی نہ ذہنی نہ روحانی نہ مادی...... ہر طرف ابتری ہی ابتری ہو گی...... ہر طرف افراتفری...... میں نے تمہیں جہاں تک ممکن ہو سکا سمجھا دیا ہے...... بہت کچھ انسان اپنے حالات سے خود سیکھتا ہے...... شعور کی شمع جلائے رکھنا تو سب ٹھیک ہے...... بہت سے مسافر ملیں گے...... طرح طرح کے...... جو ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں کچھ تو منزل سے واقف ہیں کچھ سرے سے ہی نابلد...... جو واقف ہیں...... ان کا ہاتھ تھام لینا...... کچھ نہ کچھ رہنمائی تو ضرور پاؤ گی۔ اب جاؤ...... میرے لیے بھی دعا کرنا...... مشکل لمحے شروع ہونے والے ہیں اور پھر آگے بہت کٹھن راہ ہے......'' انہوں نے آہ بھری اور اس کے سر پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے...... اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے لیے یہ صدمہ بہت روح فرسا تھا۔ جدائی کا یہ تصور...... اتنی شفیق، اتنی محترم ہستی...... اور اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی...... وہ اس تصور سے ہی گھبرانے لگی۔ اندر ہی اندر کوئی چیز کاٹنے لگی اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ باہر نکل آئی۔

......❁......

(39)

ایسا کیوں ہوتا ہے جب بھی زندگی میں تھوڑا سا ٹھہراؤ آنے لگتا ہے تو ایک کنکر اتنا گہرا بھنور سا کیوں بنا دیتا ہے کہ پھر سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے...... اس نے کرب سے سوچا۔ پہلے ماں باپ گئے، پھر حسن، اور اب میاں جی...... وہ سب جو اس کے لیے مضبوط سہارے تھے...... اور کتنے مہربان بھی...... میاں جی...... جنہوں نے اس کے دل و دماغ کو کس طرح لمحہ بہ لمحہ اپنی محبت سے اپنی باتوں سے اپنے علم اور تجربے سے پختہ کیا تھا۔ اب وہ بھی نہ رہیں گے...... سب ہی آہستہ آہستہ خاک بنتے جا رہے ہیں...... اور ایک دن وہ بھی...... شاید آج...... شاید کل...... شاید کچھ دنوں بعد...... جلد بدیر...... مگر ضرور...... آنے والوں کے لیے جگہ تو بنانی ہی ہے نا...... اب تو صرف یادیں ہی رہ گئی تھیں...... چاروں طرف...... رات کو جب بھی وہ سونے کے لیے جاتی تو کبھی حسن اپنا مسکراتا چہرہ لے کر آ جاتا...... کبھی مما ڈانٹتی ہوئی تو کبھی میاں جی...... سمجھاتے ہوئے، روحانی تربیت کرتے ہوئے۔ نجانے وہ کس حال میں ہوں...... اس کا کئی دنوں سے کسی سے بھی کوئی رابطہ نہ تھا...... اس کا دل بالکل کچھ نہ کرنے کو چاہ رہا تھا۔

ایک شام فیض آ گیا اور اس کے ساتھ تانیہ تھی اور عزیز بھی...... ایک دم پرانی یادیں عود کر آئیں۔

''تم سب لوگ...... یہاں......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... کیوں امید نہ تھی......؟'' عزیز بولا۔

''مگر تم اس قدر بدل گئی ہو......'' تانیہ نے اس کا جائزہ لیا۔

''وقت کے ساتھ بدلنا تو پڑتا ہی ہے......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''لیکن اس قدر Change مجھے تو یقین نہیں آ رہا......'' تانیہ کی حیرت کی انتہا

نہ رہی تھی۔

''شروع میں ہر بات کو Accept کرنا مشکل ہوتا ہے پھر انسان خود بخود اس کا عادی بن جاتا ہے...... چھوڑو اس بات کو...... تم تو بہت خوش نظر آ رہی ہو......'' ضحیٰ نے جواب دیا۔

''ہاں...... میں آج کل امریکہ میں ہوں...... شوہر اور بچوں کے ساتھ آئی ہوں۔ فیض سے ملنے گئی تو پھر اس نے تمہارا بتایا اور حسن کا سن کر بہت افسوس ہوا...... ہاں تمہارا بیٹا کدھر ہے......؟'' تانیہ بولی۔

''بیٹا...... اوہ...... ہاں...... وہ اپنے کمرے میں ہے...... میں ابھی اس کو لے کر آتی ہوں'' اور وہ اسے لے کر آئی۔

''حسن بیٹا سب کو سلام کرو......'' اس نے حسن کو سلام کرنے کو کہا۔

''ارے باپ پہ ہی اس کا نام رکھ دیا...... لگتا ہے ابھی تک بہت عشق ہے اس نام سے......'' عزیز نے قہقہہ لگایا۔

''تم تو ہر جگہ شروع ہو جاتے ہو......'' اس نے عزیز کو ڈانٹا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم سب لوگ کیا کر رہے ہو......؟'' اس نے چائے بناتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''میں تو یقین جانو امریکہ کی متحرک زندگی میں سب کچھ بھول بھال چکی ہوں، وہاں لائف اس قدر بزی ہے کہ اپنے لیے سوچنے کی فرصت نہیں...... آرام کرنے کا ٹائم نہیں۔ یہاں پر جو بونگیاں مارا کرتے تھے وہاں ایسی باتوں کا وجود ہی نہیں۔ بس ہم ہیں اور وقت ہے...... گھڑی کی سوئیوں کے مطابق ہم نے ہر کام وقت پر کرنا ہے...... نہ کریں تو خود ہی پیچھے رہ جاتے ہیں...... بس میں اور میرا شوہر...... یقین مانو ہم تو گھڑی کی دو سوئیاں ہو کر رہ گئے ہیں......'' تانیہ نے بتایا۔

''اور میں مینٹل ہسپتال میں آج کل جاب کر رہا ہوں'' عزیز بولا۔

''اور میرے بارے میں تو تم واقف ہی ہو......'' فیض نے کہا۔

''تم کیا کر رہی ہو......؟'' عزیز نے اس سے پوچھا۔

''میں کچھ کرنا تو چاہتی ہوں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں...... اصل

میں تعلیم بھی پوری نہ ہو سکی پھر گھر کے مسائل بھی...... لیکن کچھ کرنے کا عزم ہے جس میں کچھ مفہوم ہو......'' اس کے لہجے میں تھکن اور مایوسی تھی۔

''تو پھر تمہارے لیے کوئی جاب ڈھونڈیں......'' عزیز بولا۔

''ہاں...... نظر میں رکھنا...... حسن سکول چلا جاتا ہے...... میں فارغ ہوتی ہوں...... تو وقت گزارنا چاہتی ہوں......''

''ضحیٰ...... ایک بات ہے تم میں یہ اتنی جان لیوا تبدیلی آئی کیسے......؟'' تانیہ نے بغور اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''تانیہ تمہارا یہ سوال انتہائی فضول ہے...... ایک محبت کرنے والا شخص ساتھ چھوڑ جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے باقی......'' عزیز نے اسے گھورا۔

''اصل میں تانیہ جب تبدیلی آتی ہے نا تو اتنی اچانک آتی ہے کہ انسان کو خود بھی نہیں پتا چلتا...... اب میں تو روٹین کے مطابق زندگی گزار رہی ہوں لیکن تم لوگ کہہ رہے ہو کہ میں تبدیل ہو گئی ہوں...... تو پھر مجھے احساس ہوتا ہے شاید ہاں میں واقعی بدل گئی ہوں...... زندگی میں تو یہ سب ہوتا ہی رہتا ہے...... بہت سی نئی باتیں...... نئی سوچیں...... نئے نئے موڑ انسان کو بدل کر رکھ دیتے ہیں...... یہ تو فطری عمل ہے۔'' وہ منطق انداز میں بولی۔

''تو کیا تم ابھی بھی زندگی کو اُسی طرح ہی دیکھتی ہو یا اس کی حقیقت، اس کی سچائی یا اس کا مفہوم...... تمہارے لیے بدل گیا ہے'' تانیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''تانیہ زندگی اس قدر **Complicated** اور الجھی ہوئی ہے یا یوں کہہ لو کہ اس کے سارے دھاگے اس قدر الجھے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کہیں کوئی سراغ یا سرا نہیں ملتا۔ کبھی کبھی تو بہت خشک بے رنگ، بے ڈھنگ اور یکسانیت سے بھرپور دن...... کبھی قوس قزح کے حسین رنگوں کا امتزاج ہر طرف پھیلا ہوا...... کبھی خوشبو کی طرح ہر جانب مہک ہی مہک...... کبھی نیم کی طرح کڑوی کسیلی...... زندگی کے اتنے ہی مفہوم ہیں جتنی انسان کی سوچیں...... یا اس کی سوچ کے زاویے...... اور اتنے ہی مقاصد جتنے انسان اپنے ذہن میں تانے بانے بنتا رہتا ہے۔ اس لیے زندگی کا ایک مفہوم تو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ رہا میرا سوال کہ زندگی کا کون سا مفہوم میرے لیے اہم ہے اور میرا رویہ اس کے بارے میں بدلا

ہے کہ نہیں...... تو یہ حقیقت ہے کہ تبدیلی تو رونما ہوئی ہے...... اور سوچ بھی بدلی ہے اب زندگی کا مفہوم میں انسانیت میں ڈھونڈنا چاہتی ہوں...... کسی طرح لوگوں کی خدمت کر کے......'' وہ قطعیت سے بولی۔

''تمہارے لب و لہجے میں بھی بلا کا فرق آ گیا ہے'' فیض اب کی بار بولا۔

''اچھا عزیز تم بتاؤ ہسپتال میں تمہارے پاس کیسے مریض زیادہ آتے ہیں؟'' اس نے عزیز سے پوچھا۔

''ظاہر ہے پاگل ہی آتے ہوں گے......'' تانیہ بولی۔

''لیکن پاگل ہونے کی زیادہ تر کیا وجوہات ہوتی ہیں......؟''

''جو لوگ Sensitive اور خاص طور پر Hyper Sensitive ہوتے ہیں ان پر اندرونی اور بیرونی ردعمل زیادہ شدید ہوتا ہے یا یوں کہہ لو کہ خاص طور پر جب تمام خواہشات پوری نہ ہو رہی ہوں اور بار بار ڈپریشن ہو اور انسان اندرونی طور پر اتنا قوی نہ ہو کہ وہ Resist کر سکے اور جب شعور اور لاشعور میں شدید اختلاف رونما ہونے لگے اور منفی سوچیں ہر طرف سے انسان کو گھیر لیں تو آہستہ آہستہ انسان کی Senses متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہیں اس سے انسان کی Will Power دن بدن کم ہونے لگتی ہے اور پھر جب باہر کا کوئی صدمہ یا شدید پریشانی اچانک حملہ کرتی ہے تو انسان اپنی عقل اور حواس کھونے لگتا ہے۔'' عزیز نے قدرے تفصیلاً بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ انسان کے پاگل ہونے میں باہر کے حالات کا بہت بڑا عمل دخل ہے یا پھر بچپن سے ہی وہ آہستہ آہستہ اس طرف چلنا شروع کر دیتا ہے۔'' اس نے پھر سوال کیا۔

''ہاں...... جب انسان بہت زیادہ بد اعتماد ہو جاتا ہے تو پھر باہر کے حالات بہت طاقت سے اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں میں بچپن سے ہی بہت زیادہ Complexes ہوتے ہیں تو اس کی وجہ سے یہ سب ہوتا ہے۔'' عزیز نے بتایا۔

''تو Complexes کیسے ختم کیے جائیں......؟'' وہ حسن کی طرف سے پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔

''یہی کہ ان لوگوں کو بہت توجہ دی جائے...... خاص خیال رکھا جائے۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ شیئر کیا جائے...... چھوٹے چھوٹے واقعات اور معمولی باتوں کا خیال رکھا جائے۔''

''میرا خیال ہے کہ آج کل کے لوگ زیادہ نفسیاتی مریض ہوتے جا رہے ہیں...... امریکہ میں تو شرح بہت بڑھ رہی ہے......'' تانیہ نے افسردگی سے کہا۔

''اصل میں عجیب عجیب نفسیاتی مسائل اور پریشانیاں بالواسطہ انسان کے ذہن پر حملہ آور ہو رہی ہیں...... کئی وجوہات ہیں لیکن زیادہ تر تنہائی کی وجہ سے مغربی معاشرے میں خاص طور پر اور یہاں بھی اب ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ انسان جوں جوں آگے جا رہا ہے ایک دوسرے سے کٹتا جا رہا ہے۔ اس دوری کی وجہ سے وہ حد درجہ جذباتی ہو رہا ہے پھر جذباتی وابستگی نہ ہونے کی وجہ سے Irrational اور Impulsive ہو جاتا ہے۔ قوت مدافعت کم ہو جاتی ہے اور انسان Fight نہیں کر پاتا'' عزیز بتاتا رہا۔

''میں بھی جب سے یہاں آیا ہوں تو یہی دیکھ رہا ہوں کہ لوگ اپنی اپنی ذات میں مگن رہنے لگے ہیں۔ ایک دوسرے کے احساسات کی بالکل پرواہ نہیں کرتے اور اگر سمجھ بھی لیں تو اظہار نہیں کرتے...... یوں جیسے بند ڈبے ہو گئے ہیں ہر کوئی اپنے آپ کو مکمل سمجھتا ہے اور کسی سے کچھ بھی قبول نہیں کرنا چاہتا اور ایسے ایسے لوگ آتے ہیں اور ایسے مسائل کہ خدا کی پناہ...... بعض اوقات عقل بھی سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے...... اور یقین کرو کہ دیکھ کر بہت دکھ سا ہوتا ہے کہ انسان اپنے اندر کیا کیا چھپائے پھرتا ہے...... وہ باہر سے کتنا پر اعتماد نظر آتا ہے مگر اندر سے کس قدر شکستہ......'' فیض نے بھی بتایا۔

''تم حسن کا خاص خیال رکھنا...... اس میں بھی Resist کرنے کی طاقت کم ہو رہی ہے۔'' فیض نے اسے کہا۔

''ہاں...... میں بھی یہی سوچتی ہوں۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''اب ہمیں چلنا چاہئے آج کافی اچھی گفتگو رہی جیسے درانی صاحب کا لیکچر...... جس سے ضحیٰ کو بہت چڑ تھی......'' عزیز ہنس کر بولا۔

''تم کچھ نہیں بھولتے......'' تانیہ بولی۔

''اچھا خدا حافظ......''

''ان کو بھیج کر وہ واپس ہی مڑی تھی کہ فریدی صاحب کا فون آ گیا۔

"ضحیٰ بی بی...... میاں صاحب اب ہم میں نہیں رہے۔" وہ بہت افسردگی سے آہ بھر کر بولے۔

"کب......؟" اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹنے لگا۔

"چند گھنٹے پہلے......"

اس نے ریسیور رکھ دیا اور خالی خالی نظروں سے کمرے کو دیکھنے لگی۔ آنسو بہتے رہے اور وہ دیکھتی رہی۔ میاں جی کی صحبت میں گزرا ایک ایک لمحہ اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس کا کتنا بڑا نقصان ہوا تھا یہ صرف وہی جانتی تھی۔

۞

(40)

چند دنوں بعد عزیز کا فون آیا کہ اس نے اس کے لیے پنڈی میں ایک پرائیویٹ کالج کے گرلز ہاسٹل میں وارڈن کی جاب ڈھونڈی ہے اور اگر وہ چاہے تو جوائن کر سکتی ہے۔ بلکہ اس نے انتظامیہ سے بات بھی کر لی ہے۔

"لیکن عزیز حسن کا مسئلہ ہوگا......" وہ آہستہ سے بولی۔

"فکر نہیں کرو...... اس کا بھی بندوبست ہوگیا ہے۔ کالج سے چند قدم کے فاصلے پر ایک بورڈنگ سکول ہے...... حسن کو وہاں داخل کرا دو بلکہ اس طرح زیادہ وقت وہ تمہارے پاس رہے گا......" عزیز نے رائے دی۔

"اس کا مطلب ہے تم نے ہمیں شہر بدر کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" وہ آہ بھر کر بولی۔

"ارے نہیں...... میں اور فیض آتے رہیں گے...... کوئی فکر کی بات نہیں۔" اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تیاری کرتی ہوں......"

اگلے دن وہ حسن کو لے کر وہاں چلی گئی...... اس کو جو کمرہ وہاں ملا تھا۔ اس میں سب سہولتیں تھیں۔ ہاسٹل بھی بہت اچھا اور سٹینڈرڈ کا تھا...... حسن کو اس نے قریبی سکول میں داخل کرا دیا...... سارا وقت وہ اس کے پاس رہتا اور شام کو چلا جاتا...... اگر زیادہ ضد کرتا تو وہ اس کو اپنے ہی پاس رکھ لیتی۔

زندگی پھر معمول پر آ گئی تھی حالات نارمل ہو گئے تھے...... وہ بھی سارا وقت اپنی ذمہ داریوں اور عبادت میں صرف کرتی۔ لڑکیاں بھی اس کے زویے سے مطمئن تھیں کہ اب اس میں بہت ٹھہراؤ اور دھیما پن آ گیا تھا...... ہر بات کو آرام اور تحمل سے سننا...... مسائل کا حل سوچ سمجھ کر نکالنا...... پیار سے ہر ایک کو سمجھانا......

ایک دن اچانک فیض آ گیا......

''تم یہاں کیسے......؟'' ضحیٰ نے حیرت سے سوال کیا۔

''تمہیں مدعو کرنے آیا ہوں......'' فیض نے آہستہ سے جواب دیا۔

''خیریت ہے......''

''ہاں......بس گھر والے مجھے کہیں باندھ رہے ہیں۔''

''کیا مطلب......؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''انہوں نے میری شادی کا پروگرام بنایا ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''واقعی......کیا تم نے ابھی تک شادی نہیں کی......؟'' وہ چونکی۔

''نہیں......اگر میرے بس میں ہوتا تو شاید کبھی نہ کرتا۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کیوں......؟''

''تم سب جانتی ہو......مجھ سے ایسے سوال مت کرو۔'' وہ جھنجھلا گیا۔

جواباً وہ خاموش رہی۔

''میں انتظار کرتا رہا کہ جب حالات نارمل ہوں اور جب دیکھوں کہ تم سنبھل گئی ہو تو میں تم سے شادی کا کہوں......ضحیٰ......دوسری شادی کوئی گناہ تو نہیں۔'' فیض ایک دم پھٹ پڑا۔

''کس کی دوسری شادی......؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''تمہاری اور کس کی......میں تو صرف تمہارا ہی منتظر تھا۔''

''فیض......میری تو پہلی شادی نہیں ہوئی دوسری کا کیا سوال......؟'' وہ زخمی مسکراہٹ سے بولی۔

''کیا واقعی......؟'' فیض کے چہرے پر کئی رنگ نمودار ہوئے۔

''ہاں......لیکن......میں حسن کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی......وہ میرے لیے کیا تھا......شاید الفاظ کبھی بھی اس کا احاطہ نہ کر سکیں......یوں سمجھو......میری آخری سانسوں تک اگر میرے لبوں پر کسی کا نام ہوگا تو وہ حسن ہوگا......وہ بھی اس دنیا سے اسی آس میں گیا ہے اور میں بھی یہ امید لے کر جاؤں گی کہ ہمارا رب ہمارا ملاپ

ضرور کرائے گا۔'' وہ پُر امید لہجے میں بولی۔

''I really appreciate your views'' فیض کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اور یہ جونیئر حسن کون ہے......میں تو آج تک اسے تمہارا بیٹا ہی سمجھتا رہا ہوں۔'' فیض نے حیرت سے پوچھا۔

''فیض......بیٹوں کے ماتھے پر نام تو نہیں لکھے ہوتے......یہ میرا ہی بیٹا ہے......اسے جب بھی ملنا......میرا بیٹا سمجھ کر ملنا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

فیض نے خاموشی سے کارڈ اس کی جانب بڑھایا......اس کے چہرے پر اداسی ہی اداسی تھی۔

''یہ تم نے شکل کیوں لٹکائی ہوئی ہے......زندگی کا نیا سفر خوشی خوشی شروع کرتے ہیں۔ خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کو تم ملے ہو......'' اس نے اس کی امید بندھاتے ہوئے کہا۔

''کاش وہ تم جیسی ہو''

''کیوں......میرے سے بڑھ کر کیوں نہیں'' اس نے ہنس کر جواب دیا۔

''شروع سے تم مجھے الجھاتی ہی آئی ہو......اب بھی آؤ گی کہ......؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''کیا مطلب......اگر اعتبار نہیں تو ابھی چل پڑوں۔''

''نہیں......اعتبار کرنا پڑتا ہے......کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنے کو دل چاہتا ہے......اپنے بیٹے کو بھی لے کر آنا......'' فیض اپنی ہمت یکجا کر کے بولا۔

''ضرور......'' وہ مسکرا کر بولی۔

''میں انتظار کروں گا......'' اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

......❁......

(41)

وقت کا پنچھی کیسے پر لگا کر اڑا اس کو بالکل خبر نہ ہوئی حسن سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچ گیا...... اور وہ خود اس دوران کتنی بدلی اور کتنی بوڑھی ہوئی اس کو خود بھی احساس نہ ہوا...... ہاں فریدی صاحب کو دیکھ کر لگتا تھا کہ واقعی بہت وقت گزر گیا ہے...... ان کے چہرے پر متانت اور بڑھ گئی، داڑھی بھی قدرے لمبی ہوگئی کم و بیش وہی حلیہ ہوگیا جو کبھی میاں جی کا تھا...... عرصہ ہی گزر گیا اور پتا بھی نہ چلا۔ حسن اس کے سامنے ننھے سے بچے سے ایک ذہین نوجوان میں بدل گیا تھا...... اب وہ اپنی ایک منفرد شخصیت رکھتا تھا، اپنی پسند، ناپسند...... اور اپنی ہی پسند کے مطابق اس نے جرنلزم کا مضمون لیا تھا...... اس میں بلا کی ذہانت اور فطانت تھی...... مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے اندر بہت سارے Complexes کو لے کر جوان ہوا تھا، بہت سی محرومیاں...... اس کے اردگرد پھیلی ہوئیں تھیں اور جن سے وہ بارہا سمجھوتہ کرنے کے باوجود بھی ان کو سمجھ نہ پایا تھا......

وہ اندر سے جتنا ملائم اور نفیس انسان تھا باہر سے اتنا ہی ناقابل قبول، اس کا دبلا پتلا وجود...... بے انتہا پتلے بال...... سر پر یوں جیسے کہیں کہیں چھٹا دیئے گئے ہوں...... سانولی رنگت اور موٹے شیشوں والی عینک...... باہر کی شخصیت نے اس کے اندر کے حساس انسان کو بے حد بد اعتماد کر دیا تھا...... جو لوگ اس سے اچھی طرح واقف تھے وہ تو اس کے معترف تھے اور جن سے وہ پہلی دفعہ ملتا وہ سر سے لے کر پاؤں تک اس کو یوں دیکھتے کہ وہ اندر ہی اندر پارہ پارہ ہو جاتا۔ وہ ان نظروں کا مفہوم بہت اچھی طرح سمجھنے لگا تھا ضحیٰ نے اس کو بے حد اعتماد اور توجہ سے پالا تھا...... مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کے اندر شدید قسم کی کمی رہ گئی تھی اور وہ خود بھی اسے بہت اچھی طرح محسوس کرتی تھی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ اس کا حسن بھی فریدی صاحب کی طرح کوئی ریسرچ سنٹر کھولے، کوئی

Constructive کام کرے مگر وہ قلم کے سہارے چلنے کا خواہشمند تھا اس لیے اس نے اپنی مرضی اس پر مسلط نہ کی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ قلم کے سہارے وہ اندر کے Complexes کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے شوق کو سراہتی۔

بہت دنوں کے بعد وہ اسے ملنے آیا تھا بہت مضمحل اور پریشان سا۔

"حسن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ پریشان ہو، کیا بات ہے بیٹا......؟" اس نے محبت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں آپی...... بتانے کے لائق کوئی بات نہیں" وہ مایوسی سے بولا۔

"لیکن تمہارے چہرے پر کوئی تحریر ہے...... جس میں کچھ مفہوم ہے" اس نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے کر پوچھا۔

"آپ کا وہم ہے...... چہرے پر تو ہر وقت کوئی نہ کوئی Disk آن ہوتی ہے۔ اب بندہ اس سے کیا کیا نتیجہ نکالے۔" اس نے ٹالنا چاہا۔

"لیکن پھر بھی کوئی بات ہو تو ضرور بتانا......"

"ٹھیک ہے......" اور وہ بنا کچھ کہے سنے جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ خود بھی پریشان تھا...... وہ اس کو کچھ بتانا چاہتا تھا...... اس سے کچھ شیئر کرنے کے لیے تو وہ دوسرے شہر سے آیا تھا اور اب اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ کچھ کہتا اور بغیر کہے ہی نکل گیا اس کو اپنے آپ پر شدید غصہ تھا کہ وہ اندرونی طور پر اتنا کمزور کیوں ہے...... وہ کیوں ڈرتا ہے...... کس سے اتنا خوفزدہ ہے اور کس لیے...... شاید وہ اپنے باہر کے انسان کی کمزور شخصیت سے خوف زدہ تھا...... وہ کیسے اس Complex کو ختم کرے...... وہ خاص طور پر اسے ندا کے بارے میں بتانے آیا تھا...... ندا اس کی کلاس فیلو تھی دنوں میں بہت انڈر سٹینڈنگ تھی۔ اور دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے...... وہ ہمیشہ سے کم گو اور چپ چاپ تنہائی پسند انسان تھا مگر ندا نے کچھ حد تک اس کو بدل ڈالا تھا اور اب وہ لوگوں میں کسی حد تک ملنے بیٹھنے لگا تھا...... وہ ہمیشہ اس سے یہی کہا کرتا تھا۔

"تم جانتی ہو ندا کہ تم مجھے اپنے آپ سے بھی زیادہ اچھی کیوں لگتی ہو کیونکہ تمہاری Company تمہارا مدھم، نرم لہجہ تمہاری باتوں کے سحر نے میرے دماغ کو روشن کر دیا ہے۔ میں جو اب محسوس کرتا ہوں پہلے کبھی نہیں کرتا تھا...... کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ

واقعی ایک اچھا انسان اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ وہ اپنی ساری خوبصورتی دوسرے کے دل و دماغ میں انڈیل دیتا ہے۔ میرے اندر ایک مخصوص جذبے نے جنم لینا شروع کر دیا ہے۔ مجھے اکثر حیرانگی ہوتی ہے کہ یہ جذبہ اور اس کے سوتے کہاں سے پھوٹتے ہیں اور پھر اتنی تیزی سے اندر ہی اندر بہنے لگتا ہے کہ ہر طرف سیلاب آجاتا ہے یا شاید قدرت نے ہی عورت کو اتنا خوبصورت اتنا دلکش بنایا ہے کہ جو تمام جذبے مرد کو کفایت شعاری سے دیئے گئے ہیں عورت کے اندر ان کی کتنی بہتات ہے وہ سارے جذبے جو نرم میٹھے اور توانا ہیں...... سوچتا ہوں کبھی ہمارا ملن ہوگا۔'' وہ فرطِ جذبات سے مغلوب مسحور کن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

اور وہ اس کی طرف ایک ٹک دیکھتی رہی۔

''حسن تم ہمیشہ Pessimist ہو کر کیوں سوچتے ہو...... پتا ہے جتنا زیادہ انسان منفی ہو کر سوچتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ اس کی لپیٹ میں آتا جاتا ہے۔ تم اپنی سوچ کو توانا رکھو...... وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے اسے امید دلائی۔

''اور اب جب سے ندا نے بتایا تھا کہ اس کے گھر والے ایک جگہ اس کا رشتہ طے کرنے لگے ہیں تب سے وہ بکھر کر رہ گیا تھا اور ضحیٰ سے بھی وہ اس سلسلے میں بات کرنے گیا تھا...... نجانے کیا سوچ کر وہ بغیر کچھ کہے ہی واپس آ گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر سارا راستہ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ پہلے وہ خود اس کے والدین سے ملے تاکہ ضحیٰ کو 'نہ' کی صورت میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ دوسرے دن وہ ندا کے والدین سے ملنے گیا...... ندا تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور بہت امیر طبقے سے اس کا تعلق تھا...... ندا اسے بہت خوش دلی سے ملی۔

''ابھی ڈیڈی آ رہے ہیں......'' اس نے مسکرا کر بتایا۔

''اور ممی......؟''

''وہ بھی......'' وہ بہت خوش تھی۔

''اس کے ڈیڈی بہت بارعب شخصیت کے مالک تھے...... جیسے ہی اندر داخل ہوئے بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا...... ان کی نظروں میں چبھن ہی چبھن تھی...... بے شمار کانٹے...... اور وہ سب کچھ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''ندا چائے لے کر آؤ......'' وہ اپنی رعب دار آواز میں بولے۔

اور اس کے پیچھے خود بھی نکل گئے...... ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی کچن تھا...... جس سے ان کی گرجتی ہوئی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''ندا...... کیا یہ لڑکا اس گھر کا داماد بننے کے قابل ہے......؟'' وہ چلاتے ہوئے بولے۔

''کیوں ڈیڈی......؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''آج کل پرسنالٹی ہولڈرز کا دور ہے...... اور وہ تو شکل سے ہی...... مائی گڈنیس تم نے کیا سلیکٹ کیا ہے؟ افسوس ہو رہا ہے تمہاری چوائس پر'' وہ غصے سے دھاڑے۔

''لیکن ڈیڈی...... وہ بہت اچھا انسان ہے۔'' ندا اس کے دفاع میں بولی۔

''کیا ہر ایک کو بتاتی پھرو گی کہ یہ بہت اچھا انسان ہے۔''

''نہیں ڈیڈی...... اچھے لوگوں کے چہروں سے نکلنے والی شعاعیں ہی دلوں کو Capture کر لیتی ہیں میں کیوں بتاؤں گی۔'' وہ منطقی انداز میں بولی۔

''بہر حال اس کا فیصلہ تو میں بعد میں کروں گا...... چائے پلا کر اس کو فارغ کرو اور میں ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں......'' وہ قدرے خفگی سے بولے۔

''حسن نے ساری باتیں سن کر ایک ٹک اس کی ماں کی جانب دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا......''

''ممی...... حسن کہاں ہے......؟'' ندا نے ڈرائنگ روم میں آ کر پوچھا۔

''بیٹا...... اس نے ساری باتیں سن لی ہیں اور وہ اٹھ کر چلا گیا......'' ممی نے آہستگی سے جواب دیا۔

''کیا......؟'' ندا کو شدید دھچکا لگا۔

''ہاں......''

''وہ بہت Egoist ہے......'' ندا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ جیسے ہی ہاسٹل پہنچا تو ندا کا فون اس کا منتظر تھا۔

''حسن...... آئی ایم سوری...... تم نے یقیناً مائنڈ کیا ہے۔'' ندا روہانسی ہو کر بولی۔

''نہیں کوئی خاص نہیں...... اب تو عادت سی پڑ گئی ہے بہت کچھ سننے کی۔ ندا تم نے یہ شعر تو سنے ہوں گے نا

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا
ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے
اک خواب ہیں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا

اس کے لہجے میں بلا کی شکستگی اور درد تھا۔

''حسن میں کس طرح کہوں کہ میں.....'' ندا کو الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ وہ کس طرح ''سوری'' کرے۔

''مت کہو کہ بہت شرمندہ ہو..... کوئی بات نہیں..... Take it easy'' اور اس نے فون بند کر دیا۔

''اس کی ذات کی ایسی نفی ہوئی تھی کہ اس کے لیے سنبھلنا محال ہو رہا تھا..... وہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا..... کتنی کرچیوں کو سمیٹے..... ہاتھ بھی تو لہولہان تھے..... اور اس رات وہ اتنی شدت سے رویا کہ سارے Complexes پھر عود آئے..... ایسی ٹھیس لگی تھی کہ وہ سارا ہی بکھر کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنا سارا کرب لفظ لفظ ڈائری میں منتقل کر رہا تھا۔

''ندا تم سے جدائی کا تصور بھی میرے لیے روح فرسا ہے..... میں تم سے جدا ہو کر کیسے زندہ رہ پاؤں گا..... میں تمہارے بغیر کس طرح جی سکوں گا..... میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا..... میری آنکھوں سے نیند ختم ہو گئی ہے..... اور میرے دماغ سے سوچ کا وجود ہی آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے میرا دل جذبوں سے خالی ہو رہا ہے اور میرا وجود لمحہ بہ لمحہ کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے..... مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اردگرد سارے روبوٹ پھر رہے ہوں..... کھوکھلے انسان..... میں جب بھی ٹوٹتا تھا تو T.S.Eliot کی The Hollow Men پڑھا کرتا تھا..... تم سے ملنے کے بعد میں نے اس کو بھلا دیا مگر آج پھر مجھے شدت سے وہ یاد آ رہی ہے۔

We are the hollow men
we are the Stuffed men
leaning together
lead piece filled with straw. Alas!
our dried voices, when

we whisper together
Are quiet and meaningless
As wind in dry grass
Or rat's feet over broken grass
In our dry cellar______

اس نے ڈائری بند کی۔

اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے..... اس نے ہمت کر کے اپنا سامان سمیٹا..... اس کے نام خط لکھا۔

''ڈیئر ندا!

میں سوچ رہا ہوں کہ بعض اوقات انسان اپنے جذبوں کے لیے کتنے آزمائے جاتے ہیں کہ ان کو خود ہی سمجھ نہیں آتا کہ اندر کتنا دیمک لگ چکا ہے..... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں..... اور شاید یہی محبت میرے لیے آزمائش ہے اور میں اپنے لیے تمہیں کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ مجھے پتا ہے تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو لیکن مجھے اس کا بھی علم ہے کہ میں تمہارے گھر ہمیشہ Missfit رہوں گا..... اور میرا وجود تمہارے لیے مسلسل آزمائش بنا رہے گا..... اس لیے میں نے سوچا ہے کہ خاموشی سے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں..... تم اپنی زندگی کا آغاز خوشی خوشی نئے سرے سے کرنا..... میں تمہیں کبھی بھول پاؤں گا..... ایسا سوچنا بھی مت

ختم ہوا میرا افسانہ اب یہ آنسو پونچھ بھی لو
جس میں کوئی تارا چمکے آج کی رات وہ رات نہیں''

اس نے خط اپنے ایک دوست کو دیا اور خود خاموشی سے باہر نکل گیا۔ سڑک پر تاریکی ہی تاریکی تھی۔ مسلسل خاموشی اور سناٹا..... بیگ ہاتھ میں لیے اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ آپی..... کیا سوچے گی کہ میں بن بتائے کہاں چلا گیا..... آپی کا بھی تو میرے سوا کوئی نہیں..... مجھے اسی شہر میں رہنا ہے..... یہی سوچ کر اس نے اپنے ایک دیرینہ دوست کی انیکسی کی جانب رخ کیا..... وہاں سے ضحیٰ کو فون کیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایک دو دن میں اس سے ملنے آئے گا۔

......۞......

(42)

قیافہ شناسی کی بنیاد وہ مخصوص شعاعیں ہیں جو ہر چہرے سے خارج ہوتی ہیں اور یہی شعاعیں دیکھنے والے کو ایک ہی منٹ میں اس شخص کے بارے میں بھرپور تاثر دیتی ہیں۔ نیک اور پاکیزہ چہروں سے نکلنے والی شعاعیں نہ صرف اس انسان کے گرد و پیش کو منور کرتی ہیں بلکہ دیکھنے والا بھی ان شعاعوں کا اثر دل کے نہاں خانوں تک محسوس کرتا ہے اور کریہہ چہروں سے نکلنے والی شعاعیں اردگرد ایسا ہالہ بناتی ہیں کہ ہر طرف کراہت ہی کراہت پھیل جاتی ہے کہ دیکھنے والا متنفر ہونے لگتا ہے۔ یہی حال اس کا بھی تھا جب سے اس کے دل، جسم اور روح میں ہم آہنگی پیدا ہوئی تھی اس نے اس کے وجود کو ایک نئی جلا بخشی تھی...... وہ سارا دن لڑکیوں کے کام کاج میں مصروف رہتی ان کے مسائل سنتی پھر اس کے بعد زیادہ تر وقت عبادت میں مصروف رہتی زندگی کے تمام لاحاصل جذبوں اور نفس کے درمیان جو جنگ تھی جو اضطراب اور پریشانی تھی جو کسک اور ملامت تھی اور جتنے منفی جذبے تھے وہ سب کے سب اب دم توڑ چکے تھے۔ اب نہ پہلے جیسا تلاطم اور شور تھا نہ زندگی میں اب کسی چیز کے حصول کی تمنا اور طلب رہی تھی نہ کسی چیز کے کھونے کا قلق اور نہ ملنے کی پریشانی۔ بس اب تو ہر چیز کی جگہ رضا نے لے لی تھی ہر طرف سکوت ہی سکوت اور اطمینان ہی اطمینان تھا جو ملا تھا اس کو تسلیم کیا تھا جو نہ ملا تھا اس کو رضا سمجھا تھا۔ قناعت کی ایسی دولت مل گئی تھی جس کے بعد کسی چیز کی کوئی تمنا باقی نہ رہی تھی اس کا وجود لڑکیوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا وہ ان کے مسائل کو بہت حد تک سمجھنے لگی تھی اور لڑکیاں اس کی صحبت میں خوشی محسوس کرتیں اور اس کے چہرے پر پھیلی طمانیت اور مسکراہٹ ہر دیکھنے والی نظر کو ضرور متاثر کرتی۔ جب اس نے جوائن کیا تھا تب حالات اس قدر خطرناک نہ تھے جتنا کہ پچھلے ایک دو سال سے ہو رہے تھے ایسی لڑکیاں ہاسٹل میں آ رہی تھیں جن

کے نزدیک اخلاقیات محض چند الفاظ کا مرکب تھیں اور لاحاصل خواہشات کے پیچھے اندھا دھند دوڑنے نے نہ صرف ان کے ذہنوں بلکہ ان کی روحوں تک کو ایسے لپیٹ میں لیا تھا کہ ان کی شخصیت بالکل مسخ ہو گئی تھی۔ وہ پابندیوں کی قائل نہ تھیں اور جوانی تو ویسے بھی بہتے دھارے کی مانند ہوتی ہے اگر اس پر پابندیاں لگائی جائیں تو وہ ہر ممکن ان پابندیوں کو توڑنے کی کوشش کرتی ہے جتنے بند باندھے جائیں سب ایک ہی طاقتور ریلے میں بہہ جاتے ہیں۔ اس مہیب بہتے دریا کی سمت کو بدلنا اور اس پر پل باندھنا تو صرف انسان کے اپنے بس میں ہوتا ہے باہر کی کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی اگر عقل و شعور ساتھ دے تو وقت کی ہر تان گرفت میں آ جاتی ہے ورنہ ہر ڈانٹ اور نصیحت بے سود ہوتی ہے جب تک انسان اپنے اندر ڈانٹ پھٹکار کا ایک دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ بھٹکنا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے اور جیسے ہی وہ اس دروازے کو بند کرتا ہے سچائی کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور انسان لمبی تاریک بند گلی میں قید ہو جاتا ہے اور پھر اس کی گھٹن سے اندر ہی اندر ختم ہو جاتا ہے۔

وہ لڑکیوں کو بلاوجہ روک ٹوک کی قائل نہ تھی مگر کافی عرصے سے ان کے رنگ ڈھنگ اور سرگرمیاں دیکھ کر پریشان ہو جاتی اور ان میں اکثریت ایسی لڑکیوں کی تھی جو گھروں کی قید سے آزاد ہو کر نئے ماحول کی چونکا دینے والی روشنی کی لپیٹ میں آ گئی تھیں۔ کچھ تو ایسی تھیں جو یہ سب قبول کرنے سے گھبرا رہی تھیں اور کچھ ظاہراً تو قدامت پسند تھیں مگر اندر سے سب کچھ حاصل کرنا چاہتی تھیں اور قبول کرنے اور نہ کرنے کی شدید جنگ میں مبتلا تھیں اور ان کی وجہ سے ایسے ایسے نفسیاتی مسائل ابھر رہے تھے کہ وہ خود پریشان ہو کر رہ جاتی اور سب سے زیادہ مسائل تو وہ لڑکیاں پیدا کر رہی تھیں جو آزاد ماحول کی پروردہ تھیں اور جو کسی بھی قسم کی پابندی کو خاطر میں نہ لاتیں اور بلا روک ٹوک ہر کام بخوبی سرانجام دیتیں۔ لڑکیوں کے اس گروہ نے جن کو گھروں سے بھی ہر طرح کا تعاون حاصل تھا اور انتظامیہ کی جانب سے بھی Support تھی۔ دوسری لڑکیوں کے لیے مسلسل اذیت کا باعث بنی ہوئی تھیں۔

بہت دنوں سے ہاسٹل میں ایک ایسی لڑکی آئی تھی جس نے پچھلے تمام سابقہ ریکارڈ توڑنے کی شاید قسم کھا رکھی تھی۔ رات گئے وہ واپس لوٹتی اور نت نئے جدید فیشن کے

ملبوسات زیورات، پرفیومز اور دوسرے لوازمات سے دوسری لڑکیوں کا جی جلاتی۔ ہر روز نئی گاڑی، نیا ڈرائیور...... نئے نئے سٹائلز...... کچھ حسد بھری نگاہوں سے اور کچھ رشک سے اس کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتیں۔ تاثرات سے بھی وہ کوئی اچھی لڑکی نہ لگتی تھی ہر کوئی اس کے بارے میں مختلف رائے رکھتا تھا اور مختلف ریمارکس دیتا تھا۔ نہ کوئی اسے دیر سے آنے سے روک سکتا تھا نہ باہر رہنے سے روک سکتا تھا کیونکہ ہر بااثر آدمی سے اس کی شناسائی تھی اور اس کا باپ بھی بہت بااثر سیاست دان تھا۔ وہ کسی صنعت کار خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ہاسٹل میں ایک خاص کمرہ اس کے لیے مخصوص تھا جس پر اکثر لڑکیاں کھٹ پٹ کرتیں۔ اس کی حرکتوں سے شہ پا کر کچھ ایسی ویسی حرکت کرتیں تو پکڑی جاتیں اور پکڑے جانے پر یا تو دل برداشتہ ہو کر ہاسٹل چھوڑ دیتیں یا پھر مکمل محاذ آرائی پر اتر آتیں...... ہاسٹل کا ماحول اس سے دن بدن مکدر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کی وجہ سے بہت پریشان تھی اس کو سمجھانا چاہتی تھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وہ کبھی بھی اس سے ملاقات کرنے نہ آتی۔ کالج میں انہی دنوں چھٹیاں ہو رہی تھیں سب لڑکیاں اپنے اپنے سامان باندھے گھروں کو روانہ ہو رہی تھیں صرف وہی ایک باقی تھی وہ دو تین دن انتظار کرتی رہی کہ وہ جائے تو وہ بھی اپنے شہر جائے۔ حسن سے اس کا دل ملنے کو بہت چاہ رہا تھا نجانے کیوں دل اس کو ایک بار دیکھنے کی شدید تڑپ ظاہر کر رہا تھا۔ بالآخر تنگ آ کر اس نے اسے بلا بھیجا۔

"آؤ قندیل میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی" اس نے بھرپور نگاہ سے اس کا جائزہ لیا۔ جدید فیشن کی ہر چیز اس نے اپنے اوپر اپلائی کی ہوئی تھی۔

"تم گھر نہیں گئی......" اس نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"میڈم میری کچھ کمٹمنٹس ہیں شاید میں نہ جا سکوں۔" وہ بے باکی سے بولی۔

"گھر سے بھی زیادہ کوئی کمٹمنٹ ہو گی۔" وہ قدرے بدتمیزی سے بولی۔

"میڈم یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"آئی سی...... لیکن ہاسٹل میں اس کی اجازت نہیں...... میرا مطلب ہے کالج بند ہو چکا ہے...... اور تم......" ضحیٰ معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میڈم انتظامیہ سے میری بات ہو چکی ہے میں کچھ دن یہاں رہ سکتی ہوں۔"

اور اس نے لیٹر اس کی جانب بڑھایا۔

وہ لیٹر دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

"بس کہ کچھ اور......" وہ تلخی سے بولی۔

"نہیں......" وہ ہونٹ چبانے لگی۔

وہ پاؤں پٹختی باہر نکل رہی تھی جب اس نے آواز دی۔

"سنو......"

اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"جس طرح کی زندگی تم گزار رہی ہو...... اصل میں وہ زندگی نہیں اس کا مفہوم کچھ اور ہے......" ضحیٰ نے دبے دبے الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"سب جانتی ہوں......" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"کیا......؟"

"لوگ کہتے ہیں زندگی جس کو
ایک بے ربط سی کہانی ہے"

اس نے بھرپور قہقہہ لگا کر جواب دیا۔

"ایسی بات نہیں...... اس کا مفہوم بہت گہرا ہے کبھی فرصت ملے تو اس پر سوچنا ضرور اور سمجھنے کی بھی کوشش کرنا اور اپنے آپ کو ضائع مت کرو۔"

"میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔" وہ قدرے طنزیہ انداز میں بولی۔

"یہی تو بات ہے اگر تم سمجھتی تو ایسا نہ کرتی، ہمارے ہاں یہی تو المیہ ہے کہ ہم کبھی کبھار اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہیں حالانکہ ہم صریحاً غلطی پر ہوتے ہیں مگر اس وقت ہمیں احساس نہیں ہوتا...... احساس تب ہوتا ہے جب سوائے پچھتاوے کے پاس کچھ نہیں رہتا۔" ضحیٰ نے بلاواسطہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ میں نادم ہوتی پھروں......" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"اور جو تم کرتی ہو کیا وہ سب ٹھیک ہے کبھی اس پر سوچا ہے تم نے اور جب

تمہارے والدین کو ان سب باتوں کا علم ہوگا تو ان پر کیا گزرے گی۔

''والدین...... میرے لیے وہ کوئی معنی نہیں رکھتے میری زندگی میں ان کی حیثیت دو بدمزاج میاں بیوی کے سوا کچھ بھی نہیں......'' اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ ساری رات اس کے بارے میں سوچتی رہی وہ بھی ایسے ہی حالات سے گزری تھی مگر وہ اتنی Irrational ،Cynical اور Out spoken نہ تھی جتنی کہ قندیل تھی شاید اس کے حالات زیادہ ہی ابتر ہوں گے اس کو دکھ سا ہونے لگا نجانے کیوں ایسے والدین ایک بندھن میں بندھ کر ساری زندگی اولاد کو سولی پر لٹکا دیتے ہیں اور پھر آئندہ نسلیں ناکردہ گناہ کی پاداش میں ساری زندگی Suffer کرتی رہتی ہیں۔ وہ بے چین ہونے لگی۔ اس کو ایک دم حسن کا خیال آنے لگا۔ نجانے وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا...... وہ چند دنوں کے لیے گھر جانا چاہتی تھی جو شاید اس لڑکی کی وجہ سے ناممکن نظر آرہا تھا۔ وہ صبح ناشتہ کرکے جاتی اور رات گئے لوٹتی...... کئی دنوں سے وہ اس کی منتظر تھی کہ وہ آئے اور پھر اس سے بات کرے مگر اس تک رسائی نہ ہو رہی تھی۔

رات کے بارہ بج رہے تھے جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ چونکی ''اندر آجاؤ...... دروازہ کھلا ہے۔'' وہ اس وقت عبادت میں مصروف تھی۔ کمرے میں زیرو کا بلب آن تھا اور اس کی سفید دودھیا روشنی اس کی سفید لبادے میں ملبوس شخصیت کو مزید سحر انگیز بنا رہی تھی۔

قندیل اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پریشان حال، بکھرے بال اور چہرے پر پژمردگی کے آثار کافی حد تک نمایاں تھے۔

''میڈم آپ اس دن میرے والدین کی بات کر رہی تھی نا یہ دیکھیں میرے باپ نے ایک رقاصہ سے شادی کر لی ہے...... اس عمر میں...... یہ دیکھیں...... کیا لکھا ہے...... ملک کے مشہور سیاست دان کی ایک رقاصہ سے شادی......'' اس نے اخبار اس کی جانب بڑھائی۔

''ایسے ہوتے ہیں نا والدین...... ایسے لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کی ایسی حرکتوں سے ان کی اولاد پر کیا اثر پڑتا ہے۔ جب میں دوسرے کالج میں پڑھتی تھی میں بعد میں پہنچی کی لیکن میرے باپ کی شہرت اور اس کی سرگرمیاں، اس کی حرکات وسکنات سب رپوٹیں مجھ سے پہلے وہاں پہنچی ہوتی تھیں اور مجھے ایسی نظروں اور ایسی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کہ مجھے کہیں کوئی ایسا کونہ نہ ملتا تھا جہاں میں چھپ سکوں۔ پھر میں نے یہی سوچا کہ جیسے والدین ہوتے ہیں ویسی ہی اولاد ہوتی ہے۔'' وہ رونا شروع ہوگئی۔

''بیٹھو......'' اس نے ٹیوب لائٹ آن کی اور فریج سے پانی کا ٹھنڈا گلاس اسے دیا۔

''اب بتاؤ کیا بات ہے......؟'' اس نے قدرے ملائمت سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''کیا بتاؤں...... کہاں سے شروع کروں...... یہ تو میری ساری زندگی کی کہانی ہے کیا آپ سن سکیں گی......؟''

''ہاں...... میں سن رہی ہوں، اور جانتی ہوں کہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ انسان کسی دوسرے کو کچھ سنانا چاہتا ہے لیکن سننے والا کوئی نہیں ہوتا، دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے اور اگر سننے والے ہوں بھی تو ایسے مخلص نہیں ہوتے کہ ان پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کیا جاسکے لیکن تم مجھ پر اعتماد بھی کر سکتی ہو اور مجھے سب کچھ سنا بھی سکتی ہوں...... کہو جو کچھ تم کہنا چاہتی ہو...... وہ سب جو تم کسی اور سے نہیں کہہ سکتی۔'' اس نے محبت سے کہا۔

وہ رونا شروع ہوگئی یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی اور اس لمحے وہ اسے اتنی معصوم اور پیاری لگی کہ اس نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ دور نفسیاتی الجھنوں کا ہے، مادیت پرستی نے ذہنوں کو مفلوج کرکے رکھ دیا ہے ظاہراً چلتے پھرتے انسان یوں اپنے آپ میں کھوئے کھوئے پریشان رہتے ہیں کہ ذرا سی ٹھوکر لگتی ہے تو ریت کی بھربھری عمارت کی مانند ایک دم گر جاتے ہیں۔ بالکل بے حوصلہ ہو جاتے ہیں نوجوان تو ملک وقوم کا سرمایہ ہوتے ہیں مگر اس وقت جتنا انتشار ان میں ہے شاید ہی کسی اور میں ہو...... لیکن اس خلفشار سے بچنے کے لیے اپنے آپ میں ہمت پیدا کرو۔ قدم بڑھاؤ منزل تمہارے سامنے ہوگی اور دوسری بات کہ انسان کے ہر دکھ درد، تکلیف کا حل ضرور اس کی اپنی ذات کے اندر ہی کہیں موجود ہوتا ہے صرف ادراک کی ضرورت ہوتی ہے یا پھر کبھی کبھار رہنمائی کی...... سنو خدا نے نفس

انسانی کو اتنا کمزور نہیں بنایا کہ ایک ہی جھونکے سے تنکا تنکا بکھر جائے۔ اس میں پہاڑ جیسی شکستگی کا سامنا کرنے کی بھی طاقت ہے اور اس میں سمندر جیسی گہرائی اور آسمان جیسی وسعت کو بھی سمیٹنے کی صلاحیت ہے۔'' اس نے آہستہ آہستہ اسے سمجھایا۔

اچانک فون کی بیلز نے اگرد گرد کے سکوت کو توڑا اور جیسے ہی اس نے فون سنا تو ریسیور اس کے ہاتھ سے لڑھک گیا وہ وہیں پر نیم بے ہوش ہوگئی۔

(43)

''کیا ہوا میڈم......'' وہ پریشان سی اسے ہوش دلانے لگی۔

''پلیز مجھے حسن کے پاس لے چلو......'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''کون حسن......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا بیٹا...... وہ تھانے میں بند ہے...... میرے ہی شہر میں...... اور پتا نہیں کیوں وہ تو چڑیا کو بھی نہیں مار سکتا اور یہ سب کیا ہو گیا......؟'' وہ بے بسی سے گڑگڑانے لگی۔

اس نے جلدی سے گاڑی نکالی اور اس کو لے کر روانہ ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پولیس اسٹیشن میں تھے۔

''حسن کا قصور کیا ہے......؟'' اس نے پولیس افسر سے پوچھا۔

''وہ دہشت گردوں کے گروہ کے ساتھ پکڑا گیا ہے......'' پولیس افسر کرختگی سے بولا۔

''نہیں...... وہ دہشت گرد نہیں ہو سکتا...... وہ تو...... یہ بہت غلط ہے، اس نے تو کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی۔''

''سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ ان کی اولادیں بہت نیک پاک اور معصوم ہیں وہ تو بعد میں پتا چلتا ہے...... جب وہ گل کھلاتی ہیں۔'' وہ طنزاً بولا۔

''میں حسن سے ملنا چاہتی ہوں......'' وہ بے قراری سے بولی۔

''وہ...... اس وقت نہیں...... مل سکتا'' وہ مصر رہی۔

''کیوں...... میں اسی وقت ملنا چاہتی ہوں۔''

''ممکن نہیں......'' پولیس افسر اپنی بات پر بضد رہا۔

'میڈم آپ ٹھہریں ایک منٹ......'' قندیل نے پرس سے کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

''آپ ان کی کیا لگتی ہیں......؟'' پولیس افسر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''میرے والد ہیں......''

''ٹھیک ہے لیکن ملاقات زیادہ دیر کے لیے نہیں ہو سکتی۔''

''حسن سے مل کر اس کی چیخیں نکل گئیں، پولیس نے اس پر اتنا تشدد کیا تھا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا...... اس کا سارا جسم جگہ جگہ سے لہولہان ہو رہا تھا۔ اس نے ضحیٰ کو بھی نہ پہچانا، نیم بے ہوش، پژمردہ چہرہ...... بڑھی ہوئی شیو، اس کے کپڑے تک پھٹ چکے تھے...... اسے دیکھ کر رونا شروع ہوا اور وہ اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی خلائی مخلوق ہو جس کو وہ قدرے حیرانی سے دیکھ رہا ہو۔

''حسن...... حسن کچھ تو بولو...... کیا ہوا ہے تمہیں......'' وہ اسے بلاتی رہی۔ روتی رہی۔

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا......

''میڈم آپ فکر نہ کریں میں ابھی پاپا کو فون کرتی ہوں اگر وہ کچھ کر سکے تو ضرور یہ رہا ہو جائے گا......'' قندیل نے اسے دلاسا دیا اور اسی لمحے جا کر اس نے فون کیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے رہا کر دیا گیا......

بہت سالوں کے بعد وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں ان دونوں کے ہمراہ داخل ہوئی ہر طرف گرد ہی گرد تھی جالے ہی جالے لٹک رہے تھے۔ چیزیں بے ترتیب سی ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں صرف چوکیدار موجود تھا اور گھر پر کوئی بھی نہ تھا۔ چوکیدار نے اپنی بیوی کو اسی وقت بھیجا اس نے تھوڑا بہت گھر صاف کیا۔ حسن مضمحل سا خاموش سا ویران اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

''حسن بیٹا...... کچھ تو بولو...... خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ......'' وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

اس کا کوئی جواب نہ پا کر اس نے فیض کو فون کیا پتا چلا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے فرانس گیا ہے۔ پھر اس نے عزیز کو فون کیا وہ ہاسپٹل میں ہی تھا...... اس نے ساری بات اسے بتائی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خود آ گیا...... حسن کو اچھی طرح دیکھا۔

''ضحیٰ...... اس کو کچھ دنوں کے لیے ہاسپٹل ایڈمٹ کرا دو......'' عزیز نے مشورہ دیا۔

''کیوں کوئی سیریس پرابلم ہے...؟''

''ہاں... لگتا تو ایسا ہی ہے۔''

''ہاں...... بہتر تو یہی ہے......''

وہ اس کو لے کر ہسپتال گئے اس کی مرہم پٹی کی اور اس کو نیند کا انجکشن دے کر سلا دیا۔

''عزیز اسے ہوا کیا ہے......؟'' اس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''لگتا ہے کسی گہرے صدمے کا اثر ہے...... اب یہ ذرا نارمل ہو اور ہمیں کچھ بتائے تو پھر علاج کریں۔'' عزیز نے جواب دیا۔

''عزیز یقین مانو...... حسن بہت نفیس لڑکا ہے، میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی کہ کسی برائی کا خیال بھی اس کے دل میں آ سکتا ہے'' وہ بتاتے ہوئے رو پڑی۔

''تم لوگ گھر جاؤ، ضرورت پڑے گی تو میں بلا لوں گا...... تمہاری مہمان بھی تمہارے ساتھ پریشان ہے۔'' عزیز نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... آئی ایم سوری......'' اس نے قندیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''چلو گھر چلتے ہیں، پھر آرام سے باتیں ہوں گی۔''

کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے آرام کرنے چلی گئیں...... رات کو عزیز کا فون آیا کہ ابھی تک وہ سو رہا ہے اور فکر کی بات نہیں۔

''قندیل تمہیں میری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑی...... لیکن حالات ہی ایسے تھے...... میں تو تمہاری کہانی سن رہی تھی مگر یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ کچھ سمجھ نہیں آیا...... اب بتاؤ کیا بات ہے......؟'' ضحیٰ قندیل کو افسردہ دیکھ کر بولی۔

''میڈم کیا بتاؤں...... میرا کوئی اچھا بیک گراؤنڈ نہیں کہ اس کو سناؤں۔ خیر بتاتی ہوں...... میں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں دولت کی ریل پیل تو تھی مگر شرافت نام کی کوئی چیز نہ تھی...... میرا باپ انتہا درجے کا بدقماش انسان ہے اور ماں اتنی ہی نیک اور صابر...... دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باپ کا مزاج سورج کی کرنوں کی مانند گرم اور چبھنے والا اور ماں کا ماہتاب کی نرم مدھم روشنی کی مانند میٹھا اور خوشگوار...... ہم چار بہن بھائی ہیں۔ سب سے چھوٹی میں ہوں میرا باپ گھر میں میری ماں کے سامنے ہر روز نت نئی عورتوں کو لاتا پھرتا۔ ماں میں اور باپ میں بہت جھگڑے ہوتا یہاں تک

کہ وہ ماں کو اکثر بہت پیٹتا اور اس وقت ہم چاروں بہن بھائی بند کمرے میں بہت روتے اور یہی دعا کرتے کہ وہ دونوں مر جائیں...... پھر آہستہ آہستہ ہم ان باتوں کے عادی ہونے لگے ماں بستر پہ لگ گئی گھر میں لڑائی جھگڑا بند ہو گیا...... ماں کو ایسا فالج ہوا کہ دوبارہ نہ اٹھ سکی اور اسی حالت میں فوت ہو گئی...... میرے باپ کو اور کھلی چھٹی مل گئی اس کا شمار ان مردوں میں ہوتا ہے جو پیسے کے بدلے ہر چیز کو خریدنا اپنا جائز حق سمجھتے ہیں وہ بالکل نہیں جانتا کہ عورت کیا ہوتی ہے اس کی عزت کیا ہوتی ہے وہ صرف اسے Use کرنا جانتا ہے۔ وہ عورت کو تو کیا کسی انسان کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ گاؤں میں مزارعوں سے اور غریب لوگوں سے بہت برا سلوک کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی گھر میں توجہ بالکل کم ہونے لگی...... بڑی بہن نے اپنی پسند سے شادی کر لی اور فوراً ہی جرمنی چلی گئی۔ بھائی بھی آہستہ آہستہ باپ کے رنگ میں رنگنا شروع ہو گئے وہ بھی وہی کچھ کرتے ہیں جو باپ کرتا ہے اب کوئی بھی کسی کو روکنے ٹوکنے والا نہیں...... جہاں تک میرا تعلق ہے میری کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہر مہینے وہ خرچ بھیج کر سمجھتے ہیں کہ ان کا فرض پورا ہو گیا ہے میں کیا ہوں...... کیا سوچتی ہوں...... کیا کرتی ہوں کسی کو اس سے کوئی تعلق نہیں اور وہ مجھ سے کیا پوچھیں جب کہ وہ خود......“ وہ رونا شروع ہو گئی۔

”اب آپ خود ہی بتائیں ہم جیسی لڑکیاں کہاں سے آدرش لائیں...... کہاں بیٹھ کر نظریات پالیں اور کس لیے...... جبکہ ہمارے لیے زندگی صرف اور صرف مادی خواہشات کی تکمیل کا نام ہے...... ہماری دنیا میں جو اہمیت کپڑوں، زیورات، کلبز اور ہوٹلز رکھتے ہیں انسان ان کی جگہ کبھی بھی نہیں لے سکتے...... ہم کیا جانیں کہ انسان کیا ہوتا ہے...... اس کا آدرش...... اس کی سوچ...... اس کے نظریات کہاں جنم لیتے ہیں ہر روز میک اپ کی نئی تہہ کے ساتھ ساتھ ہماری روحوں پر بھی تہیں جمتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اصل چہرے کی طرح روح بھی مسخ ہو جاتی ہے...... اور جب کبھی ہمیں خود اپنا اصل چہرہ دیکھنے کو ملتا ہے تو وہاں کراہت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا آپ ہی بتائیں کہ روح پر جمی تہہ کو اتارنے کے لیے کونسا ٹانک یا لوشن استعمال کریں ہماری اصل کیا ہے......؟ کسی کو اس سے غرض نہیں...... ہم کیا ہیں اور سوسائٹی میں کس طرح Move کر رہے ہیں ہر کوئی یہی جاننے کی فکر میں رہتا ہے۔ مجھ جیسی لڑکیاں تو اپنی ہی ذات میں ریت کے ذروں کی مانند بکھری رہتی ہیں۔ لمحہ لمحہ پگھلتی رہتی

ہیں ہم مکمل شخصیت، اعتماد، محبت اور خلوص کہاں سے لائیں جبکہ ہم خود ان لفظوں سے آشنا نہیں...... حقیقت میں یہ سب کیا ہے ہم نہیں جانتے...... ہم جیسی لڑکیوں کو وراثت میں کیا ملتا ہے سوائے لڑائی جھگڑے، بد اعتمادی اور بے سکونی کے...... ہم تو ایک ایک لمحہ خوشیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں کہ کاش ہمیں کہیں سے چند لمحوں کے لیے ہی سکون مل جائے مگر سکون نہیں ملتا...... ہمارے دل کرچی کرچی ہو جاتے ہیں اور روحیں تشنہ رہتی ہیں...... ہم لوگ اندر سے ابنارمل ہو جاتے ہیں مگر جسم سلامت رہتے ہیں...... شاید خدا کو بھی ہم جیسے لوگوں پر رحم نہیں آتا وہ بھی ہماری قسمتوں سے کھیل کر خوش ہوتا ہے......“ وہ کافی دیر روتی رہی۔

”ایسا مت کہو...... خدا کبھی بھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا...... کہیں ہمارے خلوص میں کمی آ جاتی ہے یا کہیں ہماری نیتوں میں فتور...... یا پھر کہیں اٹھتے قدموں میں لغزش، جب تک ہم اس کی ذات کے بارے میں پر اعتماد نہیں ہوں گے ہم لڑکھڑاتے رہیں گے وہ تو لمحہ بہ لمحہ ہماری سوئی قوتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ہم ہی بے خبر رہتے ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے ہم قدم اٹھائیں اور نیچے زمین نہ ہو...... ہر انسان کے ساتھ مسئلے ہوتے ہیں کون ہے جو مسائل کے بغیر ہو فرق صرف اتنا ہے کہ مسائل کی نوعیت مختلف ہوگی ورنہ مسائل ہر جگہ موجود ہیں باہر نکل کے دیکھو لوگ کیسے کیسے حالات میں زندہ ہیں کچھ ننگے جسموں کے ساتھ صرف دو وقت کی روٹی کے لیے ترس رہے ہیں کہیں عزتیں محفوظ نہیں...... کہیں کھانے کو ہے تو تن ڈھانپنے کو نہیں...... کہیں سب کچھ ہے مگر ذہنی آسودگی نہیں...... ایسے حالات، جن کو ہم ناقابل برداشت سمجھتے ہیں اگر اپنے آپ کو ان کی جگہ رکھ کر سوچیں تو نجانے کب کے مر چکے ہوتے مگر ان لوگوں کے بارے میں سوچو کہ وہ کس طرح زندہ ہیں اور پر عزم بھی ہیں اور پر امید بھی...... مسائل کا حل یہ تو نہیں ہوتا کہ راہ فرار اختیار کر لی جائے یا غلط راستہ منتخب کر لیا جائے ہم اپنے ہر عمل اور ہر سوچ کے لیے جوابدہ ہیں...... پھر کیوں ایسا کیا جائے...... صرف یہی بات ذہن میں ہو تو انسان کبھی نہیں بھٹکتا...... تم یہ سوچو کہ جب ہمارے اعضاء بھی ٹھیک ہوں۔ ذہن بھی مسلسل سوچ رہا ہو آنکھیں بھی دیکھ رہی ہوں اور فہم و ادراک بھی زندہ ہو تو پھر کس چیز کی کمی ہے کیا حالات سے تنگ آ کر انسان کسی اور طرف لگ جائے...... تم اپنے ماں باپ سے حاصل کردہ نفرت کو جس صورت میں ادا کرنے جا رہی ہو وہ ٹھیک نہیں...... تمہارا نفس تم سے کسی اور چیز کا

تقاضا کرتا ہے...... وہ تمہارے اندر کی ساری قوتوں کا مظاہرہ چاہتا ہے...... تمہارے اندر کیا کیا پنہاں ہے کبھی تم نے اس کے بارے میں سوچا ہے...... تمہارے اندر کیا کچھ پنپ رہا ہے...... کیا کچھ جل رہا ہے...... کیا کچھ ضائع ہو رہا ہے...... آخر ان سب کا ماخذ اور حاصل کیا ہے...... کیا وجود انسانی اتنا ارزاں ہے کہ اس کو یونہی ضائع ہونے دیا جائے...... جب انسان کا وجود تخلیق ہوتا ہے تو کن کن پردوں میں اور کہاں کہاں خدا اس کی حفاظت کرتا ہے ہر جگہ اس کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے کہاں سے خوراک اور کہاں سے سانسیں اس کو بہم پہنچاتا ہے اور جب انسان باشعور ہوتا ہے تو خود ہی اپنے آپ کو مارنے کے درپے ہو جاتا ہے اس وقت خدا کیا کرے...... وہ تو یہی سوچتا ہے کہ جب تم میرے پر انحصار کرتے تھے تو میں نے تمہیں کس طرح حفاظت سے رکھا اب اپنی سوچوں اور خواہشات پر انحصار کرتے ہو تو کہاں بھٹکے چلے جاتے ہو...... تم کیا بن گئے ہو؟...... میں تو صرف یہی کہوں گی...... کہیں نہ دیکھو...... کسی کے بارے میں نہ سوچو صرف اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کرو...... اگر نظر صحیح ہو گی اور زاویہ درست ہو گا تو اک جہاں نظر آ جائے گا پوری طرح روشن اس خاکی جہاں سے ماورٰی...... ویسا ہی جیسا تمہاری سوچ ہو گی...... ایسا جیسا تم سمجھو گی سب سے مختلف...... پھر پرت پہ پرت کھلتا جائے گا...... اسرار ظاہر ہوتے جائیں گے یہاں تک کہ وجود ختم ہو جائے گا...... ہر ایک کی زندگی میں ایک بار ضرور دستک ہوتی ہے...... کبھی یونہی چلتے چلتے...... کبھی ٹھوکر لگنے پر کبھی کوئی بازی ہار کر...... کبھی منہ کے بل گر کر اور کبھی سارا کچھ ہار کر...... صرف اس دستک کو سمجھنے کی بات ہے...... اس کے بعد ایسا سفر شروع ہو جاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا...... حاصل اور لاحاصل کے درمیان جنگ ختم ہو جاتی ہے بس اک چپ سی لگ جاتی ہے...... ایسی چپ جس میں نہ کوئی افسوس ہوتا ہے نہ پچھتاوا نہ دکھ بس اک شانتی سی ہوتی ہے...... اقرار سا ہوتا ہے اور سکون بھی......'' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور قندیل اس کے چہرے پر پھیلی شانتی کو غور سے دیکھنے لگے۔

دونوں ہی خاموش ہو گئیں۔

❁......❁......❁

وہ عزیز کے پاس بیٹھی حسن کے بارے میں سن کر بہت متفکر ہو رہی تھی وہ بھی خود بہت پریشان تھا کہ حسن کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئے اتنے دن ہو چکے ہیں مگر وہ ذرا

بھی بہتر نہیں ہو رہا تھا۔

''مجھے یوں لگتا ہے کہ شاید صدمہ بہت شدید تھا جس کا اس نے اتنا اثر لیا ہے تم ایسا کرو اس کے ہاسٹل جاؤ...... اس کے دوستوں سے ملو اور ہاں...... اس کا سامان کہاں ہے اس میں سے کچھ ایسا ڈھونڈو جس سے ہمیں کوئی سراغ مل سکے...... کوئی اشارہ کوئی Clue'' عزیز نے اسے مشورہ دیا۔

''لیکن حسن بول کیوں نہیں رہا......؟'' وہ پریشانی سے بولی۔

''فی الوقت تو میں اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا مجھے یوں لگتا ہے جیسے اسے ہسٹریا Hysteria ہے۔ ہسٹریا کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں ان میں سے ایک دو یہ ہیں کہ ظاہراً تو اعضاء میں کوئی خرابی نہیں ہوتی مثلاً کوئی مریض بول نہ سکتا ہو جبکہ اس کے تمام صوتی آلات بھی ٹھیک ہوں...... یہ بھی مجھے ایسے ہی لگتا ہے...... اسے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بول نہیں سکتا اگر یہ بولا تو کچھ طوفان نہ برپا ہو جائے۔ جیسا کہ تم نے بتایا کہ بچپن میں بھی یہ بیمار ہوا تھا تب اس میں Neurosis تھا یا کچھ Phobias اور مائنڈ نہ کرنا کچھ اس کی شخصیت بھی Balanced نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے اندر بہت سارے Complexes ہوں گے اور کوئی اچانک صدمہ ہوا ہے جس کو یہ Face نہیں کر سکا شاید اس وجہ سے ہی یہ سب کچھ ہوا ہے۔'' عزیز نے وجوہات بیان کیں۔

لیکن کیا تم بتاؤ گی کہ جب یہ نارمل تھا تب کس قسم کا انسان تھا......؟'' عزیز نے سوال کیا۔

''بہت اچھا...... بہت کم گو...... ہمیشہ کوئی کام ہوتا تب بات کرتا یوں سمجھو کہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا بہت کم اس کے ملنے جلنے والے تھے اور دوست تو بالکل تھے ہی نہیں اگر کوئی مسئلہ یا پریشانی ہوتی تب بھی ذکر نہیں کرتا تھا Will Power اور Decisive Power بھی بہت کم تھی۔'' وہ آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔

''اس کا مطلب ہے Schizo Phrenic Symptoms اس میں کافی تھے اور جب کوئی مسئلہ شدت اختیار کرتا تھا تو یہ کیا کرتا تھا......؟'' عزز نے کریدنا چاہا۔

''گھنٹوں ایک ہی حالت میں بیٹھا رہتا تھا یا پھر ہر وقت چکر لگاتا رہتا تھا۔'' وہ بولی۔

مجھے کچھ کچھ تو سمجھ آ گئی ہے پلیز اس کے روم میٹس سے Contact کرو پھر مجھے بتاؤ کہ یہ ان لوگوں کے پاس کیسے گیا......'' عزیز نے رائے دی۔

''اچھا میں کوشش کرتی ہوں......'' وہ بے دلی سے اٹھی۔

اور وہ قندیل کے ساتھ اس کے ہاسٹل گئی جس دوست کو وہ ندا کے لیے خط دے کر آیا تھا اس سے ملاقات ہوئی لیکن ندا کے بارے میں مزید کچھ پتا نہ چل سکا کیونکہ وہ بہت دنوں سے یونیورسٹی نہیں آ رہی تھی...... پھر اس انیکسی میں گئی جہاں پر اس کا سامان پڑا تھا انیکسی اب بند پڑی تھی۔ بڑی تگ و دو سے اس کو کھلوایا اور اس میں سے اس کا سامان نکالا...... اس میں ہی اسے وہ ڈائری ملی جونہی اس نے ڈائری کھولی درمیان میں ایک صفحے پر لکھا تھا۔

کبھی ساون کی بدلتی رتوں میں
کبھی چھم چھم برستی برکھا میں
کبھی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو میں
کبھی چاند کی جادوئی کرنوں میں
کبھی لہروں کی روانی میں
کبھی سورج کی تابانی میں
کبھی بھنوروں کے سنگ اڑتی پھرتی
تتلیوں میں
کبھی خوشبوؤں کے میلے میں
میں اکثر زندگی کے رنگ پاتا تھا
ہر نئے رنگ پر مسکان سی لبوں پہ مچلتی تھی
مگر ہر مسکراہٹ میں ایک ٹیس سی ضرور اٹھتی تھی
ہر نئی چبھن میں اک کسک سی ضرور ہوتی تھی
پھر زور سے ٹھوکر لگتی تھی
ٹوٹتا تھا، بکھرتا تھا اور کرچی کرچی ہوتا تھا
پھر اٹھتا تھا پھر سنبھلتا تھا

پھر ذرہ ذرہ خوابوں کو میں اکثر جوڑا کرتا تھا
انہیں آنکھوں میں سما کے پھر زندگی کو دیکھا کرتا تھا
مگر جب ٹھوکر پہ ٹھوکر لگتی ہے
تو سوچتا ہوں
ایسا کیوں ہوتا ہے بار بار
شاید کاتب تقدیر نے قلم کی سیاہی
بدلی ہوگی بار بار
شاید قلم بھی ٹوٹا ہوگا بار بار

پڑھ کر اسے دکھ سا ہونے لگا اس نے اگلا صفحہ کھولا وہ سارا ندا کے نام تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ ندا خوبصورت نہیں مگر میں کہتا ہوں ندا تو ساری کائنات میں سب سے زیادہ حسین ہے۔ کائنات کا تمام بکھرا حسن سمٹ کر ندا کی ذات میں جمع ہو گیا ہے جو جذبوں کو سمجھے جو احساسات کو محسوس کرے جو سوچوں پہ حاوی ہو اور جو دھڑکنوں کا حصہ بن جائے جو سانسوں میں رچ بس جائے جو روح میں اتر جائے تو اس سے زیادہ حسین کائنات میں کون ہوگا ندا کے لیے ایک شعر ہے۔

خدا کی قسم سر سے پیروں تلک
تم ایک پھول ہو، شعر ہو، راگ ہو
رگ رگ میں اس کا لمس اترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو وے انتہائی دے

اس نے ایک اور صفحہ کھولا اس میں بھی ندا کے بارے میں ہی لکھا تھا پھر اچانک حالات بدلنے لگے...... اندر کے موسم اور ہوائیں رخ بدلنے لگیں...... ناامید زندگی میں جو امید کی کرن تھی جو دیے روشن ہوئے تھے اب آہستہ آہستہ ان کی لو پھر کم ہونے لگی اس نے وہ سارے واقعات پڑھے جو اس کے ساتھ پیش آئے تھے۔ آخر میں ایک شعر اس کے دل میں کھب سا گیا۔

ان کے آجانے سے کچھ تھم سے گئے تھے آنسو
ان کے جاتے ہی مگر رونے کے عادی روئے

وہ اس کی ڈائری پڑھ کر رو دی اور اسے عزیز کے پاس لے کر گئی اس نے بھی تمام حالات و واقعات کا جائزہ لیا۔

"ضحیٰ اب مجھے ساری بات سمجھ میں آ گئی ہے...... اس ڈائری کے آخری صفحے کی تاریخ اور پولیس اسٹیشن جانے کی تاریخ میں صرف ایک رات کا وقفہ ہے۔ وہ اوپر تلے دو شدید صدموں سے دو چار ہوا ہے وہ اعصاب کا پہلے ہی کمزور تھا...... دو شدید حملوں کو Face نہیں کر سکا اور توازن کھو بیٹھا ہے۔" عزیز نے منطقی انداز میں اسے سمجھایا۔

"لیکن اب کیا ہوگا......؟ پلیز کچھ کرو......" وہ روہانسی ہوگئی۔

"میں اپنی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں......تم دعا کرو خدا بہتر کرے۔"

وہ گھر واپس آئی تو بہت پریشان تھی...... قندیل کھانے پر اس کی منتظر تھی اس نے کھانا بھی بہت کم کھایا۔

"قندیل......تم گھر چلی جاؤ......تمہارے گھر والے منتظر ہوں گے......"

"میڈم...... ان کو میری کوئی فکر نہیں...... میں نے گھر اطلاع دی تھی کہ میں آپ کے ساتھ جا رہی ہوں کسی نے کچھ نہیں کہا......" وہ آہستہ سے بولی۔

"لیکن میں یہی بہتر سمجھتی ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے گھر ہو آؤ"

"جی اچھا......" وہ چپ ہو رہی۔

اگلی صبح وہ اپنے گھر چلی گئی اور وہ ہسپتال میں حسن کے پاس چلی گئی حسن کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل کٹتا تھا اس کو وہ حسن بھی شدت سے یاد آ رہا تھا جو اسی کی طرح ہسپتال میں آخری سانسیں گن چکا تھا اور یہ حسن...... خدا نہ کرے وہ سوچ کر ہی کانپ گئی...... اس حسن سے ظاہراً اس کا کوئی رشتہ نہ تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے اندر اٹھتی ٹیسوں کو اپنے اندر محسوس کر رہی ہو...... شاید محبت کے لیے رشتوں کی قید اور بندھن ضروری نہیں اسے حسن پر پیار سا آنے لگا جس نے بچپن میں ماں باپ کھو دیئے اور پھر ساری زندگی چپ کی مہر لبوں پر سجائے بنا کچھ کہے بنا کچھ اظہار کیے یوں ہی گزار دی اس نے محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا...... اس کا جسم اتنا کمزور ہو چکا تھا جیسے بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ......حسن نے آنکھیں کھول دیں۔

"حسن...... بیٹا کیا دکھ ہے کیا پریشانی ہے کچھ تو بولو...... کیا ندا بہت یاد آتی ہے؟" ندا کے [illegible] پر شکنیں سی ابھریں اور اس کی آنکھوں کا رنگ بدلنے لگا...... اس کے چہرے پر اتار چڑھاؤ سا آنے لگا۔

"حسن مجھے پتا ہے تم ندا سے بہت محبت کرتے ہو" ضحیٰ نے محبت سے کہا۔

وہ خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگا...... اس کی آنکھوں میں ایک دم نمی سی تیرنے لگی۔

"سنو جس سے محبت کرتے ہیں ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں ان کو دکھ نہیں دیتے ندا کو جب سے معلوم ہوا ہے کہ تم بیمار ہو وہ بہت پریشان ہے...... وہ بہت روتی ہے وہ تمہیں خط لکھنا چاہتی ہے...... بولو میں اسے کیا کہوں...... کیا وہ تمہیں خط لکھے؟" اس نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

وہ جواباً خاموش رہا وہ خود بھی پریشان ہوگئی۔

دوسرے دن اس کے ہاتھ میں لفافہ تھا جو اس نے اس کی جانب بڑھایا۔

"حسن دیکھو...... دیکھو ندا نے تمہارے لیے خط بھیجا ہے...... مگر وہ کہتی ہے جب تک تم بات نہیں کرو گے میں تمہیں یہ خط نہ دوں۔" اس نے خط والا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

حسن نے ایک ٹک لفافے کو غور سے دیکھا اور پوری قوت سے اس کے ہاتھ سے لفافہ چھینا یہاں تک کہ اس چھینا جھپٹی میں لفافہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا وہ ٹکڑوں کو جوڑنے لگا مگر کوشش کے باوجود بھی کچھ ترتیب نہ دے سکا تو جھنجھلا کر اسے پھینک دیا اور خشمگیں نگاہوں سے ضحیٰ کی جانب دیکھنے لگا اور سائیڈ پر رکھے برتن زور زور سے زمین پر پھینکنے لگا وہ خود ڈر سی گئی اور رونے لگی اور اسی طرح گھر لوٹ آئی۔

وہ ہر روز اس کے پاس جاتی اور وہ کبھی اس کے بیگ کو گھورتا کبھی ایسی نظروں سے اس کی جانب دیکھتا جیسے کچھ پوچھنا چاہتا ہو...... اسی لمحے عزیز نے اُسے بلا لیا وہ بیگ رکھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو بیگ حسن کی گود میں تھا...... اور وہ اسے الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر رکا۔

"کیا چاہیے...... ندا کا خط...... وہ تو میرے پاس ہے......" اس نے ایک کاغذ اسے دکھایا جو شاید عزیز نے اسے دیا تھا۔

اس نے وہ کاغذ اس کی جانب بڑھایا...... جو بالکل سادہ تھا اس میں کچھ بھی نہ تھا۔

"اوہ...... یہ تو خالی کاغذ ہے...... حسن تم سمجھتے ہو خالی کاغذ کا کیا مطلب ہے......؟" اس نے پوچھا مگر وہ خاموش رہا...... وہ اس کے قریب پہنچ کر بیٹھ گئی۔

"اس کے بہت سارے مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ میرے پاس کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن الفاظ نہیں کہ کیا لکھوں...... ہو سکتا ہے وہ اپنے کئے پر نادم ہو" ضحیٰ قدرے لائٹ موڈ میں بولی۔

"دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میری ہر بات کو جانتے ہو لفظ ان کو کس طرح بیان کر سکتے ہیں اور تیسرا یہ کہ اب کچھ لکھنے کا یا کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تم سب سمجھتے ہو...... کیونکہ تم بہت ذہین ہو......" وہ اس کا ذہن الجھانا چاہتی تھی...... وہ بولتی رہی اور وہ جھنجلا کر اٹھ کھڑا ہوا اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس کی رنگت سرخ ہونے لگی جیسے اندر ہی اندر جذبات کا الاؤ روشن ہو گیا ہو اور پھر آنسو تیزی سے گرنے لگے شاید بہت عرصے بعد آنسو اس کی آنکھوں سے گرے تھے ورنہ تو یوں لگتا تھا جیسے سوتے ہی خشک ہو گئے ہوں اس نے رومال سے اس کے آنسو صاف کئے۔ وہ کتنی دیر روتا رہا اور وہ اس کے آنسو صاف کرتی رہی اس کے یوں رونے پر اس کا دل کٹتا رہا اور وہ اسی طرح اٹھ کر باہر آ گئی۔

اس نے فریدی صاحب کو فون کیا۔ شام کو وہ خود آئے۔ وہ بالکل میاں جی کی شبیہہ لگ رہے تھے۔

"کیا بات ہے ضحیٰ بی بی کیوں پریشان ہیں......؟" فریدی صاحب نے ملائمت سے پوچھا۔

"فریدی صاحب...... آپ جانتے ہیں حسن کو میں کتنا چاہتی ہوں لیکن وہ اس قدر ٹوٹ گیا ہے کہ مجھ سے اس کا یوں کرچی کرچی ہونا برداشت نہیں ہو پا رہا...... میں اس کو دیکھتی ہوں تو اندر تک لرز جاتی ہوں کہیں دوبارہ کچھ ایسا نہ ہو جائے......" وہ بے صبری سے بولی۔

"فکر نہ کریں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" فریدی صاحب نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ دعا کریں......" وہ روہانسی ہو گئی۔

"آپ خود کیوں نہیں کرتی...... وہ دعا جس میں سچائی ہو خلوص ہو اور کسی دوسرے انسان کے لیے ہو کبھی خالق یونہی نہیں لوٹاتا اور پھر آپ تو......" فریدی صاحب نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"فریدی صاحب......بس ایک بار آپ میرے حسن کو دیکھ لیں......"

"ٹھیک ہے میں کل ہسپتال آؤں گا......" فریدی صاحب نے ہامی بھری۔

"فریدی صاحب...... درانی صاحب کہاں ہیں......؟" اس نے ایک دم پوچھا۔

انہوں نے اپنا ایک ریسرچ سنٹر بیرون ملک قائم کیا ہے اب وہ یہاں پر بہت کم آتے ہیں صرف کبھی کبھار کام کے سلسلے میں...... اکثر میں ہی جاتا ہوں۔"

"اور آپ کا ریسرچ سنٹر کیسا کام کر رہا ہے؟"

"ماشاءاللہ بہت خوب جا رہا ہے۔"

"کل میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"ٹھیک ہے...... میں پہنچ جاؤں گا۔"

فریدی صاحب کے جانے کے بعد وہ ان کے بارے میں سوچتی رہی ان کا حلیہ بھی کم و بیش وہی ہو گیا تھا جو میاں جی کا تھا یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے اور رکھ رکھاؤ میں وہ بالکل ان جیسے ہی نظر آ رہے تھے طبیعت اور لب و لہجہ میں وہی ٹھہراؤ وہی شائستگی آ گئی تھی شاید ان کا محسوس کرنے کا اور چیزوں کو نئی جہت میں دیکھنے کا ڈھنگ بالکل میاں جی جیسا ہو گیا تھا...... وہ یہی سوچتی رہی کہ صحبت انسان کو کتنا بدل دیتی ہے۔

دوسرے دن وہ ہاسپٹل میں ان کا انتظار کرتی رہی...... حسن پریشان بیٹھا تھا اس نے ایک دفعہ بھی ضحیٰ کی جانب نہ دیکھا......

فریدی صاحب آئے اور انہوں نے بھرپور نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا وہ بھی مسلسل ان کو دیکھے جا رہا تھا۔

"ایک اور سچ......" فریدی صاحب بولے

"کیا واقعی......؟" ضحیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

حسن متلی سی محسوس کر رہا تھا۔ فریدی صاحب نے گلاس میں ٹھنڈا پانی ڈال کر دیا۔

''پی لو'' وہ محبت سے بولے اور گلاس اس کے منہ کو لگایا۔

چند ساعتوں کے بعد اس نے غٹاغٹ پانی چڑھا لیا اور یوں آنکھیں بند کیں جیسے اندر ہی اندر سکون محسوس کر رہا ہو اور پھر لیٹ گیا جیسے سو گیا ہو۔

''کیا چاہیے......؟'' ضحیٰ نے پوچھا۔

''بہت پیار اور اعتماد......سچا......کھوٹ سے پاک'' فریدی صاحب نے نظریں حسن کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

''گھاؤ بہت گہرا ہے......شدید گھائل ہے۔'' وہ بولی۔

''جانتا ہوں......لیکن مرہم میں بہت طاقت ہے۔''

''کیا بہت وقت لگے گا۔'' اس نے پھر پوچھا۔

''فطرت اپنے راستے خود بناتی ہے......منزل دور ہو سکتی ہے......مشکل ہو سکتی ہے لیکن ناممکن نہیں......کوشش کرنا اب کی بار ٹھوکر نہ لگے......'' انہوں نے دوبارہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ محبت سے مسکرائے اور پھر باہر چلے آئے۔

وہ اس کو چھوڑ کر واپس مڑی تو حسن سر جھکائے بیڈ پر بیٹھا تھا اور آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے آنسو صاف کیے......اور یکدم اس نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا......اور اپنے چہرے کے ساتھ لگا کر پیار کرنے لگا وہ اتنی خوش ہوئی کہ ہاتھ چھڑا کر عزیز کو بتانے کے لیے بھاگی۔

......۞......

(44)

دو دن سے اس کو بہت بخار آ رہا تھا اس لیے وہ حسن کو ملنے ہاسپٹل بھی نہ جا سکی گھر سے ہی اس نے عزیز کو فون کرنا چاہا مگر فون پر بات نہ ہو سکی شاید وہ کہیں گیا ہوا تھا شام ہو رہی تھی جب عزیز خود آ گیا اس کو اس حال میں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''ضحیٰ کم از کم تم مجھے فون ہی کر دیتی...... یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟'' عزیز نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے فون کیا تھا مگر تم شاید موجود نہ تھے۔'' وہ نقاہت سے بولی۔

''ہاں میں ایک دو کام کے سلسلے میں ہاسپٹل سے باہر تھا پھر حسن کا کیس بھی ہمارے ایک سینئر ڈاکٹر ہیں ان سے ڈسکس کرنا تھا......؟''

''کیا کہتے ہیں وہ......؟''

''اب امید بندھی ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''کل تم ہاسپٹل نہیں آئیں......تو تمہارے بارے میں پوچھنے خود آیا تھا۔'' عزیز نے مسکرا کر بتایا۔

''واقعی......کیا وہ بولا......؟'' ضحیٰ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''ہاں...... بولا تو ہے مگر بہت تھوڑا...... اٹک اٹک کر......لیکن اب امید ہے کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔'' عزیز نے پُرامید لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے بھی امید تھی......'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اور پھر ہاسپٹل آ ؤ...... وہ شاید تم سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے...... میں نے پوچھنے کی کوشش تو بہت کی مگر وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

"اچھا...... میں کل آنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔" وہ خوشی سے بولی۔

"اب میں چلتا ہوں......کل ملیں گے۔" عزیز نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد وہ بہت مسرور تھی کئی بار خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اب ٹھیک ہونے لگا تھا...... ورنہ اس کا دل بہت ڈر گیا تھا۔

دوسرے دن جب وہ اس سے ملنے گئی تو اس نے اس کو شدت سے اپنا منتظر پایا وہ اس کے لیے پھل اور پھول لے کر گئی...... وہ جیسے ہی جا کر بیٹھی وہ پرشوق نگاہوں سے اس کا بیگ دیکھنے لگا۔

"پہلے یہ پھول دیکھو اور ان کی خوشبو سونگھو دیکھو کتنے خوبصورت ہیں نہ اور ان کی خوشبو کتنی پیاری ہے اس نے پھول اسے پکڑائے...... بہت عرصے کے بعد اس کے ہاتھوں نے ان کو چھوا تھا...... اس نے ان کو چھوا...... خوشبو کو سونگھا اور ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

"لو...... یہ کھاؤ......" اس نے سیب کاٹ کر اس کی جانب بڑھایا۔

اس نے دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"تمہیں کھانا پڑے گا یہ سیب ندا نے بھجوایا ہے یہ پھل اور پھول...... اس نے کہا ہے کہ یہ سب تمہیں کھلا کر آؤں اور کہوں کہ جلد ٹھیک ہو جاؤ کیونکہ اسے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں...... وہ تم سے ملنا چاہتی ہے...... وہ خط نہیں لکھنا چاہتی وہ تم سے خود ملنا چاہتی ہے مگر وہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے...... بولو حسن...... میں اس کو جا کر کیا بتاؤں......تم تو کوئی بات ہی نہیں کرتے...... وہ مجھ سے بہت پوچھتی ہے کہ حسن نے کیا کیا کہا...... میں کیا اسے بتاؤں......؟" ضحیٰ نے عزیز کی بتائی ہوئی باتیں دہرائیں۔

جواباً اس نے اونچی اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ وہ اس کے رونے سے گھبرا گئی۔

"اگر تم اس طرح روؤ گے تو ندا بہت پریشان ہو گی...... اب میں چلتی ہوں...... وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

اور وہ اس کے ساتھ گیٹ تک آیا۔ ضحیٰ نے اچھی طرح Observe کیا تھا کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے مگر شاید زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی...... اس کے چہرے پر بدلتے

رنگوں سے اس کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیا کیا کہنا چاہتا تھا وہ ایک دو بار لٹک اٹک کر بولا......مگر پھر رونا شروع ہو گیا۔

اس نے گھر آ کر عزیز کو فون کیا اور ساری صورت حال اسے بتائی۔

"ضحیٰ یہ بہت بڑی کامیابی ہے...... اگر وہ روتا بھی ہے تو اس کے رونے سے مت گھبراؤ۔ رونے کا مطلب ہے کہ وہ بہت کچھ محسوس کر رہا ہے ورنہ پہلے تو وہ بے جان بت کی مانند تھا...... اب جلد بہتر ہو جائے گا۔ تم کوشش جاری رکھو۔" عزیز خوشی سے بولا۔

وہ روزانہ اس کے پاس جاتی...... ندا کی باتیں کرتی...... کبھی کبھار وہ بھی باتیں کرنے کی کوشش کرتا...... ہر روز وہ اس کا شدت سے انتظار کرتا...... اس سے مل کر خوش ہوتا...... اور وہ ڈھیروں باتیں کر کے واپس آ جاتی۔

"ضحیٰ اب تم حسن کو گھر لے جاؤ...... دوائیں میں لکھ دیتا ہوں...... لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ اسے Company کی زیادہ ضرورت ہے اور تم سے بہتر Company اسے کوئی نہیں دے سکتا۔" عزیز نے دوائیوں کا نسخہ اس کی جانب بڑھایا۔

اور وہ اسے گھر لے آئی...... اس کا اتنا خیال رکھتی کہ وہ چند دنوں کے اندر اندر نمایاں طور پر بہتر ہونے لگا۔ صحت اس کی ٹھیک ہونے لگی...... کبھی کبھی شدید ہیجان میں وہ شدید ردعمل کا مظاہرہ کرتا ورنہ زیادہ تر چپ چاپ بیٹھا رہتا...... وہ اس کو روزانہ سیر کرانے باہر لے کر جاتی...... لان میں گھماتی...... ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی۔

"حسن بیٹا......تم بولنے سے کیوں ڈرتے ہو؟" اس نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا...... کیا کہوں......؟" وہ بمشکل بولا۔

"کچھ تو کہو...... الٹا سیدھا جیسے بھی، کہو تو سہی، تم پڑھے لکھے ہو تمہارے پاس تو بہت سارے الفاظ ہوں گے...... تو پھر کیوں نہیں کچھ کہتے...... ندا کے ساتھ ناراضگی ہو گئی ہے اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم بات کرنا چھوڑ دو اور اپنے آپ کو لوہے جیسا مضبوط بناؤ اور جسم کو سیسے سے بھی زیادہ اگر تم یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل چھوڑ گئے تو تند ہوا کے تھپیڑوں میں تنکوں کی مانند بہہ جاؤ گے۔ پھر تمہارا وجود باقی نہیں رہے گا...... اپنی Will

Power کو مضبوط بناؤ۔ کوشش کرو تو سب کچھ ہو جائے گا......'' اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی سے سنتا رہا...... اور پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا، گھٹا جھوم جھوم کر آ رہی تھی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی اس دفعہ برسات پورے جوش و خروش سے رنگ دکھا رہی تھی۔ اتنی بارشیں یوں لگتا تھا جیسے سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے ہر روز موسم کا نیا موڈ ہوتا کبھی ہلکے ہلکے دھوئیں کی مانند بادل ہر طرف تیرتے پھرتے نظر آتے۔ پھر ایک دم کالی سیاہ چادر تن جاتی اور پھر ایک دم ان کی اوٹ سے سورج ایک شفاف چمکتے گولے کی مانند نمودار ہوتا پھر اندھیرا چھٹنے لگتا اور ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل جاتی۔

ابھی بھی موسم ایک دم اتنا خوبصورت ہو گیا تھا کہ وہ حسن کو لے کر باہر لان میں آ گئی۔ حسن کرسی پر بیٹھا ارد گرد دیکھ رہا تھا اور وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھی کہ اچانک اس نے حسن کو اٹھتے ہوئے دیکھا...... وہ مسلسل گیٹ کی جانب دیکھ رہا تھا پھر اٹھ کر اس کی جانب چل دیا وہ حیرانگی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی پھر گیٹ کی جانب دیکھنے لگی تو مزید حیران رہ گئی۔ وہاں قندیل بیگ اٹھائے اندر داخل ہو رہی تھی۔

حسن بھاگتا ہوا اس کی جانب گیا......

''ندا تم آ گئی......'' وہ حیرت سے بولا۔

وہ دونوں حیرانگی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگیں تب ضحیٰ نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا...... تم اتنے دنوں کے بعد کیوں آئی ہو اور تم تم ٹھیک ہو نا'' حسن اٹک اٹک کر بول رہا تھا جسے صرف ضحیٰ سمجھ رہی تھی۔

قندیل خاموش کھڑی تھی......

''لاؤ مجھے بیگ دو......'' اور وہ اس کا بیگ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ وہ اتنا خوش اور مسرور تھا کہ ضحیٰ کو ایک دم وہ نارمل لگنے لگا...... وہ اس کو یوں بولتا دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔

''آؤ قندیل...... بیٹھو خیریت تو ہے نا...... کیسے آنا ہوا......؟''

''میڈم میں سخت پریشانی کے عالم میں آئی ہوں...... اپنا سب کچھ چھوڑ کر!'' وہ پریشانی سے بولی۔

''کیا مطلب......؟'' ضحیٰ کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

''میرے بھائی اور باپ میری شادی اپنے ہی جیسے انسان سے کروانا چاہ رہے ہیں جب میں یہاں سے گئی تو وہ لوگ میرے ہی منتظر تھے کہ ان دنوں یہی بات چیت چل رہی تھی۔ میں جب گھر گئی تو دو تین دفعہ وہ لوگ آئے اور پھر مجھے خبر ہوئی کہ بات کیا ہے...... میں نے اس شخص کا پتہ کیا ہے وہ کوئی اچھا انسان نہیں...... لیکن میری شادی میرے باپ کے لیے فائدہ مند ہو گی اس سے نہ صرف ان کا بزنس ترقی کرے گا بلکہ وہ سیاست میں ان کو بھرپور فائدہ دے گا اور میں اس شخص سے قطعی شادی نہیں کرنا چاہتی...... اس دن آپ سے بات کرنے کے بعد میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں...... اب میں زندگی نئے عزم کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں...... آپ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے...... میں زندگی میں کچھ کرنا چاہتی ہوں...... مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بند گلی میں کھڑی ہوں...... پھر میں نے فیصلہ کیا اور گھر چھوڑ کر آپ کے پاس آ گئی ہوں۔'' وہ آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔

''کیا......؟'' وہ حیرت سے چونکی۔

''آپ ناراض نہ ہوں...... صرف چند دن کے لیے میں یہاں ہوں پھر کہیں اور چلی جاؤں گی۔'' اس نے اپنا فیصلہ پرسکون لہجے میں سنایا۔

''میرا یہ مطلب نہیں...... میں تو کچھ اور سوچ رہی ہوں۔'' وہ اس کی بات رد کرتے ہوئے بولی۔

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو......؟''

''کچھ نہیں...... فی الحال تو تحفظ چاہتی ہوں...... اور گھر کیوں چھوڑا ہے تو صرف مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے...... اس وقت میں اپنے اندر سے تمام آرزوئیں، خواہشیں...... تمنائیں سب کچھ ختم کر کے آئی ہوں...... مجھے اب کوئی تمنا نہیں، کوئی چاہ

نہیں...... صرف Survival کے لیے بنیادی ضروریات کی فکر ہے میرے حالات اب اس سے زیادہ کی مجھے اجازت نہیں دیتے۔'' وہ مایوس کن لہجے میں بولی۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ تم گھر چھوڑ کر آئی ہو اس پر تمہارے والد اور بھائی بگڑ نہ بیٹھیں۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''میڈم وہ گھر نہیں سرائے تھی جس کو چھوڑ دینا ہی بہتر تھا...... آج نہیں تو کل مجھے ہر حالت میں اسے چھوڑنا تھا۔ ناراض تو وہ ضرور ہوں گے...... ان کا یہ ردعمل تو نیچرل ہے اور اب جبکہ میں ان کے بزنس اور سیاست کے لیے مفید بھی ہوں، ہو سکتا ہے وہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کریں...... لیکن میں جو خط پیچھے چھوڑ کر آئی ہوں اس میں تو میں لکھ آئی ہوں کہ اب میرا ان سے مزید کوئی تعلق نہیں ہو گا...... لیکن پھر بھی وہ کوئی Step لیتے ہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔'' وہ پُرعظم لہجے میں بولی۔

''یہاں پر تم محفوظ ہو فکر کی کوئی بات نہیں، جاؤ جا کر فریش ہو جاؤ...... پھر بات کریں گے......'' وہ اٹھ کر اندر جانے لگی۔

''سنو...... حسن کو مت بتانا کہ تم قندیل ہو...... وہ بہت دنوں کے بعد آج پہلی دفعہ یوں خوش ہو کر بولا ہے۔'' اس نے قندیل کو سمجھایا اور اسے آرام کرنے کو کہا وہ خاموشی سے اندر چلی گئی۔

قندیل کے آنے سے وہ پریشان سی ہو گئی تھی اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک لڑکی کا گھر یوں چھوڑ کر آنا اس کے لیے پریشانی کا باعث تھا اس کے گھر والے کچھ بھی کر سکتے تھے اور وہ اس کو جانے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتی تھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ایک دم بارش شروع ہو گئی وہ اٹھ کر برآمدے میں آ گئی اور چھم چھم برستی بارش کا نظارہ کرنے لگی ..... یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان سے سارے جھرنے زور و شور سے بہنے لگے ہوں ہر طرف جل تھل ہو گیا...... لان آہستہ آہستہ پانی سے بھرنے لگا برآمدے کے چاروں طرف چھوٹے گملے یوں پانی سے بھر گئے جیسے قطار در قطار چائے کی پیالیاں سجا دی گئی ہوں، ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا...... تمام نشیب و فراز پانی کے وجود میں سما کر ایک جیسے ہموار ہو گئے تھے...... بارش لحہ بہ لحہ تیز ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہوا کے تند و تیز

چھوٹے سی دروازوں اور کھڑکیوں کو ہلا رہے تھے...... ہر طرف کھڑکھڑاہٹ سی ہو رہی تھی پہلے تو وہ کھلتی نوخیز کونپلوں...... ہری ہری مخملیں فرش جیسی گھاس اور نت نئے سبز رنگوں کے پتوں...... درختوں کی جھولتی ٹہنیوں...... پُرجوش برکھا رت...... اور ملگجے آسمان کا نظارہ کرتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی...... لیکن ایک دم زور سے بجلی کوندی اور ہر طرف تاریکی سی چھانے لگی...... کتنا وقت گزر گیا اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا...... وہ اٹھ کر اندر آ گئی...... جہاں ہر طرف سکوت ہی سکوت تھا وہ حیرانگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

......❁......

(45)

قندیل کچن میں چائے بنانے میں مصروف تھی اور حسن ٹی وی لاؤنج سے مسلسل اس کو دیکھ رہا تھا اور یہی بات ضحیٰ بھی نوٹ کر رہی تھی اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حسن اس کو ندا کیوں کہتا ہے...... اتنے میں وہ چائے لے کر آ گئی اور ایک کپ اس کو دے کر ضحیٰ کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی...... دونوں چائے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرنے لگیں۔

''ندا...... تمہیں یاد ہے نا عارف...... جب بھی تم آتی تھیں جلدی سے چائے کا کپ تمہیں آفر کرتا تھا...... اور پھر بعد میں میرے حساب میں لکھواتا تھا...... یاد ہے نا تمہیں'' حسن بغور اس کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا...... پھر اونچی آواز میں قہقہے لگانے لگا قندیل زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لا کر بولی۔

''ہاں...... ہاں مجھے سب یاد ہے۔''

''قندیل میں سوچ رہی ہوں ابھی ہم سٹور میں جا کر حسن کی ساری چیزیں دیکھتے ہیں میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ تمہیں ندا کیوں کہتا ہے......؟'' ضحیٰ نے رائے دی۔

''ٹھیک ہے...... میں بھی چلتی ہوں......'' چائے پی کر دونوں سٹور میں چلی گئیں اور اس کا سامان الٹ پلٹ کرنے لگیں سٹور میں نجانے کب سے گرد کی تہیں جمی تھیں قندیل...... فیروزہ کو آواز دو کپڑا لے کر آئے ساتھ ساتھ صفائی بھی کر لیں اور وہ چوکیدار کی بیوی کو بلانے چلی گئی جب بھی ضرورت ہوتی وہ اس کو بلا لیتی فیروزہ ہر طرف پڑی مٹی کو صاف کرنے لگی اور وہ بھی پرانی الماریاں کھول کھول کر صاف کرنے لگی...... ایک الماری میں اس کے ڈھیروں گفٹس اور کارڈ پڑے تھے۔

''میڈم کیا یہ سب آپ کے ہیں؟'' قندیل نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... گزرے زمانے کی خوبصورت یادیں۔'' ضحیٰ آہ بھر کر بولی۔

قندیل نے ان کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

''کس قدر خوبصورت پیکنگ ہے...... لگتا ہے کوئی بہت نفیس اور اچھے Taste والا انسان ہوگا۔'' اس نے گفٹ پر نام پڑھ کر کہا۔

''ہاں حسن بہت نفیس اور بہت باذوق تھا۔'' وہ زخمی مسکراہٹ سے بولی۔

''حسن......'' وہ چونکی

''ہاں وہ بھی حسن تھا۔''

''کیا وہ آپ سے بہت محبت کرتا تھا۔'' قندیل نے سوال کیا۔

''ہاں...... بہت شدید شاید اپنے آپ سے بھی زیادہ'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''اور آپ......؟'' قندیل کے لہجے میں گہرا استفہام تھا۔

''یقیناً میں بھی'' وہ سانس کھینچ کر بولی۔

''میڈم کبھی آپ ان کو بھول پائی ہیں۔''

''کبھی نہیں...... وہ ہر لمحہ میری سانسوں کے سنگ زندہ ہے اور میں اس کو بھولنا بھی نہیں چاہتی۔'' وہ نم آنکھوں سے بولی۔

''اسی لیے تو آپ نے پرانی یادیں اتنی چاہت سے سنبھال کر رکھی ہیں۔''

''یادیں تو بس یادیں ہوتی ہیں جن کو انسان باوجود ہزار کوشش کے آنے سے نہیں روک سکتا...... زندگی میں ہر روز ہر لمحہ ہر آن...... ہر قہقہہ پر...... ہر ٹھوکر پر...... ہر دکھ پر ہر خوشی کے لمحے یاد کا پتھر ضرور آ کر لگتا ہے۔ حسن میرے لیے خوبصورت یاد کی مانند ہے۔ ایسی یاد جس کو میں ہر وقت اپنے اندر موجود پاتی ہوں......'' وہ قدرے جذباتی انداز میں بولی۔

''اور یہ حسن؟'' قندیل نے سوال کیا۔

یہ بھی خوشبو ہے مہک ہے...... لیکن اس کو بھی میں کھونا نہیں چاہتی...... یہ میری اولاد تو نہیں مگر میرے لیے اولاد سے بھی بڑھ کر ہے...... کیونکہ اس میں میں نے اپنا عکس دیکھا ہے...... میرے ماضی کی تنہا یادوں کا بس یہی گواہ ہے میں اس سے بھی بہت محبت کرتی ہوں۔'' وہ محبت سے بولی۔

''میڈم کہتے ہیں محبت تو ایک سے ہوتی ہے پھر اتنے بہت سے لوگوں سے محبت کیسے ہو سکتی ہے۔'' قندیل نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''قندیل قدرت نے انسان کو محبت کا وسیع ذخیرہ دیا ہے اس کے اندر یہ چشمہ ہر وقت پوری روانی سے بہتا رہتا ہے جتنا وہ اس کو استعمال کرتا ہے اتنا ہی اس میں جوش آتا ہے ہر انسان زندگی میں بہت ساری محبتیں کرتا ہے نوعیت مختلف ہوتی ہے کسی سے کم کسی سے بہت زیادہ کسی سے انتہا پر پہنچی ہوئی...... ہر محبت کا دائرہ مختلف ہوتا ہے...... اولاد کی والدین سے محبت اور نوعیت کی ہوتی ہے۔ میاں بیوی کی...... دوست کی...... محبوب کی...... ایک انسان کی دوسرے سے...... ہر ایک کے لیے مختلف ہوتی ہے مگر ان سب کا لمس اور احساس ایک ہی ہوتا ہے ایک جیسی مٹھاس ہوتی ہے۔'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولی۔

باتوں کے دوران ہی اسے حسن کے سامان سے ایک البم ملی جس میں ایک گروپ فوٹو تھا وہ ہر چہرے کو بغور دیکھنے لگی...... پھر ایک چہرہ پر دائرہ سا لگا تھا...... اور وہ چہرہ حیرت انگیز حد تک قندیل سے مل رہا تھا...... دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

''میرا خیال ہے یہی ندا ہے...... ہو بہو تم جیسی......'' جسامت قد اور Face cut میں بہت مشابہت تھی صرف نقوش میں تھوڑا بہت فرق تھا...... ضحیٰ نے قندیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں خدا کو کیا منظور ہے......'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔

اور کافی دیر وہ سامان ٹٹولتی رہی مگر اور کچھ بھی نہ ملا...... دونوں سٹور صاف کر کے باہر نکلیں تو برآمدے میں کوئی چلتا نظر آیا دونوں ہی ٹھٹھک گئیں۔

رات کا اندھیرا چھا رہا تھا...... اس وقت کون ہو سکتا ہے...... وہ پریشان ہو گئیں......

قندیل کو آئے دو تین دن ہو گئے تھے اور اس دوران کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ پریشان ہوتیں...... باہر ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی کھڑکیاں دروازے سب بند تھے اور حسن بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا...... ہیولا صرف ایک دو دفعہ نظر آیا پھر غائب ہو گیا۔

''کون ہو سکتا ہے...... اس وقت؟'' قندیل بولی۔

''کہیں ہمارا وہم نہ ہو'' ضحیٰ نے کہا۔

''مگر اس کے قدموں کی چاپ بہت گہری تھی۔'' قندیل نے کہا۔

''ہاں سنی تو میں نے بھی ہے۔'' ضحیٰ نے اس کی تصدیق کی۔

دونوں وہیں خاموشی سے بیٹھ گئیں...... اور حسن بھی وہیں کرسی پر سو گیا...... باہر

بارش بھی تیز ہونے لگی...... پھر ایک دم زور سے دستک ہوئی......

''قندیل......تم میرے کمرے میں آ جاؤ۔'' ضحیٰ نے اسے کہا اور دونوں اس کے کمرے میں چلی گئیں۔

اس نے کمرے میں جا کر مضبوطی سے دروازہ بند کیا اور فوراً فریدی صاحب کو فون کیا۔

''ضحیٰ بی بی...... اس وقت میں مصروف تو بہت ہوں جیسے ہی فارغ ہوتا ہوں آپ کی طرف آ جاؤں گا...... لیکن بات کیا ہے...... آپ کیوں پریشان ہیں؟'' فریدی صاحب نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

''فریدی صاحب بہت ضروری کام ہے۔'' وہ جلدی جلدی بولی۔

''اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔''

''ساری رات انتظار میں گزر گئی...... بارش بھی تیز تھی شاید فریدی صاحب اس کی وجہ سے لیٹ ہو رہے تھے...... ہر پانچ دس منٹ کے بعد کوئی دروازہ زور سے کھٹکھٹاتا...... اور پھر ایک دم فون کی بیل ہوئی۔

قندیل کا باپ اسے فون پہ دھمکیاں دے رہا تھا اور اسے گھر جلدی پہنچنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ ڈری سی گئی تھی۔

''فکر نہ کرو...... سب ٹھیک ہو جائے گا'' اور وہ دل ہی دل میں خدا سے دعائیں کرنے لگی۔

سحر ہونے کے قریب تھی جب فریدی صاحب کی گاڑی آ کر رکی اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

''شکر ہے فریدی صاحب آپ آ گئے......'' وہ قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کیوں خیریت تو ہے......؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

اور اس نے ساری بات ان کو بتائی۔

''میں چاہتی ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے آپ قندیل کو اپنے گھر مہمان رکھیں...... جیسے ہی حالات نارمل ہوں گے میں اس کو لے آؤں گی۔'' ضحیٰ نے انہیں رائے دی۔

''قندیل...... ان سے ملو یہ فریدی صاحب ہیں بہت اچھے انسان...... اور میرا خیال ہے کہ ایک انسان کو متعارف کرانے کے لیے یہی Introduction ہونا چاہیے۔

انسان کو بحیثیت انسان ہی تعارف کرانا چاہیے نہ کہ دوسرے حوالوں سے۔''

''لیکن میرا خیال ہے...... ہر تعارف کے لیے Social Terms کا ریفرنس دینا بھی بہت ضروری ہوتا ہے ورنہ بے نام تعلقات کو سوسائٹی ایک منٹ میں Reject کر دیتی ہے۔'' قندیل نے آہ بھر کر کہا۔

''ہر تعلق کی بنیاد انسان کی سوچ پر ہوتی ہے وہ کس زاویے سے دوسرے انسان کو دیکھتا ہے...... ہر زاویہ مختلف ہوتا ہے کہیں زاویہ افقی تو کہیں عمودی...... یہی حال سوچ کا بھی ہے کسی کے بارے میں ہم سب اچھا سوچتے ہیں کسی کے بارے میں برا اور کسی کے بارے میں ملے جلے جذبات ہوتے ہیں ایسے میں کسی کو کیا بتایا جائے کہ ہم کس نقطہ نگاہ سے دوسروں کو دیکھ رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن سوسائٹی اس وقت مطمئن ہوتی ہے جب آپ کوئی رشتہ اس کے ساتھ جوڑتے ہیں چاہے رشتہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔'' قندیل نے آہستہ سے کہا۔

فریدی صاحب دونوں کی گفتگو سن رہے تھے ''میرا خیال ہے یہ بحث بہت لمبی ہو جائے گی...... بیٹا آپ میرے ساتھ چلنے کی تیاری کریں۔'' فریدی صاحب نے کہا۔

اور وہ اٹھ کر ان کے ساتھ چل دی...... حسن جب بیدار ہوا تو اس کو نہ پا کر بہت پریشان ہوا اور بہت شور مچانے لگا۔

''تم اس سے کوئی بات نہیں کرتے تھے اس لیے وہ چلی گئی۔'' ضحیٰ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

''میں اب اس سے باتیں کروں گا آپ اس کو واپس بلائیں۔'' وہ سخت مضطرب ہو رہا تھا۔

اچھا میں تمہاری اس سے فون پر بات کرواتی ہوں...... اور اس نے نمبر ملا کر اسے ریسیور تھمایا اور خود کچن میں چلی گئی اور وہ اس سے نجانے کیا کیا باتیں کرتا رہا اور اکثر وہ دیکھتی تو وہ اس سے باتیں کر رہا ہوتا اس نے اس کا نمبر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔

حسن کافی حد تک نارمل ہو گیا تھا اور یہ دیکھ کر وہ پھولے نہ سماتی تھی عزیز نے اسے فائنل چیک اپ کے لیے بلوایا تھا۔

......✿......

(46)

عزیز نے اس کا اچھی طرح چیک اپ کیا اور ضحیٰ کی طرف متوجہ ہوا۔

''Now he is fit as a Fiddle'' عزیز مسکرا کر بولا۔

''لیکن عزیز یہ بہت کم کھاتا ہے یا شاید بہت کم بھوک لگتی ہے۔''

''دیکھو حسن انسان کی شخصیت کا ڈھانچہ تین خصوصیات سے مل کر بنتا ہے ذہانت (Intellegence) ارادہ (Will) اور خواہش یا بھوک (Appetite) اور ان تینوں خصوصیات کے توازن سے ایک نارمل شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو نارمل رکھو Will Power کو بھی مضبوط رکھو حالات کا مقابلہ بہادری سے کرو...... کھاؤ پیو جو کچھ تم چاہتے ہو...... خوب کھاؤ اور ڈپریس نہ ہو...... ہر بحران پیدا ہی گزر جانے کے لیے ہوتا ہے...... اور انسان کی آزمائش ہی Crisis میں ہوتی ہے اور بحران گزرنے کے بعد پھر انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے اندر کتنی طاقت ہے یا وہ کتنا کمزور ہے...... چھوٹے موٹے بحران تو دو تین دن میں گزر جاتے ہیں...... کچھ کی مدت لمبی بھی ہو سکتی ہے مگر یقین رکھو کہ ہر ایک ضرور گزر جائے گا نارمل حالات ضرور پیدا ہوں گے...... اور جبکہ تم وجود بھی رکھتے ہو اس کے اندر نفس بھی موجود ہے اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ دل روٹین کے مطابق دھڑکتا ہے خون بھی رگوں میں دوڑتا پھرتا رہتا ہے پھر تم کس طرح اپنے وجود کی نفی کر سکتے ہو...... ہر انسان چاہے وہ کسی قابل نہ بھی ہو مگر وہ ضرور کہے گا کہ میں ہوں اور روح جو کہ منفرد روحانی جوہر ہے ضرور اسے اس کی ذات کے علم سے آشنا کرے گی۔ روح یا ذہن جسم سے قطعی طور پر الگ اور آزاد ہے...... تم اپنے جسم کی نفی تو کر سکتے ہو مگر اپنے ذہن کے غیر موجود ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے...... تم ایک منفرد انسان ہو ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے۔ اور وہ اس انفرادیت کا شعور بھی رکھتا ہے اور

انفرادیت تبھی قائم رہ سکتی ہے جب شخصیت طاقتور ہو...... اور شخصیت کو توانا بنانے کے لیے خوراک، بہت ضروری ہے تم نے وہ قصہ تو ضرور سنا ہوگا کہ ایک شخص عجیب وغریب قسم کے اوہام اور وسوسوں کا شکار تھا اور اپنے آپ کو گائے سمجھتا تھا اور گائے کی سی حرکتیں کرتا تھا اور اس امید میں تھا کہ اس کو جلد ذبح کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا طبیب کو بلایا اس نے اس کو باندھا اور جب ذبح کرنے لگا تو کہا کہ یہ تو بہت لاغر گائے ہے جب یہ موٹی ہو جائے گی تب اس کو ذبح کریں گے...... اس نے یہ سن کر اتنا کھانا شروع کر دیا کہ اس کا جسم موٹا ہونے لگا...... جسم توانا ہوا تو اس کا ذہن بھی خود بخود ٹھیک ہوگیا...... تم بھی ایسی ہی گائے بن جاؤ۔'' عزیز کھکھلا کر ہنسا۔

وہ بھی جواباً ہنسا۔

''اور سنو انسان، انسان ہے جانور نہیں کہ یوں اپنے آپ کو ضائع کر دے زندگی کو اس طرح گزارو کہ لگے تم واقعی زندگی گزار رہے ہو نہ کہ زندگی تمہیں۔ تم جس ہیجانی کیفیت سے گزر رہے ہو حقیقت میں سب نارمل لوگ اس میں سے گزرتے ہیں مگر ہر مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے ایک تو یہ کہ چاہے زندگی میں کوئی بھی معاملہ ہو کیسا بھی جذباتی کیوں نہ ہو اس کے ہونے اور نہ ہونے کے ففٹی ففٹی پرسنٹ چانسز پر یقین رکھو ہر بات کے فیصلہ کن مراحل سے گزرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھو کہ اس میں ناکامی بھی ہو سکتی ہے اور کامیابی بھی...... اگر ناکامی ہوئی تو کیا کرنا چاہیے اور کامیابی ہوئی تو کیا ردِ عمل ہونا چاہیے اس طرح **Pre-Planned** سوچیں جذبات پر حاوی نہیں ہوتیں اور انسان کرائسس میں بھی کافی حد تک اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور انسان روبوٹ یا کوئی مشینی انسان نہیں جو جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر فوراً اپنا آپ چھوڑ دے اور فنا ہو جائے بلکہ وہ تو ایسا فرد ہے جو تخلیق ذات کے عمل میں مصروف ہے وہ ایسا انسان ہے جس کی وجہ سے زندگی میں معنویت پیدا ہوتی ہے وہ متفرق اجزاء کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کی اصل شناخت اور وضاحت اس کے کل یعنی ''انسان'' ہونے میں پوشیدہ ہے اور عمل کو نظر انداز کر کے کس طرح انسان کو اہمیت دی جا سکتی ہے اور زندگی تو مسلسل تغیر کا نام ہے اور یہ اٹل حقیقت ہے کہ انسان ان تغیرات سے ضرور گزرتا ہے چاہے یہ عارضی نوعیت کی ہوں چاہے سطحی، انسان نفسیاتی طور پر کسی جامد چیز کا نام نہیں اگر وہ ان تغیرات کا

شکار نہ ہو تو انسان کی ذات جو لامحدود رفعتوں کی طرف سفر کرتی ہے وہ ختم ہو کر رہ جائے اور انسان کا مستقبل تو اس کے باطن میں پوشیدہ ہے اور باطن تو ہر لحہ حرکت، چکر اور فعل پر مجبور کرتا ہے تم ایک معمولی انسان نہیں ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

''کہ تم خود کو ایک معمولی جاندار سمجھتے ہو حالانکہ تمہارے اندر تو پوری کائنات چھپی ہوئی ہے۔''

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور ضحیٰ بھی عزیز کی سوچ میں اس قدر گہرائی پا کر مسرور ہوتی رہی۔

''عزیز مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس میں **Nothingness of Life** بہت آ گئی ہے یہ اپنے اندر کی تمام خواہشات کو آہستہ آہستہ ختم کرتا جا رہا ہے۔ یوں جیسے اپنے آپ کو ختم کرنے کا بلاواسطہ راستہ اس نے منتخب کیا ہے'' ضحیٰ پریشان ہو کر بولی۔

''دیکھو حسن...... ''خواہش'' اور ''ضرورت'' انسانی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور جو خواہشات پیدائشی ہوتی ہیں ان کو دبانا یا ختم کرنا عقل کے خلاف اور حقیقت کے منافی ہے۔ اچھی خواہشات اچھے اور نیک محرکات سے جنم لیتی ہیں اور اچھے محرکات نیک اعمال کا سبب بنتے ہیں اس لیے ان کو دبانا فطرت کے خلاف ہے اور یہی نیک خواہشات کبھی کبھی رفعتوں کی جانب سفر کرتی ہیں۔'' عزیز نے پھر منطقی انداز میں سمجھایا۔

''کیسے پیدا کروں یہ سب...... مجھے بہت مشکل نظر آتا ہے سب کچھ۔'' حسن پریشان ہو کر بولا۔

''انسان کے اندر ارادہ یعنی **Will** ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ انسان کے اندر جب تک یہ جذبہ موجود ہے وہ توانا نظر آئے گا ورنہ بالکل بے کار...... یہی ارادہ اور قوت انسان کے کمزور اور نازک ڈھانچے کو اتنا طاقتور بنا دیتی ہے کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ اور اس **Will** کی بدولت وہ پوری کائنات کو تسخیر کرتا ہے بلند و بالا چوٹیوں کو سر کرتا ہے۔ سمندروں پر اور ہواؤں میں اڑتا پھرتا ہے...... کیا وہ تم جیسے انسان نہیں......؟'' عزیز نے پوچھا۔

''ہاں ہیں...... مجھ سے بہتر...... مجھے یوں لگتا ہے ہر دوسرا انسان مجھ سے افضل ہے، میں اتنا حقیر کیوں ہوں...... اتنا کمتر...... یہ کم مائیگی کا احساس مجھے جینے نہیں دیتا......

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے میں بالکل کھوکھلا انسان ہوں...... میرے اندر بھی کچھ نہیں اور باہر بھی......'' اس نے ہونٹ چبائے۔

''حسن میں تمہیں کس وقت سے سمجھا رہا ہوں کہ نہ ہی تم کمزور ہو نہ ہی تم حقیر...... تم صرف ایک اچھے انسان ہو جو انسانیت کی بقا کے لیے پیدا کیے گئے ہو...... یہ بقا کس طرح ہو گی...... خود اپنے اندر وہ جوہر تلاش کرو اور وہ جوہر تمہارے اندر موجود ہے اور ہماری جدید نفسیات میں ڈاکٹر البرٹ ایلسن نے ایک تھیوری دی ہے جس کا نام ہے **Rational Emotive Therapy** جو کہ گیارہ فضول قسم کے نظریات کا علاج ہے جو کہ انسان میں شدید ڈپریشن، خوف، ترس، احساس کمتری، غصہ، حسد، نفرت، اعصابی پریشانی سست روی اور ہر قسم کا دکھ، حقائق سے فرار پیدا کرتے ہیں اور ان میں جو سب سے پہلا **Irrational Idea** یہ ہے کہ **Rejection Hurts you**۔ آپ اپنے آپ کو اس وقت قابل عزت اور اہم سمجھیں گے جب لوگ آپ کو اہمیت دیں آپ کی عزت کریں اگر وہ آپ کی عزت اور احترام کرتے ہیں آپ سے محبت کرتے ہیں تب آپ اپنے آپ کو انسان سمجھتے ہیں ورنہ نہیں...... یہ کس قدر فضول سی بات ہے کہ ہر انسان جو کہ اپنے اعمال اور اپنی زندگی کا خود ذمہ دار ہے۔ وہ اتنی معمولی شے ہے کہ صرف دوسروں کے ریمارکس کی وجہ سے اپنی زندگی کو خراب کر دے یا ختم کر دے۔ لوگ تو باتیں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں...... جو باتیں کرتے ہیں کیا وہ ہر لحاظ سے مکمل انسان ہیں۔ جبکہ یہ دنیا ہی نامکمل ہے۔ ہر جگہ **Imperfections** ہیں۔ کائنات کا شاہکار انسان ہے۔ مگر اس میں بھی خامیاں ہیں۔ کسی میں کچھ اور کسی میں کچھ...... اگر کوئی وقتی طور پر اپنی **Imperfections** کو نظر انداز کر کے دوسروں کی خامیاں اچھالتا ہے تو کیا ایسا کرنے سے اس کی اپنی ذات محفوظ رہ جاتی ہے۔ کبھی نہیں، کمی تو ہر جگہ رہتی ہے۔ تم سمجھدار ہو اور باشعور بھی...... یونہی اپنے آپ کو ضائع مت کرو...... تم اُگل دو جو کہنا چاہتے ہو۔ جو بہت عرصے سے تمہارے اندر جمع ہے۔ الفاظ کس لیے ہیں، الفاظ بہت بڑی طاقت ہوتے ہیں جانتے ہو آدم کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کو الفاظ سکھائے گئے۔ یہ تحفہ خداوندی ہیں خالق کا عطیہ ہیں مخلوق کے لیے...... یہ شکستہ حوصلوں کو ایک دم جوان رکھنے کی بھی ہمت رکھتے ہیں اور پہاڑ جیسے مضبوط ارادوں کو آن واحد میں ریزہ ریزہ کرنے کی بھی ان کے

اندر خصوصیات ہیں۔ بولا کرو...... سنا کرو۔'' عزیز نے اسے تفصیلاً سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کس سے کہوں......؟'' وہ مایوسی سے بولا۔

''جو تمہارے قریب ہو...... میں ہوں...... مجھ سے کہو جو تم کہنا چاہتے ہو۔ اپنی آپی سے کہو...... کبھی تم نے ان سے اپنے دل کی بات کی ہے......'' عزیز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے مڑ کر ضحیٰ کی طرف دیکھا اور جیسے خود ہی شرمندہ ہو گیا اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس نے شاید ہی زندگی میں کبھی اس سے بات کی ہو۔

''نہیں...... نہیں تو......'' وہ خود ہی بڑبڑایا۔

''کبھی کر کے تو دیکھو......'' عزیز مسکرایا۔

''کوشش کروں گا...... مگر کیا یہ ممکن ہے کہ انسان سب کچھ اگل دے اور سننے والا اس کو سمجھ بھی لے'' حسن نے حیرت سے سوال کیا۔

''بہت حد تک ممکن ہے...... کوشش کر دیکھو...... نتائج پر بعد میں بحث کریں گے، بس اپنے آپ کو یہ یقین دلاؤ کہ تم ایک نارمل انسان ہو اور زندہ بھی...... اور زندہ رہنے کے لیے کیا ضروریات ہیں کیا تم وہ تقاضے پورے کر رہے ہو یا نہیں...... یوں سوچو کہ تم زندگی کا نئے سرے سے آغاز کر رہے ہو...... نئی سوچ، نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں...... ہم تمہارے اپنے ہیں...... تم تنہا نہیں ہو اور نہ تنہا رہو گے...... کیا ایک وجود کے ختم ہونے کے ساتھ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی سوچا تم نے کہ ایک باپ جب چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر مرتا ہے کیا اس کے پیچھے اولاد یا اس کی بیوی بھی ختم ہو جاتے ہیں......'' عزیز نے اسے سمجھایا۔

''نہیں کبھی نہیں...... جیسے کہ میں......'' حسن نے آہستہ سے کہا۔

ضحیٰ نے عزیز کی جانب دیکھا...... اور دونوں نے حسن کی طرف...... اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''حسن سب سے پہلے وعدہ کرو...... تم ایسی منفی باتیں نہیں سوچو گے اور نہ ہی ان خوبصورت آنکھوں میں کبھی آنسو لاؤ گے۔ سنا تم نے...... لاؤ ہاتھ آگے کرو......'' عزیز نے اپنا ہاتھ اس کے آگے کیا اور اس نے بھی اپنا ہاتھ اس کے آگے بڑھایا۔

''تمہاری آنکھیں بہت پیاری ہیں......'' عزیز اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ

کر بولا۔

''واقعی......'' حسن حیرت سے بولا۔

''ہاں...... بہت خوبصورت...... جس چیز میں بھی نور ہو وہ نہ کبھی بدصورت ہو سکتی ہے نہ چندھیا سکتی ہے......'' عزیز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی اور اس کے دل و دماغ میں سکون کی لہر سی اتر گئی اور اس کی روح بھرپور انداز میں سرشار ہو گئی۔

(47)

اس نے وہ رات بہت پرسکون گزاری یوں لگ رہا تھا جیسے اندر سے کسی نے کوئی چیز کھرچ کر نکال دی ہو...... اس کے چہرے پر پھیلی مسرت اور طمانیت نے ضحیٰ کو بھی قدرے پرسکون کر دیا اور وہ بھی کافی دیر سوتی رہی...... صبح جب بیدار ہوئی تو وہ خود ہی چائے بنا کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ضحیٰ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''حسن تم کب بیدار ہوئے......؟'' ضحیٰ نے پوچھا۔

''جب نور اردگرد پھیلنے لگا......'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکی۔

''آپی نور کیا ہے......؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے عزیز کی کہی ہوئی بات اس کے ذہن میں نقش ہو گئی ہے۔

''ارے بھئی...... صبح اٹھتے ہی شروع ہو گئے ہو...... ذرا چائے تو پلواؤ پھر بتاتی ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

اور اس نے خاموشی سے چائے کا کپ اس کے آگے کر دیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو...... کہ نور کیا چیز ہے......؟''

''میرے خیال میں روشنی...... اردگرد پھیلی روشنی...... آنکھ کے اندر موجود روشنی انسان کے اندر پھیلی روشنی...... جیسے تاریک رات میں آسمان پر پھیلے بادلوں میں کڑکتی بجلی کی مانند روشنی...... بہت تیز بہت متحرک...... جو آن واحد میں تاریکی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے کہ پورا آسمان لرزنا اور کانپنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن نور کہاں سے آتا ہے...... اس کا منبع کہاں ہے یہ سمجھ نہیں آتا۔'' حسن ایک دم تیز تیز بولنے لگا۔

''تم نہیں سمجھو گے کیونکہ نور نے نور کو تخلیق کیا ہے...... زندگی کی تمام خصوصیات

نور سے عبارت ہیں اصل نور نے کائنات کے ذرے ذرے میں اس نور کو سمو دیا ہے۔نور حافظہ اور تخیل کی قوتوں کی روش اور تیز کرتا ہے۔ انسانی جسم میں یہ روح کے ذریعے اپنے اصل کی طرف جاتی ہے نور کی محبت انسان میں خواہش کی قوت یا تحریک کا باعث بنتی ہے جب یہی محبت کسی انا (وجود) میں ناقابلِ بیان ہلچل مچاتی ہے تو اس کو عشق کا نام دیا جاتا ہے۔عشق ہمیشہ ارتقاء کی طرف سفر کرتا ہے رفعتوں کی جانب...... بلندیوں کی طرف...... ناقابل تسخیر...... ناقابل بیان...... اس کا وجود بے چینیوں سے جنم لیتا ہے......کبھی لاحاصل جذبوں کو صورت میں......تو کبھی ارتقا کی طرف اور نتیجہ کبھی تو سچائی کا عرفان تو کبھی ذہنی انتشار اور خلفشار نکلتا ہے۔ اب یہ انسان پر ہے کہ وہ کس طرح رہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہے...... اور یہ کمال ہر انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ انسان کی ساری زندگی اسی میں صرف ہو جاتی ہے اگر وہ جوہر نایاب کو حاصل کر لے تو کامل اور اگر نہ کر سکے تو ناقص......'' ضحیٰ نے اسے منطقی انداز میں سمجھایا۔

''کیا انسان کی زندگی میں ''عشق'' بہت ضروری ہے؟ حالانکہ اسے اکثر Negative Sense لیا جاتا ہے۔'' حسن اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ہاں...... ہمارے ہاں سنی سنائی باتوں سے مفہوم خود بخود ہی اخذ کر لیے جاتے ہیں۔ اگر انسان خود توضیحات تلاش کرنا شروع کرے تو ہر ایک سوچ کو نجانے کتنے مفہوم مل جائیں لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ......عشق کو نوے فیصد لوگ مجازی رشتے سے جوڑ کر اس سے کراہت محسوس کرتے ہیں حالانکہ عشق تو وہ نعمت ہے جو صرف کائنات میں انسان کو عطا کی گئی ہے۔ ایسی نعمت جس سے فرشتے بھی محروم ہیں جو مطیع ہیں ذاکر ہیں ہر لمحہ تقرب میں بھی مگر انسان کو عشق عطا کیا گیا ہے کیونکہ عشق سوز و ساز ہے۔ خاموشی بھی ہے اور آواز بھی عشق ہجر و فراق کے بحر بیکراں میں طویل سفر طے کر کے جب وصال کے ساحلوں کو چھوتا ہے تو ہستی کی تکمیل ہوتی ہے۔ جب یہ آتشیں آگ دلوں میں روشن ہوتی ہے اور روح کے نور سے جلو پاتی ہے تو اور بھڑک اٹھتی ہے۔ انسان سرتا پا عشق بن جاتا ہے۔ اس آگ کے شعلے بدن کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں انسان تڑپتا ہے مچلتا ہے، لرزتا ہے گرتا ہے، ماہی بے آب کی طرح کبھی پانی کے ریلے میں اپنے آپ کو لہروں کے سنگ بہنے دیتا ہے۔ کبھی آگ میں اپنے آپ کو خوشی خوشی جھونک دیتا ہے کبھی فراق یار میں

پاتال کی طرف سفر کرتا ہے تو کبھی آسمان کی بلندیوں کو نگاہوں میں سمیٹ کر قدموں تلے روند ڈالتا ہے۔...... عشق اور ہجر دونوں سنگی ہیں۔ اکٹھے سفر کرتے ہیں۔ عشق سے آگ لگتی ہے اور ہجر اس پر تیل کا کام کرتا ہے پھر اس تڑپ میں اندر کی تمام قوتیں وصلاحیتیں عود کر باہر آتی ہیں۔ انسان شاہکار تخلیق کرتا ہے، خالق، مخلوق و تخلیق...... خدا، انسان اور کائنات، سفر شروع ہوتا ہے۔ دائرے کا قطر مکمل ہوتا ہے۔ مثلث کے تینوں کونے آپس میں جڑتے ہیں۔ زمین و آسمان کی وسعتیں سمٹ آتی ہیں کیونکہ صاحبان عشق ہی ان کو طے کرتے ہیں۔ عشق شناسائی کا نام ہے۔ عرفان کا نام ہے...... عشق بتاتا ہے کہ جلوۂ ذات کہاں ہے اور ذات حق کہاں......؟ یہ ایسی دولت ہے جو ہر ایک کو نہیں ملتی صرف ان کو جو دل میں تڑپ رکھتے ہیں جو سچائی کے درپے ہوں جو حقیقت کے متلاشی ہوں...... جن میں ہجر و وصال کے طویل سفر کو طے کرنے کا حوصلہ ہو جو دل رکھتے ہوں اور اس میں سوز بھی جو نظر رکھتے ہوں اور شوق دیدار بھی جو ذہن رکھتے ہوں اور سوچ یار بھی...... اور یہ سب کچھ وہاں سے عطا ہوتا ہے جو اپنے فیصلوں میں خود مختار ہوتا ہے اور جس کے حقوق اس کے پاس محفوظ ہوتے ہیں جو منتخب کرتا ہے جس کو چاہتا ہے کبھی تو کسی کو کسی کے فیض نظر سے مالا مال کر دیتا ہے تو کبھی کسی کو اپنی سوچ کے جلوے سے......تو کبھی کسی کو اس تڑپ سے...... جس میں عشق کی چبھن ہو...... فراق کی مہک ہو...... وصال کا جنون ہو اور کسی کے دیدار کی دیوانگی ہو......لیکن یہ بہت کٹھن منزل ہے...... یوں کہہ لو فنا سے بقا کی طرف...... شناسائی کا سفر، حقیقت کا اور سچائی کا سفر...... جس میں انسان لحہ بہ لحہ ٹوٹتا ہے ریزہ ریزہ ہوتا ہے، بکھرتا ہے، روز فنا ہوتا ہے روز جنم لیتا ہے اور اندر ہی اندر کرب سہتا ہے۔ پھر جڑتا ہے سنبھلتا ہے۔ سر اٹھاتا ہے، چلتا ہے کبھی تیز قدموں پر بھروسہ کرتا ہے مگر منہ کے بل گرتا ہے کبھی بوجھل قدم اوپر اٹھتے ہیں، کبھی فضا میں معلق ہوتا ہے۔ کبھی زمین کے گہرے کھڈوں میں گرتا ہے کبھی آسمان کی بلندیوں کی طرف سفر کرتا ہے اور کبھی اس سے بھی اوپر...... بہت اوپر...... عالم بالا میں...... ماورئی کی طرف...... بالا ہی بالا......'' وہ اپنی سوچ میں گم ہو گئی اس کے چہرے پر طمانیت بھی تھی اور اندر دہکتی آگ کے انگاروں کی بھاپ کا عکس بھی...... رنگت سرخ بھی ہو رہی تھی اور پیلی بھی...... آنکھوں میں جگنو بھی چمک رہے تھے اور لبوں پر دعائیں بھی مچل رہی تھیں...... وہ دیکھ رہی تھی مگر تخیل میں کسی اور طرف...... کس

کو، کس کی طرف، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا...... کس کے نام پر...... وہ خاموش تھی مگر خاموشی میں آواز تھی اور آواز میں بھی کسی کے لیے پکار تھی...... وہ سرتاپا سوز تھی...... ساز تھی...... مگر خاموش تھی...... فراق کا شاہکار تھی...... یا وصال کی طلب گار...... اس کو خود بھی علم نہ تھا...... وہ سوچ رہی تھی کس کے بارے میں......؟ اس کو یہ معلوم نہ ہو سکا......؟

(48)

بہت دنوں بعد قندیل اچانک واپس آ گئی فریدی صاحب اسے گیٹ پر ہی ڈراپ کر کے چلے گئے تھے وہ اندر داخل ہوئی تو ہر طرف سکوت ہی سکوت تھا۔ اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا اچانک اس نے برتنوں کی کھنک سنی تو وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ ضحیٰ کچھ پکانے میں مصروف تھی وہ چولہے کے پاس خاموش کھڑی نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

"میڈم......" اس نے آہستہ سے آواز دی۔

"اوہ قندیل تم...... تم کب آئی......؟" وہ خوش ہو کر اس سے ملی۔

"ابھی......"

"کیسی ہو...... ٹھیک تو ہو نا......؟"

"ہاں...... بالکل...... ہشاش بشاش......" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بالکل نہیں...... مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں...... اپنی پوری زندگی جہنم میں گزارنے کے بعد میں چند دن جنت میں گزار کر آ رہی ہوں...... ایسا سکون...... ایسی خوشی تو کبھی میں نے اپنے عشرت کدے میں محسوس نہیں کی...... یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا دل و دماغ سارا کا سارا بدل گیا ہو......" خوشی کی نمایاں جھلک اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

"اور تمہارے گھر والوں کا کیا بنا......؟" ضحیٰ نے پوچھا۔

"میرے ڈیڈی فریدی صاحب سے ملنے آئے تھے انہوں نے تفصیلاً ان سے بات کی...... ڈیڈی تو ان کی ہر بات مان گئے ہیں کہ جیسے قندیل کہے گی وہ مانیں گے...... لیکن میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ڈیڈی نے وقتی طور پر ایسا نہ کہا ہو...... اور میں چلی جاتی ہوں تو پھر کوئی ایسی زبردستی نہ کر دیں......" وہ فکرمندی سے بولی۔

"ہاں کچھ کہا نہیں جا سکتا......" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"لیکن ایک بات ہے اب میرا اندر اس قدر مضبوط ہو گیا ہے کہ اب ڈیڈی کچھ بھی کر لیں میں اپنے موقف سے نہیں ہٹوں گی۔" وہ مصمم ارادے سے بولی۔

"اچھا...... وہ کیسے......؟" ضحیٰ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جب آپ جیسے لوگ شمع جلائیں تو روشنی خود بخود ہو جاتی ہے......" اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو ضحیٰ نے پہلی دفعہ دیکھی تھی۔

"میڈم...... حسن کہاں ہے اور کیسا ہے؟" اس نے اردگرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں...... اور اب ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہے تم ملو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"واقعی......؟"

"ہاں......"

"اچھا تو میں چلتی ہوں ان کو ملنے......" قندیل اس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی...... دروازہ کھلا تھا...... اس نے جھانک کر اندر دیکھا...... وہ ایزی چیئر پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں......؟" قندیل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، بالکل......"

"کیسے ہیں آپ......؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ٹھیک ہوں...... اور آپ......" اس نے اس کا چہرہ بغور دیکھا جیسے وہ اسے شناسا لگ رہا تھا......

"میں...... میں اس کو سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ قندیل کہے یا ندا" وہ کچھ نروس ہو کر بولی۔

"آپ قندیل ہیں ناں......" وہ خود ہی بولا۔

"جی...... جی ہاں......"

"آپ نے ایک دم فون کرنا کیوں بند کر دیا تھا......؟"

"طلسم ٹوٹ گیا تھا......" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کیا مطلب......؟" وہ چونکی۔

"سحر ختم ہو گیا تھا اور آگہی نے دستک دی تھی...... میرا مطلب ہے...... میں نے حقیقت کو جان لیا تھا اور تسلیم کرنے کی کوشش کی......" حسن نے پر یقین آواز سے جواب دیا۔

"اب آپ کیسے ہیں......؟"

"کیسا لگ رہا ہوں......؟"

"بہت ٹھیک اور......"

"نارمل بھی......" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

"آپ بیٹھیں...... آپ کے والد صاحب مانے کہ نہیں......؟"

قندیل نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"آپی اور میں اکثر آپ کے پرابلمز ڈسکس کرتے ہیں......" وہ خود ہی بولا۔

"آئی سی...... کسی حد تک" مان گئے ہیں۔

"پریشانی کی بات نہیں...... سچائی کو اپنا آپ منوانے میں دیر تو لگتی ہے۔ مگر اس کا وجود ناممکن نہیں...... آپ اپنے حق کو جائز استعمال کر رہی ہیں۔ خدا بہتر کرے گا۔"

"آپ کیا پڑھ رہے ہیں......؟"

"ٹیگور......"

"ہاں سنا ہے اس کی فلاسفی بہت اچھی ہے......" قندیل نے کتاب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کبھی پڑھا ہے......؟"

"اتفاق نہیں ہوا......"

"ایسے اتفاقات پیدا کیا کریں......"

"ویسے اس کا میسج کیا ہے......" قندیل نے پوچھا۔

"God finds Himself by creating"

"کیا مطلب......؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"ٹیگور کا خیال ہے کہ خدا کی تخلیق خدا کی طرح ہے۔ لیکن ہر انسان کے لیے یہ دنیا مختلف ہے۔ کیونکہ ہر انسان اپنی تخلیق کردہ تصوراتی دنیا میں رہتا ہے۔ جہاں وہ اپنی زندگی ایک سائے کی طرح گزارتا ہے۔ اگر وہ غلط راستہ منتخب کرتا ہے تو اپنی خراب تخلیق میں تکلیف دہ زندگی گزارے گا...... اور آپ کو پتا ہے انسان کب صحیح ہوتا ہے......؟" اس نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں تو......"

When he feels his infinity where he's divine, and the divine is the creator in him.

ٹیگور کی فلاسفی بہت دلچسپ ہے وہ کہتا ہے

Unless there be finite, the infinite can not express itself. It is through the finite that the infinite manifests itself.

"یعنی وہ خدا اور انسان کے درمیان شناسائی کے رشتے کی بات کرتا ہے۔" وہ سوچ کر بولی۔

"ہاں یہاں پر لکھا ہے"

The Lord is in me, the Lord is in you as life in every seed.

"خدا اور انسان کو کیا چیز ملاتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"محبت...... محبت جو ابدی ہے جو لافانی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی...... جو خدا بھی ہے اور انسان بھی جس محبت سے خدا نے انسان کو تخلیق کیا ہے اور جس کے ذریعے انسان خدا سے ملتا ہے۔"

"مجھے اس چیز کی سمجھ نہیں آتی کہ جو چیز خدا اور انسان کو باہم جوڑتی ہے دوسرے انسان اس کو کیوں ناقابل قبول سمجھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے سوسائٹی اس کی اس قدر دشمن کیوں ہے وہ تو بس ہر رشتے کے اندر محبت کے جراثیم ڈھونڈتی ہے۔ اگر ظاہراً کچھ نظر نہیں آتا تو رُخ بدل لیتی ہے چاہے اندر ہی اندر محبت کی جڑیں کتنی مضبوط کیوں نہ

ہوں اور اگر کہیں یقین ہو جائے کہ محبت کہیں موجود ہے تو فوراً اس کے درپے ہو جاتی ہے۔" قندیل قدرے جذباتی انداز میں بولی۔

"کسی حد تک آپ درست ہیں۔ Free Sex کی طرح یہ Free Love کو بھی ناپسند کرتی ہے۔ اصل میں یہ محبت کی اتنی دشمن نہیں جتنی روایات کی دیواروں کے ٹوٹنے سے خائف ہوتی ہے جو محبت کرنے والے رو میں بہتے ہوئے بغیر کسی کی پرواہ کیے توڑ دیتے ہیں۔ یہ ان نتائج کو قبول کرنے سے خوفزدہ ہوتی ہے جو محبت کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتے ہیں......" حسن اسے سمجھانے کے انداز میں بولا۔

"لیکن کہیں کہیں سوسائٹی بہت منافقت کا مظاہرہ کرتی ہے وہ ہر طرح کی قباحتوں کو قبول کر لے گی جو پردے کی آڑ میں ہوں اور اب تو سب سے بڑا پردہ دولت ہے جو ہر عیب کو چھپائے ہوئے ہے۔ کسی بھی لبادے میں کوئی بھی برا کام کیا جائے اس کو کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کا ردعمل ہر ایک کی جانب ایک سا کیوں نہیں...... جو نظر آ جائے اس کو نشانہ بنا لیا جائے اور جو نظر نہ آئے اس کو چھوڑ دیا جائے......" قندیل نے پوچھا۔

"اس کی مثال آنکھ کی طرح ہے جو اس سے نتیجہ اخذ کرتی ہے جس کو دیکھتی ہے اور جو نظر نہیں آتا اس کو چھوڑ دیتی ہے...... لیکن ایسا مت سوچیں کہ سوسائٹی کسی بھی عیب کو زیادہ دیر چھپائے رکھتی ہے وقتی طور پر اس کو نظر انداز ضرور کرے گی مگر بلواسطہ یا بلاواسطہ وقتاً فوقتاً اس کو نشانہ بناتی رہے گی اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہر عیب کھل کر سامنے آ جاتا ہے......" حسن بولا۔

"ہاں...... لوگ کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتے......" اس نے آہ بھری۔

"اپنے اپنے تجربے کی بات ہے...... زندگی ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے انسان کو خود تجربے ہوتے ہیں یا جیسے نظریات وہ پروان چڑھاتا ہے...... ویسے آپ اچھی کتابیں پڑھا کریں نالج میں بھی اضافہ ہوگا اور آپ اچھا ڈسکس کر سکیں گی......" حسن نے اسے مشورہ دیا۔

"میں تنگ آ گئی ہوں مردوں کے اس Trick سے جیسے ہی باہر کی عورت میں اس کا نالج، اس کی ڈسکشن اس کا سٹائل دیکھتا ہے تو پھسل پڑتا ہے اور تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیتا ہے اور اگر یہی باتیں اس کی اپنی بیوی میں موجود ہوں تو ان کو ناپسند کرتا ہے۔"

قدم قدم پر اس کو Snub کرنے کی کوشش کرتا ہے۔'' وہ بے خیالی میں بولتی گئی۔

''کیا مطلب......؟'' حسن کو اس کی بات خاصی بری لگی۔

''میں اپنے باپ کی بات کر رہی ہوں...... اپنے بھائیوں کی بات کر رہی ہوں اپنی زندگی میں آنے والے بہت سے مردوں کی بات کر رہی ہوں، ہر مرد فلرٹ ہے جہاں پھسلن دیکھتا ہے تو Slip ہو جاتا ہے۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''یہ تو دوسرے پر ہے کہ پھسلن نہ ہونے دے......'' وہ آہستہ سے بولا۔

جواباً وہ خاموش ہو گئی اور وہ بھی خاموشی سے کتاب پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ضحیٰ اندر داخل ہوئی چائے کی ٹرالی لئے ہوئے۔

''ارے بھئی خاموش کیوں بیٹھے ہو...... میرا خیال تھا کہ اندر گرما گرم بحث جاری ہو گی کیونکہ حسن آج کل بہت بحث کر رہا ہے۔ مگر یہاں اس قدر خاموشی کیوں......؟'' ضحیٰ حیرت سے بولی۔

''بحث ہو چکی ہے...... لیکن ان کا ذہن زیادہ تر منفی کی طرف جاتا ہے۔ اور آپ ان سے خود پوچھ لیں...... لیکن پہلے چائے...... اور چائے میں بناتا ہوں۔'' حسن نے چائے کی ٹرالی اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

''قندیل کیوں پریشان ہو......؟'' ضحیٰ نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''یونہی...... یقین نہیں آتا کہ کوئی انسان شدت سے کسی سے محبت بھی کر سکتا ہے...... اور پھر اس پر ساری زندگی قائم بھی رہے کیونکہ کبھی تو سوسائٹی آڑے آتی ہے اور کبھی خود محبت کرنے والوں کے نظریات بدل جاتے ہیں......'' قندیل بد اعتمادی سے بولی۔

''ایک منٹ اس کا جواب میں آپ کو دیتا ہوں...... دیکھو قندیل میں ندا سے بہت محبت کرتا تھا کرتا ہوں اور شاید کرتا رہوں گا لیکن سوسائٹی راہ میں حائل ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کی یاد کو دل سے نکال پھینکوں گا...... وہ کوئی فالتو چیز نہ تھی اس کی یاد کوئی فضول اور بے ہودہ کام نہیں...... اس کی ہر یاد سے اس کی ہر بات سے مجھے Inspiration ملتی ہے۔ ابھی بھی جب کہ وہ میرے پاس نہیں...... اور اگر وہ نہیں ملی تو یہ محبت کی Demand نہیں کہ صرف اسی سے محبت کی جائے جو مل جائے۔ میں نے ابھی آپ کو بتایا کہ خدا اور انسان ایک ہیں۔ محبت کے بل بوتے پر...... انسان خدا کی تلاش میں

ہے اور خدا اس کا منتظر۔ دونوں میں رشتہ جتنا گہرا ہوتا جاتا ہے فراق کا کرب بھی گہرا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی شدت فراق میں انسان جان بھی دے دیتا ہے لیکن وصال ادھر جا کر ہوتا ہے۔ سوسائٹی جو کچھ مرضی کہے...... انسان کے اپنے نظریات جو بھی ہوں ان میں اس کو پکا ہونا چاہئے......'' وہ قطعیت سے بولا۔

''قندیل...... تمہارے نظریات اس لیے منفی ہیں کیونکہ تمہیں محبت جس رنگ اور شکل میں ملی ہے وہ اصل نہیں بلکہ منافقت اور آمیزش کے لبادے میں ملی ہے...... کھوٹ والی...... ناخالص...... جس میں تم اس کی خوشبو تک کو نہیں پا سکی...... اور یہ بڑے نصیب کی بات ہے کہ کسی انسان کو اصل میں چاہنے والے اور پیار کرنے والے لوگ ملیں...... محبت تو بہت الوہی جذبہ ہے...... بہت پاک...... بہت متبرک جو چیز روحوں کو ملائے، دلوں کو ملائے اور پھر خالق سے ملائے وہ کس طرح کریہہ ہو سکتی ہے۔ کیا تمہارے خیال میں وہ کوئی سستی چیز ہو گی یا بے وقعت'' ضحیٰ نے بھی وضاحت کی۔

''میڈم میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں جبکہ میں اس کی بو باس سے واقف تک نہیں...... میں نے تو وہ رشتے دیکھے ہیں جو محبت کے وجود کے بغیر ہی شروع ہوئے اور اس کے بغیر ہی اختتام کو پہنچ گئے...... میرے خیال میں تو ان کی بنیاد محبت نہیں بلکہ Animal Passions ہوتے ہیں۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''نہیں جبلت کو فطرت سے نہ ملاؤ...... محبت فطرت ہے اور جذبات، احساسات، جبلت اور سرشت ہیں جو کہ مختلف ہو سکتے ہیں کسی انسان میں زیادہ کسی میں کم اور کسی میں انتہا پر پہنچے ہوئے...... انسان میں حیوانیت بھی ہے اور محبت بھی۔ محبت کے بل بوتے پر اور اس کے Upper Hand کی وجہ سے انسان انسان ہے۔ اور جہاں یہ کمزور پڑتی ہے وہاں رشتہ کتنا ہی ناپائیدار کیوں نہ ہو...... اس میں بھی محبت کے جراثیم ضرور موجود ہوں گے چاہے کم ہی کیوں نہ ہوں...... کوئی بھی انسانی رشتہ محبت کے بغیر ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا...... اب ہمارے ہاں بہت سی شادیاں ایسی ہیں جن میں ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوتی مگر قائم رہتی ہیں۔ وہ صرف دو زندہ چلتے پھرتے وجودوں کی طرح ساتھ چلتے تو رہتے ہیں مگر باہم مل نہیں پاتے کیونکہ ان میں روحوں کا ملاپ نہیں ہو پاتا اور اگر روح کا ملاپ ہو جائے تو ذہنی ہم آہنگی اور مطابقت پیدا ہو جاتی ہے......'' ضحیٰ بولی۔

"تو ذہنی ہم آہنگی کس طرح پیدا ہوتی ہے......؟" قندیل نے سوال کیا۔

"اس کے لیے کسی ایک نقطے پر دونوں کو متحد ہونا پڑتا ہے...... کسی ایک مرکز پر اور پھر وہاں سے آغاز لے کر دونوں کو اس کے گرد گھومنا پڑتا ہے لیکن چونکہ انہوں نے اپنی زندگی کسی بنیاد سے شروع کی ہوتی ہے اس لیے وہ ہمیشہ جڑے رہتے ہیں کبھی علیحدہ نہیں ہو پاتے اور جیسے جیسے اس مرکز کے گرد ان کا دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ ذہنی اور روحانی ملاپ ان کے درمیان ہوگا جس کو وہ ذہنی ہم آہنگی کا نام دیں گے......" ضحیٰ نے جواب دیا۔

"اور جس کو اپنے نقطے کا پتا ہی نہ چل سکے......؟" قندیل نے پھر پوچھا۔

"تو وہ پھر ساری زندگی سرگرداں رہتے ہیں...... شکستہ وجودوں کی مانند بکھرے بکھرے سے...... ہمیشہ پریشان...... وہ دائرے میں گھومتے تو رہیں گے مگر بنیاد کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہمیشہ تڑپتے رہیں گے...... ہمیشہ دکھی رہیں گے۔"

"لیکن نقطے کا کس طرح پتا چلے......؟" حسن بولا۔

"یہ ہر انسان کی ذاتی سوچ...... عقل اور ذہنی میلان پر منحصر ہے کہ وہ آغاز میں ہی کسی نقطے پر متحد ہو جائے۔" ضحیٰ نے جواب دیا۔

"کچھ ذہن اتنے Immature ہوتے ہیں کہ ساری زندگی گزارنے کے بعد بھی ان کو بنیادی حقائق کی سمجھ نہیں آتی...... ایسا کیوں ہوتا ہے......؟" قندیل نے پھر پوچھا۔

"قندیل یہ ایسا معاملہ ہے جس میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا...... کیونکہ ہر ایک کے پس منظر میں ایک مخفی طاقت ہے جس کو ہم کبھی فطرت...... کبھی نیچر...... اور کبھی قدرت کا نام دیتے ہیں جس کا سرچشمہ خالق اور قادر مطلق ہے وہ جتنا چاہتا ہے انسان کو نوازتا ہے کسی کو بے پناہ صلاحیتیں، کسی کو کم، کسی کو بالکل ہی کم...... انسانوں کے بھی درجے ہیں...... اللہ تعالیٰ نے قلب انسانی کو چھ قوتوں شہوت، غضب، تحرک، تفہیم، ارادہ و عقل سے نوازا ہے اور جانوروں میں صرف تین ہیں، شہوت، غضب اور تفہیم...... یہ صرف عقل ہے جو انسان کو ممتاز کرتی ہے پھر عقل بھی کسی کو کم کسی کو زیادہ دی گئی ہے۔ امام غزالی کے نزدیک انسانی فطرت چار عناصر پر مشتمل ہے۔ یہ عناصر عاقل، خنزیر، کتا اور شیطان پر مشتمل ہے۔ انسان میں عاقل یا حلیم اس کی عقل ہے خنزیر شہوت کی علامت ہے کتا غضب کی مثال اور شیطان

اس وحشی کی طرح ہے جو ان دو جانوروں کو عقل کے خلاف بغاوت پر اکساتا ہے۔ مختلف افراد میں یہ قوتیں مختلف تناسب سے موجود ہوتی ہیں اور انسانی روح رفتہ رفتہ ان قوتوں پر عقل کے ذریعے غلبہ پا کر معراج حاصل کرتی ہے، انسانی روح مختلف مدارج سے گزر کر تقویت حاصل کرتی ہوئی الوہیت کے درجے پر جب فائز ہوتی ہے تب اس کا صحیح رنگ، چمک دمک اور خوشنمائی سامنے آتی ہے......" ضحیٰ بولی۔

"آپی وہ درجات کیا ہیں......؟" حسن نے پوچھا۔

"یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح سائنس دان انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل کو گنواتے ہیں کہ پہلے جمادات، نباتات، حیوانات اور پھر انسان۔ اسی طرح انسانی روح کے بھی مختلف ارتقائی مراحل ہیں پہلے درجے پر انسان جو صرف محسوسات سے واقف ہوتے ہیں اور جن میں عقل اتنی پختہ نہیں ہوتی کہ وہ اس کی شمع کی بدولت منازل طے کر سکیں۔ دوسرے درجے میں انسان محسوسات اور عقل سے تھوڑی بہت آگاہی رکھتا ہے۔ تیسرے درجے میں انسان عقل کو استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور چوتھے درجے پر انسان عقل کو ہر قوت خاص طور پر محسوسات پر حاوی کرتا ہے۔ پانچویں مرحلے پر انسان روحانی حقائق کے اسرار سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس درجے پر انسان پر روح کی حقیقت اور حق سے شناسائی واضح ہوتی ہے۔ یہ درجہ انسانیت کی معراج ہے اور ایسے انسان پر جب اسرار فاش ہوتے ہیں تو وہ عالم تحیر میں پہنچ کر مقرب کا درجہ پالیتا ہے اور اس کی عقل پھر "عقل سلیم" بن جاتی ہے اور اس کی ذات ان صفات کا "شاہکار" بن جاتی ہے جو خالق کی ذات میں موجود ہوتے ہیں اور تقرب کی یہ منزل بہت مشکل سے ملتی ہے۔ یہ صرف جدوجہد کی منزل نہیں بلکہ "رضا و تسلیم" کی منزل ہے جو اس کے کرم سے ملتی ہے یہ منزل زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپے ذروں کو آسمان کی رفعتوں میں پھیلے وحدت کے جلوؤں تک ملانے کا نام ہے۔ یہ سوز، عشق اور محبت و سرور کی منزل ہے رحمتوں کے عرفان کی منزل ہے......" وہ بولتی رہی اور پھر ایک دم خاموش ہوگئی۔ حسن اور قندیل نے ایک دم حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"آپی منزل کے لیے راستے کا تعین اور علم ہونا بھی بہت ضروری ہے کون سا راستہ......؟" حسن نے یوں جیسے اسے نیند سے جھنجھوڑ دیا ہو......

''کبھی یہ راستہ تنہائی میں دریافت ہوتا ہے کبھی یہ تڑپ کسی مقرب انسان کے پاس لے جاتی ہے اور کبھی انسانوں کے اندر رہ کر ہی انسان یہ سفر آہستہ آہستہ طے کرتا عرفان کی منزلوں تک پہنچتا ہے......'' اس کی نظروں میں ایک دم میاں جی، فریدی صاحب اور درانی صاحب گھوم گئے اور وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حسن اور قندیل بھی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔

''حسن...... اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو اتنے مراحل طے کرتا ہے، وہ خود نہیں بلکہ کوئی غیر مرئی قوت اس سے کراتی ہے۔ شاید ایسی مخفی طاقت جس کو کبھی ہم فطرت، کبھی نیچر اور کبھی قدرت کا نام دیتے ہیں......'' قندیل نے اس سے پوچھا۔

''ہاں...... شاید وہی...... جہاں پر انسان کی کوششیں اور عقلی دلائل جا کر رک جاتے ہیں...... جہاں سے لامحدود کی طرف سفر شروع ہوتا ہے......'' حسن نے جواب دیا۔

''تو کیا انسان وہاں جا کر مجبور نہیں ہو جاتا...... میرا خیال ہے جب اپنا کوئی عمل انسان کو اس قوت کو سونپنا پڑتا ہے تو وہ Fatalist بن جاتا ہے اور اگر اس حقیقت کو نہ مانے تو Pessemist۔ کیونکہ اس کو ہر سوچ، ہر عمل قدرت کے سامنے فیل (Fail) ہوتا نظر آتا ہے اس کی Limitations اگر اس کو نہ ورغلائیں تو ٹھیک، ورنہ وہ تو اپنے آپ کو ناکارہ پرزہ سمجھ کر برباد کر دیتا ہے...... حسن انسان تو پھر کٹھ پتلی ہوا جب یہ حالت ہو کہ...... Man Proposes God disposes۔ تو پھر خود انسان اور اس کی منفرد ذات، اس کا ارادہ کہاں ہے؟ قندیل نے سوال کیا۔

''قندیل یہ دائرہ محدود تو ہے مگر اس کو اتنا تنگ مت کرو کہ سوچ منفی ہو جائے کیونکہ جوں جوں دائرہ تنگ کرتی جاؤ گی سوچ منفی ہوتی جائے گی۔ دائرے کو محدود ضرور سمجھو مگر تنگ مت بناؤ...... اور قدرت انسان کا امتحان لیتی ہے ہونا نہ ہونا قدرت پر چھوڑنا پڑتا ہے۔ ندا کہا کرتی تھی...... جب انسان بالکل مایوس ہو جاتا ہے اور ہر طرف Darkness ہوتی ہے انسان کا اندر تاریک ہو چکا ہوتا ہے تو پھر کہیں سے امید کی کرن Twilight کی طرح ظاہر ہوتی ہے جو ایک دم تاریکی کو اجالے میں بدل دیتی ہے اور سارے اندھیرے رفع ہو جاتے ہیں اور کبھی شمع بہت روشن ہو تو ایک جھونکا اس کو بجھا دیتا ہے...... یہ تو لمحوں کا ہیر پھیر ہے بس۔ انسان کی بقا تو اپنے رب کی رضا میں ہے۔ سر تسلیم خم کرنے میں ہے اپنی ذات کو اس اٹل حقیقت میں فنا کرنے میں ہے۔'' حسن بولتا ہی گیا۔

''حسن...... کیا ندا بہت خوبصورت باتیں کرتی تھی......؟'' قندیل نے اسے کھوئے کھوئے دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں...... بہت خوبصورت...... اپنے باطن کی طرح خوبصورت اور اپنی ذہین آنکھوں کی طرح چمکدار......'' حسن کی آنکھیں اس کے خیال سے چمکنے لگیں۔

اور قندیل اس ''چمک'' میں کھو سی گئی۔

......❁......

(49)

"قندیل میں سوچ رہی ہوں کیوں نا گھر میں چھوٹی سی پارٹی کریں۔" ضحیٰ اس کے قریب بیٹھی سبزی کاٹتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب، میڈم......؟" وہ چونکی۔

"ارے بھئی...... میرا دل چاہتا ہے ایک گیدرنگ ہو......"

"لیکن کس خوشی میں......؟"

"حسن کی صحت یابی کی خوشی میں...... اصل میں حسن نے اپنی زندگی میں بہت کم خوشیاں دیکھی ہیں...... ہماری زندگیوں میں خوشیوں کے مواقع بہت کم آئے ہیں...... شاید اس لیے......" وہ آہ بھر کر بولی۔

"یہ تو بہت اچھا خیال ہے......کیا آپ نے حسن سے پوچھا......؟" قندیل نے کہا۔

"وہ کیا کہے گا...... اس نے میری کسی بات کو کبھی نہیں ٹالا......" وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے آپ مہمانوں کی لسٹ بنالیں...... باقی میں جانوں اور میرا کام۔"

تھوڑی دیر بعد حسن بھی آگیا۔

"حسن میڈم گیٹ ٹو گیدر کا سوچ رہی ہیں۔" قندیل نے اسے بتایا۔

"ارے بھئی کس خوشی میں...... کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے......" وہ مسکرا کر بولا۔

"تمہاری خوشی میں......"

"میری......؟" وہ چونکا۔

"ہاں تمہارے سر پر سہرا سجانے کا سوچ رہی ہیں......" قندیل نے اسے چھیڑا۔

"بکومت...... بال سر پر ٹھہرتے نہیں...... سہرا کہاں ٹکے گا۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

"فکر مت کرو اس کو ٹکانا ہمارا مسئلہ...... رسیوں سے باندھ لیں گے۔" ضحیٰ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی...... شاید بہت عرصے بعد وہ اتنا کھل کر ہنسی تھی جیسے بادلوں کی اوٹ سے سورج پوری تمازت کے ساتھ نمودار ہو کر سارے ماحول کو روشن اور چمکدار بنا دیتا ہے۔

"آپی آپ ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔" حسن نے کہا۔

تو وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی اور اسے حسن بہت یاد آنے لگا۔

"کیا ہوا......؟" وہ پریشان ہوگیا۔

"تمہیں سمجھ نہیں آئے گا...... دل کی بات دل والوں کو ہی معلوم ہوتی ہے۔" قندیل مسکرا کر بولی۔

"کیا ہم دل نہیں رکھتے......؟" حسن نے پوچھا۔

"آپ بال نہیں رکھتے تو دل کہاں سے رکھیں گے......؟" قندیل نے پھر اسے چھیڑا اور ضحیٰ کی طرف دیکھ کر بولی۔

جواباً سب مل کر ہنسنے لگے۔

"ہاں تو میڈم پارٹی کا فائنل کریں۔" قندیل نے یاد دلایا۔

اور وہ مہمانوں کی لسٹ بنانے لگی۔ اس نے اپنے سب ملنے والوں کو مدعو کیا۔

بہت دنوں کے بعد گھر میں اس طرح رونق لگی تھی وہ بھی بہت خوش تھی حسن نے بھی اپنے چند دوستوں کو بلایا تھا۔ ضحیٰ کبھی عزیز کے پاس بیٹھتی، کبھی فیض کے پاس، فریدی صاحب آئے تو وہ ان سے دیر تک باتیں کرتی رہی...... کبھی میاں جی کے بارے میں تو کبھی درانی صاحب کے بارے میں...... کبھی پرانی یادیں...... کبھی تلخ تجربے تو کبھی مستقبل کی دل کھول کر سب کے ساتھ سب کچھ ڈسکس کیا۔

"فریدی صاحب اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ زندگی کا سفر بس تھوڑا ہی رہ گیا ہے......" ایک دم وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب......؟" وہ چونکے۔

"نجانے کیوں مجھے یوں احساس ہونے لگا ہے کہ بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے"

"کیا کوئی منفی سوچ جنم لے رہی ہے......؟" انہوں نے کریدا۔

"ارے نہیں فریدی صاحب..... ایسی کوئی بات نہیں..... صرف ایک احساس سا ہوتا ہے، کبھی کبھی..... نجانے اس میں سچائی بھی ہے یا نہیں..... خیر..... آپ میرے بعد آتے رہیئے گا..... ان بچوں کا خیال رکھیئے گا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"آپ بے فکر رہیں خدا بہتر کرے گا....."

بہت عرصے بعد گھر میں یوں رونق لگی تھی۔ حسن نے سب کی فرمائش پر غزل سنائی۔

"ایک اور....." قندیل بولی۔

"نہیں بھئی تھک گیا ہوں....."

"اب بنو مت..... اتنا اچھا گاتے ہو..... مجھے تو آج پتا چلا..... میڈم نے کبھی بتایا ہی نہیں....." قندیل ہنستے ہوئے بولی۔

"حسن، ہاں بھئی ضرور ایک اور ہونی چاہیئے....." عزیز بولا۔

"ٹھیک ہے..... کون سی.....؟"

"بھئی یہ تو ان پر ہے جنہوں نے فرمائش کی ہے....." عزیز نے قندیل کی جانب دیکھ کر کہا۔

"وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا....." قندیل مسکرا کر بولی۔

"اس موقع پر تم نے کیا ذکر چھیڑ دیا.....؟" اس نے سرگوشی کی۔

"آئی ایم سوری..... رہنے دو..... پھر کبھی سہی....." وہ نادم سی ہونے لگی۔

"نہیں اب تو کچھ بھی ہو سنانا تو پڑے گی....." حسن زخمی مسکراہٹ سے بولا۔

غزل سنانے کے بعد وہ اٹھ کر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا..... قندیل اپنے آپ کو مجرم تصور کرتی رہی..... موقع پا کر وہ اس کے کمرے میں آ گئی۔

"حسن..... میرا قطعی یہ مطلب نہ تھا، بائے گاڈ....." قندیل نے وضاحت کرنا چاہی۔

"ہاں میں جانتا ہوں..... لیکن کبھی کبھی نادانستہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے....." وہ بولا

"کیا تمہیں بہت برا محسوس ہوا.....؟" قندیل نے پوچھا۔

"نہیں اس کی کمی کا شدید احساس ہوا..... کاش وہ یہاں ہوتی تو....." حسن افسردگی سے بولا۔

"حسن کیا تم اس کی کمی بہت شدت سے محسوس کرتے ہو.....؟" قندیل نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں..... کبھی کم..... لیکن کبھی کبھی بہت..... زیادہ مگر کمی تو ہر وقت ہر جگہ رہتی ہے..... نہ ہونے کا احساس..... کچھ چھن جانے کا شدید ملال۔" وہ دکھی لہجے میں بولا۔

"حسن پلیز باہر آؤ..... مہمان جانے والے ہیں۔ میڈم انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"تم جاؤ....."

"نہیں تم بھی میرے ساتھ چلو....."

وہ مجبوراً اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے اور وہ دونوں ٹہلتے رہے..... وہ اسے ندا کے بارے میں ڈھیروں باتیں بتاتا رہا اور وہ اسے اپنے تلخ ماضی کے بارے میں.....

"حسن میرا ماضی اتنا تلخ ہے کہ میں ہزار بار چاہنے کے باوجود بھی کسی کو کھل کر نہیں بتا سکتی....." وہ دکھ سے بولی۔

"قندیل..... ہر ایک کے پاس ہر وقت کچھ ایسی یادیں، کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ وہ کبھی بھی کھل کر نہیں بتا سکتا..... کسی کا ماضی..... کسی کا حال..... کسی کی سوچیں..... کسی کے راز..... کسی کی باتیں۔ سب میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے..... کبھی کبھی حقائق اپنے آپ سے بھی چھپانے کو دل چاہتا ہے۔" وہ اس کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے بولی۔

رات بہت گہری ہو چکی تھی جب وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا تو وہ ضحیٰ کے پاس چلی آئی۔ حسن تو گہری نیند سو چکا تھا مگر وہ اس نادانستہ غلطی پر کروٹیں بدلتی رہی..... اس نے حسن سے معافی مانگ لی تھی اور اس نے معاف بھی کر دیا تھا مگر اب حسن سے کی ہوئی باتیں اس کو یاد آ رہی تھیں..... اس کو رشک آ رہا تھا اس لڑکی پر جس سے یہ خوبصورت انسان اتنی محبت کرتا تھا۔ یقیناً وہ واقعی اس قابل ہو گی..... کتنا اچھا ہوتا اگر دو خوبصورت دل اور ذہن رکھنے والے انسان مل جاتے تو ان کی زندگی کتنی خوبصورت، کتنی مترنم اور رنگین ہوتی..... مگر.....؟ وہ اس سے آگے نہ سوچ سکی۔

صبح ضحیٰ فجر کی نماز پڑھنے کے لیے بیدار ہوئی تو بہت مسرور تھی اور حیران بھی..... آج رات بہت عرصے بعد اس نے میاں جی کو خواب میں دیکھا تھا وہ محبت بھری

نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے اور پھر آگے بڑھ کر انہوں نے اسے ایک خوبصورت سفید چادر دی۔ وہ جلدی سے جلدی یہ خواب فریدی صاحب کو سنانا چاہتی تھی......میاں جی کے چہرے پر پھیلا تبسم اور نور سب اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''ناشتے سے فارغ ہو کر وہ فریدی صاحب کے گھر گئی۔ اس وقت وہ اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھے عبادت میں مصروف تھے اسے دیکھ کر مسکرائے۔

''آیئے ضحیٰ بی بی آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا......''

''رات کو میاں جی خواب میں آئے تھے...... بہت عرصے بعد میں نے انہیں خواب میں دیکھا ہے۔'' اس نے جلدی جلدی بتایا۔

''ہاں......معلوم ہے اور یہ آپ کے لیے'' انہوں نے کوئی چیز لپٹی ہوئی اسے پکڑائی۔

''کیا ہے یہ......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے آپ کو علم ہونا چاہیے......'' فریدی صاحب نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

اس نے کھول کر دیکھا...... ویسی ہی سفید چادر جیسی اس نے خواب میں دیکھی تھی۔ اس نے کھول کر اسے اوپر اوڑھ لیا۔

''مبارک ہو......'' فریدی صاحب مسکرائے۔

''شکریہ......'' فرط جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے......

''ایک سفر تمام ہوا اور دوسرا سفر مبارک ہو...... قدرت کسی کسی کو اس راہ کا مسافر بناتی ہے۔'' فریدی صاحب بولے۔

''اور اس راستے کے رہنما بھی......'' وہ بولی۔

''یہ سب اس کے کرم کی بات ہے اس کی عطا اور رحمت ہے...... ورنہ تو سب کچھ ناممکن ہوتا ہے۔'' فریدی صاحب نے کہا۔

''ہاں......'' اس نے آہ بھری اور خلا میں یوں گھورنے لگی۔ جیسے کچھ راستہ نظر آ رہا ہو، اس کے اردگرد فریدی صاحب، میاں جی اور درانی صاحب بھی کھڑے ہوں اور وہ چاروں ایک نا معلوم سفر کی طرف گامزن ہوں اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اردگرد خوشبو سی محسوس کی اور روشنی بھی...... وہ آہستہ آہستہ مجذوبی کیفیت سے دوچار ہونے لگی۔

(50)

کچھ دنوں سے ضحیٰ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی شدید کھانسی کا دورہ پڑتا اور اکثر بخار بھی تیز ہو جاتا اس کی وجہ سے اتنی نقاہت ہو گئی تھی کہ اکثر اٹھنا محال ہو جاتا اور بستر پر لیٹے لیٹے اس کی کمر دکھنے لگی تھی۔ قندیل اس کی بہت دیکھ بھال کرتی حسن بھی ہر وقت اس کے پاس بیٹھا رہتا۔

''حسن...... میڈم کا بخار کم کیوں نہیں رہا؟'' قندیل نے اس کے پاس بیٹھ کر پریشانی سے کہا۔

''نجانے کیوں...... ڈاکٹر سے آج میری بات ہوئی تھی وہ تو موسمی بخار بتا رہے تھے مگر یہ کم کیوں نہیں ہو رہا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اگر ایک دو دن میں افاقہ نہ ہوا تو پھر ہاسپٹل ایڈمٹ کرا دیں گے۔'' حسن نے بھی پریشانی کا اظہار کیا۔

فریدی صاحب روزانہ اس کی خیریت دریافت کرنے آتے۔ ایک شام آئے تو ان کے ساتھ قندیل کا باپ بھی تھا۔ وہ چونک گئی۔

''آپ......؟'' قندیل حیرت سے بولی۔

''ہاں...... میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' اس کے باپ نے آہستہ سے جواب دیا۔

''لیکن میں کیسے جا سکتی ہوں...... میڈم کی طبیعت بہت خراب ہے؟'' قندیل نے ضحیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم میرا فکر نہ کرو...... تم اپنے والد کے ساتھ چلی جاؤ'' ضحیٰ نقاہت سے بولی۔

''میڈم یہاں پر کوئی بھی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں...... میں کس طرح جا سکتی ہوں۔''

''تم جاؤ حسن یہاں ہے اگر ضرورت پڑی تو میں تمہیں بلوا لوں گی۔'' ضحیٰ نے

خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹی چلی جاؤ...... اب سب ٹھیک ہو گا۔'' فریدی صاحب بولے۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ سب کہتے ہیں لیکن......؟'' اس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''بے فکر رہو...... اب ایسا کچھ نہیں ہو گا...... میری ان سے تفصیلاً بات ہو چکی ہے۔''

فریدی صاحب نے اسے دلاسا دیا۔

''لیکن یہ سب......؟'' قندیل حیران ہو رہی تھی۔

''گھر جاؤ گی تو معلوم ہو جائے گا...... اس وقت تمہارے باپ کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔'' فریدی صاحب نے اسے سمجھایا۔

''جی اچھا......'' اور وہ اپنا سامان پیک کرنے لگی۔

''آپ سب لوگ اگر اجازت دیں تو میں نے قندیل سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''ہاں...... ہاں ضرور'' سب باہر نکل گئے۔

''قندیل مجھے نہیں معلوم کہ میری زندگی کتنی باقی ہے کتنی نہیں پھر نجانے میں تم سے دوبارہ مل سکوں گی یا نہیں...... میں ضرور یہ چاہتی ہوں کہ تم حسن کو اپنا ہمسفر بنالینا وہ بہت نفیس انسان ہے۔'' ضحیٰ نے قندیل کو محبت سے سمجھایا۔

''میں...... اور...... حسن...... یہ کیسے ممکن ہے......؟ آپ میرا ماضی بھی بہت اچھی طرح جانتی ہیں اور حسن بھی...... اس کو ابھی اپنا دکھ نہیں بھولا...... اور پھر ہم کس طرح ایڈجسٹ کر پائیں گے...... یہ ناممکن ہے۔'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''مجھے پانی کا گلاس دو۔'' ضحیٰ نے نقاہت سے کہا۔

اس نے اسے پانی پلایا...... تو اس کی سانس پھولنے لگی۔

''دیکھو دو گرے ہوئے اور شکستہ وجود ہی ایک دوسرے کو بہترین سہارا دے سکتے ہیں اور جہاں انڈر سٹینڈنگ ہوتی ہے اکثر وہاں شادی نہیں ہوتی...... اس کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ سی پھیلنے لگی۔ سب کچھ قدرت کے ہاتھ میں ہے کہاں کا رزق کس کو نصیب ہوتا ہے اور نجانے کہاں کی کھیتی کس کو آباد کرنی ہوتی ہے اور ایک کی قسمت کہاں جا کر ملتی ہے یہ خدا بہتر جانتا ہے...... انسان کی سوچ سے بالا ہی تمام فیصلے ہو جاتے ہیں اور انسان کو خبر بھی نہیں ہوتی...... کبھی کبھی جس شے کو وہ اپنے لیے بہت بہتر سمجھتا ہے وہی شے بعد میں

اس کے لیے ناقابل قبول بن جاتی ہے اور بہت سی تلخ حقیقتیں بعد میں خوشگوار واقعات میں تبدیل ہو جاتی ہیں...... سب کچھ خدا بہتر جانتا ہے...... اسی پر چھوڑ دو...... باقی تمہارا فیصلہ مقدم ہو گا...... کوئی زبردستی نہیں...... تم بھی سمجھ بوجھ رکھتی ہو۔'' ضحیٰ نے سمجھایا۔

''میڈم...... کیا آپ نے کبھی اس سلسلے میں حسن سے بات کی ہے؟'' قندیل نے پوچھا۔

''نہیں......''

''تو کیا وہ مان جائے گا؟'' قندیل نے سوال کیا۔

''معلوم نہیں...... لیکن ہو سکتا ہے مان جائے...... میں بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ تم دونوں سے بات کروں مگر آج تمہارے ڈیڈ اچانک آ گئے ہیں اس لیے پہلے تم سے بات کرنا پڑی۔''

''آپ پہلے حسن سے بات کر لیجئے...... کیا وہ مجھے قبول کر لے گا یا نہیں...... کیونکہ میں اب مزید تکلیف میں زندگی نہیں گزار سکتی۔'' قندیل فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''جلدی آنے کی کوشش کرنا۔''

اور اس نے اسے دعائیں دے کر رخصت کیا۔

اس کے جانے کے بعد گھر بالکل سونا سونا ہو گیا۔ وہ تو اس کے جانے کے بعد سو گئی اور حسن اس کے پاس بیٹھا کتاب پڑھتا رہا اس کو چائے کی شدید طلب ہونے لگی اس نے قندیل کو آواز دینا چاہی مگر رک گیا پھر خود ہی اٹھ کر چائے بنانے چلا گیا۔ چائے کا کپ لیے اندر داخل ہوا تو ضحیٰ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''حسن...... زندگی کا سفر اکیلے طے نہ کرنا...... قندیل کو اپنا ہمسفر بنالینا'' ضحیٰ نے ایک دم اسے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکا

''وہ بہت اچھی ہے...... اگر اس کا ماضی تلخ ہے تو اس کے حالات ہی ایسے تھے ورنہ وہ ایک اچھا دل اور اچھا ذہن رکھتی ہے......'' ضحیٰ نے اسے سمجھایا۔

''آپی مگر میں...... یہ ممکن نہیں۔'' وہ مشکوک لہجے میں بولا۔

''کیوں......؟''

''میرا دل و دماغ کسی اور کا ہے...... میں اس کو کیسے بھول سکتا ہوں اور اگر شادی ہو بھی جائے تو میں کس طرح قندیل کو وہ مقام دے سکتا ہوں جو ندا کا میرے دل میں ہے...... یہ بہت ناممکن لگتا ہے۔'' اس نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

''حسن بیٹا...... سب وقت وقت کی بات ہے یہ سچ ہے کہ جس کو ہم دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں کبھی بھی ان کی یاد کو دل سے نہیں نکال سکتے مگر یادوں کے سہارے زندہ رہنا بہت مشکل کام ہے...... ہر وقت کی یادیں...... انسان کو بہت دکھ دیتی ہیں...... یہ یادیں ہوتی تو بہت مسرور کن ہیں...... مگر اندر ہی اندر کھوکھلا بھی کر دیتی ہیں...... آکاس بیل کی طرح یہ بھی انسان کو تباہ کر دیتی ہیں...... خدا نے انسان کو ایسا ہی بنایا ہے کہ جس ماحول میں چند دن رہتا ہے اس کا عادی بن جاتا ہے قندیل کا ساتھ تمہیں نئی زندگی دے گا...... ندا کی یاد بھی تمہارے دل میں رہے گی خوبصورت ماضی کی طرح مگر قندیل روشن حال اور مستقبل کی طرح تمہارے سنگ سنگ چلے گی...... مجھے پورا یقین ہے'' وہ پر امید لہجے میں بولی۔

''آپی میری اور اس کی سوچ شاید کبھی نہ مل سکے۔'' وہ پھر بولا۔

''سوچ کبھی ایک سی نہیں رہتی ہمیشہ بدلتی ہے وقت کے ساتھ ساتھ جو تمہاری سوچ آج ہے وہ کل نہ تھی جو آج ہے وہ کل نہ ہوگی۔ سوچ انسان کے تجربے سے جنم لیتی ہے۔ جیسا جیسا تجربہ ہوتا جائے گا سوچ بنتی جائے گی...... تم پھر بھی سوچ لو اچھی طرح۔''

اور اس نے آنکھیں موند لیں۔ حسن نے کتاب اٹھائی مگر اس کا ذہن کسی اور طرف چل پڑا تھا...... وہ کیا پڑھ رہا تھا اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا...... اس نے کتاب وہیں رکھ دی اور اٹھ کر ٹہلنے لگا...... اس کو گھٹن سی محسوس ہونے لگی تو اٹھ کر لان میں چلا گیا۔

❁

(51)

سارا راستہ وہ گاڑی میں خاموش بیٹھی رہی...... پچھلے کئی برسوں سے دونوں کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی تھی اس کو پار کرنا مشکل لگ رہا تھا...... دونوں ہی عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔

''قندیل...... ماجد اور ساجد گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں'' اس کا باپ دکھ سے بولا۔

''کیا...... کب......؟'' وہ حیرت سے اچھلی۔

''انہوں نے اندر ہی اندر اپنا اپنا بزنس علیحدہ کر لیا تھا...... اور مجھے خبر ہی نہ ہوئی......'' اس کا باپ پریشانی سے بولا۔

''میں اب بالکل تنہا ہو گیا ہوں...... گھر بھی سونا ہو گیا ہے...... اور......'' اس کا باپ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ قندیل مزید کچھ نہ پوچھ سکی۔

''سب کچھ ختم ہو گیا ہے......'' اس کے باپ کے لہجے میں شدید کرب تھا۔

''فریدی صاحب بہت اچھے انسان ہیں......'' وہ خود ہی بولتا رہا۔

''ہاں...... بہت نفیس اور بہت نیک...... ان کے گھر چند دن رہنے کے بعد مجھے یوں احساس ہوا کہ میں پہلی دفعہ کسی گھر میں رہ رہی ہوں...... ورنہ ساری زندگی تو سراب کی نذر ہو گئی...... ان کے سائے میں مجھے باپ کی شفقت اور پیار ملا ہے...... ڈیڈی...... آپ نے ہم سب کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے......'' وہ کرب سے بولی۔

''مجھ سے...... بہت بھول ہوئی......؟''

''ڈیڈی اس کو بھول مت کہیں...... اس کو گناہ بولیں...... آپ کی بیوی کی زندگی آپ کے گناہوں کی نذر ہو گئی...... اور ہمارا گھر تنکا تنکا ہو کر بکھر گیا...... ڈیڈی آپ نے بہت لوگوں کو رلایا ہے...... میں نے اپنی زندگی میں اتنی سانسیں نہیں لیں جتنی آہیں بھری

ہیں ہر سانس کے ساتھ میں نے آنسو پیے ہیں اور کاش آپ ان آہوں بھری سانسوں کا کرب جان سکیں...... وہ سیدھی دل پر وار کرتی ہیں...... ہر آہ کے ساتھ دل کٹتا ہے...... دل ہر وقت روتا ہے اور آنکھیں اس کی ہر ٹیس پر یوں ابل پڑتی ہیں جیسے کب سے پھٹ پڑنے کو تیار بیٹھی ہوں......'' قندیل نے انتہائی کرب سے کہا۔

اس کے باپ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور اس کے منہ سے یہ باتیں سن کر اسے قدرے حیرت ہو رہی تھی۔

''ڈیڈی آپ کے زیرِ سایہ میں نے کوئی اچھی زندگی نہیں گزاری...... میرا ماضی اتنا تلخ رہا ہے کہ میں سوچ کر خود دہل جاتی ہوں...... ڈیڈی اس کا ذمہ دار کون ہے......؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''کاش انسان پہلے ہی سمجھ جائے سب کچھ بکھرنے سے پہلے...... مگر ایسا نہیں ہوتا۔'' اس کا باپ پریشانی سے بولا۔

دونوں کافی دیر خاموش رہے اور ایک دوسرے کی آہیں سنتے رہے۔

فاصلہ کم ہو گیا تھا وہ سیٹ کے ساتھ سر ٹکا کر سو رہی تھی اس کے باپ نے مڑ کر اس کی بھیگی ہوئی پلکوں کو بغور دیکھا اور اپنے ہاتھ سے ان کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اس کے اچانک اٹھنے پر اس کے باپ نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ اس نے ان کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

''ڈیڈی رہنے دیجئے...... آج زندگی میں پہلی بار تو ان ہاتھوں کا لمس محسوس کر لینے دیجئے میں انہی ہاتھوں کے لیے تو ترستی رہی ہوں کاش آپ ان آنکھوں کو صاف کرنے کے لیے بہت پہلے ہاتھ بڑھاتے...... مگر......'' وہ باپ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''قندیل...... تم نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں...... اب تم ایسی باتیں کرتی ہو تو میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔'' اس کا باپ کرب سے بولا۔

''ڈیڈی...... یہ ان لوگوں کی صحبت کا اثر ہے جو باتیں کرنا بھی جانتے ہیں اور ان کے مفہوم کو بھی سمجھتے ہیں اور پھر انہیں عملی جامہ بھی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''میں بھی بہت متاثر ہوا ہوں...... زندگی میں پہلی بار کسی ایسے انسان سے ملا ہوں۔''

اس کے باپ کی آنکھوں کے سامنے فریدی صاحب کا چہرہ گھومنے لگا۔

''اسی لیے تو......'' قندیل معنی خیز انداز میں بولی۔

''کیا مطلب......؟''

''کچھ نہیں......'' وہ خاموش ہو گئی۔

''قندیل تم مجھے معاف کر دو...... دل سے...... میں کوشش کروں گا کہ اب تمہیں مزید کوئی دکھ نہ دے سکوں۔'' جواباً وہ خاموش رہی۔

گھر پہنچی تو ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا نہ کوئی نوکر...... ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

''ہمارا گھر اتنا تاریک کیوں......؟'' وہ حیرت سے بولی۔

جب گھر کو زندہ رکھنے والے چلے جائیں تو بستے گھر یوں ہی اجڑتے ہیں...... مجھے یقین نہیں آتا ماجد اور ساجد میری ہی اولاد ہیں...... انہوں نے میرے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ ہر طرح سے کنگال کر دیا ہے...... میری قسمت نے مجھے بہت بری مات دی ہے۔'' اس کا باپ انتہائی افسردگی سے بولا۔

''ڈیڈی...... مائنڈ نہ کیجئے تو صرف یہی کہوں گی کہ نہ تو آپ نے ہماری کوئی تربیت کی...... ہمیں اچھائی اور برائی کا تصور تک تو آپ نے نہیں دیا...... اوپر سے کھلایا بھی وہ رزق جس میں نہ پاکیزگی کی خوشبو تھی نہ محنت کا ثمر...... ایسے درخت کیا پھل دیں گے...... حرام کے نوالوں پر پلنے والی اولادیں اسی طرح دغا دیا کرتی ہیں۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

دونوں خاموش ہو گئے۔

اس کا باپ پہلی دفعہ یوں سر جھکا کر خاموش بیٹھا تھا۔ اس لمحے اسے اس پر ترس سا آنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے باپ نے ایک دم بڑھاپے کا بہت لمبا اور کٹھن سفر ایک ہی قدم میں طے کر لیا ہو۔

''ڈیڈی میں چائے لاؤں......'' وہ بالآخر بولی۔

''آں...... ہاں...... لیکن شاید دودھ نہ ہو......''

''کیا...... ہمارے گھر میں دودھ بھی نہیں......؟'' اس نے آگے بڑھ کر فریج کھولا...... اس میں سوائے پانی کی کھنکتی بوتلوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

''اف خدایا...... یہ سب کیا ہو گیا'' وہ بڑبڑائی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''میں دودھ لے کر آتا ہوں......'' اور وہ بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔

باپ کے جانے کے بعد وہ کھل کر روئی...... انسان کیسے کیسے بے بس ہوتا ہے۔ اس کو دکھ سا ہونے لگا۔ اپنی سگی اولاد بھی یوں ماں باپ کو دغا دے سکتی ہے یہ گھاؤ بہت گہرا تھا۔

فون مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے بے دلی سے فون اٹھایا۔

''ہیلو...... قندیل میں حسن بول رہا ہوں۔ آپی کی طبیعت بہت خراب ہے...... پہنچنے کی کوشش کرو۔'' حسن جلدی جلدی بولا۔

''حسن ہم تو ابھی آئے ہیں......'' اس نے حیرت سے کہا۔

''دیکھ...... لو پھر شاید وقت نہ رہے......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''اچھا، میں دیکھتی ہوں......'' اس نے پریشانی سے فون بند کر دیا۔

''اور وہ فون بند کر کے مسلسل سوچ میں پڑ گئی کہ کیا کرے۔ باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کی گھبراہٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

......❁......

(52)

اس پر مسلسل بے ہوشی طاری تھی کبھی بے چینی سے آنکھیں کھولتی کبھی خشک لبوں پر زبان پھیرتی اور کبھی بے چینی سے کروٹیں بدلتی۔ جب فریدی صاحب اندر داخل ہوئے۔

''بی بی کیسی ہیں آپ......؟'' انہوں نے قدرے ملائمت سے پوچھا۔

''بہت تکلیف میں ہوں...... آپ کی دعا چاہتی ہوں......'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''ہماری دعائیں ہر لمحہ آپ کے ساتھ ہیں اور آپ خود...... طلب کر کے دیکھئے انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائیں گی۔ جب ہمارا رب اپنے بندوں پر خوش ہوتا ہے تو اس فراخ دلی سے عطا کرتا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا...... بات تو صرف سچی طلب کی ہے اور اگر طلب اس کی ہو تو کسی چیز کی تمنا باقی نہیں رہ جاتی۔ جب وہ مل جاتا ہے تو پھر کیا چاہنا اور نہ چاہنا۔'' فریدی صاحب اپنی ہی لے میں بولے۔

''فریدی صاحب...... معلوم نہیں کہ میں اس پوزیشن میں ہوں بھی کہ نہیں......، اس کی رضا مل جائے یہی بہت ہے......'' وہ بمشکل بولی۔

''ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ جو سفر ہم طے کر کے آتے ہیں وہ اس کے حضور قابل قبول بھی ہے کہ نہیں...... ہمارا کشکول جسے ہم بھرا ہوا سمجھتے ہیں ہو سکتا ہے خالی ہو...... سب کچھ وہی جانتا ہے مگر انسان امید تو کر سکتا ہے اور امید تو ویرانوں میں بھی پھول کھلا دیتی ہے اور اگر سچی لگن ساتھ ہو تو بنجر زمین کو بھی گل گلزار بنا دیتی ہے۔'' فریدی صاحب نے سمجھایا۔

''فریدی صاحب بچوں کا خیال رکھئے گا...... خاص طور پر حسن کا۔'' وہ ایک دم بولی۔

''آپ فکر نہ کریں...... میں سمجھ گیا ہوں...... آپ زیادہ مت بولیں...... آنکھیں بند کر کے اس کی ذات کا تصور کریں تاکہ آپ کے آخری لمحے آسان ہو جائیں۔'' فریدی صاحب نے اس کے چہرے کا جائزہ لے کر کہا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں...... اور فریدی صاحب اس کے پاس بیٹھ کر تلاوت کرنے لگے۔

''ہاں...... حسن کو پھول بہت پسند ہیں...... میاں جی...... چادر ہے...... مما مت ڈانٹیں...... حسن پھولوں کا لفافہ کہاں ہے......''

حسن نے اردگرد دیکھا اور اٹھنے لگا۔ فریدی صاحب نے اشارے سے اسے روکا۔

''میں روئی تو نہیں...... پانی...... پانی......''

حسن نے پانی اس کے منہ میں ڈالا۔

''میرے سر میں کچھ ہو رہا ہے...... میرے سارے جسم میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں...... جیسے کانٹے چبھ رہے ہیں...... کچھ ٹوٹ رہا ہے...... کوئی نوچ رہا ہے...... شیشہ ٹوٹ رہا ہے...... گرم ہوا چل رہی ہے...... دھوپ بھی بہت ہے...... میرے کانوں میں کس کی آواز آ رہی ہے...... بہت کم ہے...... کون ہے...... اونچی بولو''

اور اسی لمحے سکوت سا چھا گیا...... اس کے لب بند ہو گئے...... فریدی صاحب نے آگے جھک کر بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا...... زندگی کی رمق بالکل ختم ہو چکی تھی...... انہوں نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

''زندگی کا سفر ختم ہوا اور نیا سفر شروع ہوا......'' وہ حسن کی جانب پلٹے۔

''حسن بیٹا فرض کی ادائیگی کا بندوبست کرو......'' وہ آہستہ سے بولے۔

''جی بہتر......'' حسن نے نم آنکھوں سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد قندیل بھی اپنے باپ کے ساتھ آ گئی...... وہ یوں روئی کہ در و بام ہل گئے...... اسے دکھ تھا کہ وہ زندگی کے آخری لمحات میں اس سے مل نہ سکی...... وہ کتنا اس کے قریب رہی تھی لیکن آخری ملاقات نہ کر سکی...... وہ پوچھے گئے ادھورے سوالوں کا جواب دیئے بغیر ہی چلی گئی تھی۔ کچھ ملنے ملانے والے آئے شام کے بعد اسے دفنا دیا گیا...... گھر میں ہر کوئی ایک کمی سی محسوس کرنے لگا۔ حسن آج پہلی بار زندگی میں اپنے آپ کو تنہا اور بے آسرا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ذات اس کے لیے صحرا میں ابر کی طرح تھی۔ رات کو فریدی صاحب بھی گھر چلے گئے اور وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے سوچوں میں گم صم وقت کے پنچھی کو آزاد کرتے رہے۔

''ضحیٰ بی بی بہت نفیس خاتون تھیں'' اس کے ڈیڈی نے بالآخر سکوت توڑا۔

''ہاں بہت ارفع...... سوچ میں اور عمل میں بہت پاکیزہ...... ورنایاب کی طرح......'' حسن بولا۔

''ڈیڈی جب میں ہاسٹل میں رہتی تھی تو لڑکیاں ان کے بارے میں بہت باتیں کرتیں تھیں...... کوئی Rigid کہتا...... کوئی قدامت پسند...... کوئی بیمار الذہن...... کوئی محبت کی دشمن...... نجانے کیا کیا...... لیکن میں نے جب بھی انہیں دیکھا میں اندر ہی اندر لرز سی جاتی۔ اکثر مجھے پسینہ سا آنے لگتا نجانے کیوں...... میں آہستہ آہستہ ان سے ڈرنے لگی...... اور اکثر کوشش کرتی کہ ان سے ملاقات نہ ہو...... مگر جب کھل کر ملاقات ہوئی تو تب سمجھ میں آیا کہ وہ کیا تھیں...... وہ تو خوشبو تھی جو جہاں بھی جاتی ہے اردگرد کو مہکا دیتی ہے...... وہ تو ہوا کا ایسا خوشگوار جھونکا تھی جو صحرا میں بھی چلے تو وہاں بھی پھول کھلا دے...... شگوفوں پر چلے تو ان کو بھی مہکا دے...... وہ تو چاند کی چاندنی تھی...... شفق کی سرخی تھی...... آفتاب کی پہلی نرم گرم کرن تھی...... وہ آسمان پر بادل کا سفید شفاف سایہ دار ٹکڑا تھی...... ان میں سمندر کی سی گہرائی تھی اور آسمان کی سی وسعت...... وہ تو چھم چھم برستی بارش تھی...... اور سب سے بڑھ کر بہت خوبصورت انسان تھیں بہت مقدس...... بہت محترم...... بہت باعزت...... بہت قابل قدر...... محبت کا پیکر...... چاہتوں کے سفر کی راہی...... میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں بیان کر سکوں...... وہ بہت کچھ تھیں۔'' اور آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

حسن بھی رو رہا تھا...... اور اس کے ڈیڈی بھی افسردہ تھے۔

''میں ان لوگوں سے مل کر حیران ہو رہا ہوں کیسے کیسے خوبصورت دل اور شفاف ذہن رکھنے والے خوش نصیب بھی اس دنیا میں ہیں...... واقعی ایسے لوگ جہاں جاتے ہیں ماحول کو بھی مہکا دیتے ہیں اور شاید یہ میری بدنصیبی رہی ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہمیشہ دو نمبر لوگوں سے ہی ملا ہوں...... جن کے دل و دماغ ان کے وجودوں کی طرح مکروہ اور شکستہ تھے...... ایسی شکستہ عمارتوں نے دوسروں کو بھی گرایا اور خود بھی گرے...... کیسی بدنصیبی ہے میری......'' اس کے ڈیڈی تاسف سے بولے۔

وہ کافی دیر بیٹھے یونہی باتیں کرتے رہے...... وہ تو ایسے انمٹ نقوش چھوڑ گئی تھی جن پر وہ جتنی بھی بحث کرتے کم تھی۔ اس کی ذات تو ختم ہو گئی تھی مگر اس ذات کے آثار تو سب کے ذہنوں میں کندہ ہو چکے تھے۔ جو ہزار بار چاہنے کے باوجود بھی کوئی کھرچ نہ سکتا تھا۔

✿......

(53)

تین دن رہنے کے بعد قندیل واپس جانے لگی تو فریدی صاحب آ گئے۔

''آپ سب لوگ یہاں پر حاضر ہیں..... تو میں ضحیٰ بی بی کا پیغام دینا چاہتا ہوں..... ان کی شدید خواہش تھی کہ حسن میاں اس بی بی کے ہمسفر بن جائیں۔'' فریدی صاحب نے واضح الفاظ میں کہا۔

''کیا مطلب.....؟'' وہ چونکا۔

''میرا خیال ہے یہی بہتر ہے..... قدرت بہتر فیصلے کرتی ہے۔'' فریدی صاحب بولے

''آپی نے مجھ سے بات کی تھی..... لیکن میں نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا۔'' حسن نے کہا۔

''کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے جو انسان سوچتا ہے.....'' فریدی صاحب نے جواب دیا۔

''نہیں..... ایسا تو نہیں.....'' حسن تاسف سے بولا۔

''دیکھو میاں..... انسان کی زندگی کے فیصلے اس کی سوچ سے بالا ہوتے ہیں اور وہی ہوتا ہے جو لکھا جا چکا ہے..... فیصلے اٹل ہوتے ہیں..... اور انسان ان فیصلوں کو قبول کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ چاہے اس کا دل مانے یا نہ مانے۔''

''مگر میں تو پہلے حصار سے ابھی نکلا نہیں..... اور ابھی تو وہ یادیں وہ سوچیں میرے ذہن کو تہس نہس کرتی رہتی ہیں..... میں سوچتا ہوں یہ شادی کر کے میرا ذہن، میری شخصیت تو دو حصوں میں بٹ جائے گی میں پھر کچھ بھی نہ رہوں گا..... نہ میں ان کے ساتھ انصاف کر سکوں گا اور شاید نہ ہی اپنے آپ سے.....'' اس نے توضیح پیش کی۔

''جو ہو چکا..... اور جس کا اب وجود ہی نہیں..... اس کے بارے میں سوچنے سے فائدہ..... ان سوچوں کو یادوں کو اپنے ذہن سے نکال دو..... ہر دن سورج نئی آب و

تاب کے ساتھ طلوع ہوتا ہے..... یہ سوچے بغیر کہ کل اس نے کتنی حرارت کہاں پہنچائی تھی..... کہاں پہنچ کر اس کی حرارت میں کمی آئی..... کل کہاں اس نے زیادتی کی تھی..... یا کہیں اس کے عمل میں آ گئی تھی..... جو ماضی تھا، وہ حال نہیں ہو سکتا اور جو حال ہے وہ مستقبل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ان کی پرچھائیاں مستقبل پر تو ضرور پڑتی ہیں مگر انسان چاہے تو زیادہ بات نہیں..... کیونکہ مستقبل کا وجود تو حال اور ماضی سے پنپتا ہے..... جو تمہارا کل تھا اس کو یاد ضرور کرو مگر اسے اپنے اوپر سوار مت کرو..... اپنے ساتھ تجربے کے روشن پہلوؤں کی پرچھائیاں مستقبل پر ڈالو.....'' فریدی صاحب نے اسے سمجھایا۔

''آپ نے ان لوگوں سے بھی پوچھا ہے.....'' حسن نے قندیل اور اس کے باپ کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نے زندگی میں اپنی اولاد کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اب میں کوئی ایسا فیصلہ اس پر مسلط نہیں کرنا چاہتا جس کی وجہ سے یہ پھر گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائے کیونکہ اب میں مجبور اور بے بس ہوں..... میرے لیے صرف یہی آسرا ہے اور میں اس کو کہیں کھونا نہیں چاہتا..... جو اس کی مرضی اور فیصلہ ہو گا وہ مجھے قبول ہو گا۔'' قندیل کے باپ نے کہا۔

''ہاں..... بی بی..... آپ کی رضا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض ہو تو کہہ دیجیے۔'' فریدی صاحب نے قندیل سے براہِ راست پوچھا۔

''میں ابھی ہاں یا نہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں..... جب تک میں حسن سے کھل کر بات نہ کر لوں.....'' قندیل نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''ٹھیک ہے آپ دونوں بات کر لیجیے..... آپ جو بھی فیصلہ کریں ہمیں قبول ہو گا۔ آئیے انور صاحب..... ہم باہر بیٹھتے ہیں..... بچے باشعور ہیں..... سمجھ دار ہیں اور زندگی کی تلخیوں اور حقائق سے اچھی طرح واقف ہیں..... ہمیں ان پر اعتماد کرنا ہو گا.....'' فریدی صاحب اس کے ڈیڈی کو لے کر باہر چلے گئے۔

''قندیل کہیں آپ یہ تو نہیں سوچ رہی کہ ہم ایک دوسرے پر زبردستی مسلط کیے جا رہے ہیں..... آپ کی جو بھی رائے ہو مجھے بتا دیجیے'' حسن نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"معلوم نہیں...... مگر مجھے بہت خوف ہے......"

"کس بات کا......؟"

"میں کوئی ٹین ایجر نہیں ہوں کہ خوابوں کی دنیا، تخیلاتی و تصوراتی باتیں اور فنٹیسی مجھے خوش رکھنے کے لیے کافی ہو...... میرے اندر کچھ ایسی تلخیاں ہیں جنہوں نے میرے تمام جذبوں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ میری سوچوں کو محدود کر دیا ہے...... میرا وجود یخ ہو چکا ہے لیکن کبھی کبھی اندر دبی چنگاریوں سے میرا وجود سلگنے لگتا ہے...... مجھے تحفظ کی شدید خواہش چین نہیں لینے دیتی...... مجھے تحفظ چاہئے...... ایسا تحفظ جس میں کسی قسم کا ڈر خوف اور شبہ نہ ہو اور ہر عورت کی طرح میرے اندر کہیں کہیں یہ خواہش بھی موجود ہے...... چاہنے کی اور چاہے جانے کی...... محبت کی...... اور احترام کی...... اگرچہ میں یہ کہتی ہوں کہ میرے اندر تمام آرزوئیں اور تمنائیں ختم ہو چکی ہیں تو یہ بھی درست نہیں گو کہ ہر جذبہ سرد پڑ چکا ہے...... لیکن میں ان کی **Revival** چاہتی ہوں...... اور اپنی **Survival** کے لیے تمام سچے جذبوں...... آرزوؤں اور تمناؤں کی بقا۔ میرا ماضی کوئی اچھا نہیں رہا...... لیکن میں چاہتی ہوں کہ اس شخص کو سارا کچھ بتا دوں...... اس سے کچھ نہ چھپانا چاہتی...... میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ جو مجھے اپنانے جا رہا ہے اس میں کتنی وسیع القلبی ہے کہ تمام خامیوں سمیت وہ مجھے قبول کرنے کا حوصلہ پاتا ہے یا نہیں...... میں اپنے گھر میں ایک ناکارہ وجود کی طرح پلی ہوں...... مجھے اپنے شوہر کے گھر اہمیت چاہئے...... اپنی ذات کی شناخت اور ایک مقام چاہئے...... عزت اور نام چاہئے...... میں زندگی میں بہت دفعہ دھتکاری جا چکی ہوں...... لیکن اب آئندہ نہیں...... کسی قیمت پر بھی نہیں۔ اس لیے میں تمام حقائق آپ پر واضح کر دیتی ہوں...... فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے...... اگر آپ میں واقعی اتنی **Moral Courage** ہے کہ حقائق کو سمجھنے کے بعد انہیں قبول بھی کریں اور کھلے دل سے قبول کریں تو پھر ٹھیک ہے......اور اس نے ساری باتیں اسے بتا دیں۔"

"حسن سر جھکائے سب کچھ سنتا رہا۔

"آپ اچھی طرح سوچ لیں...... اگر آپ کو نامنظور ہے تو بھی کوئی مسئلہ نہیں...... زندگی میں ایسا تو ہوتا ہے...... مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہ ہوگا...... میں آپ کو وقت دیتی ہوں...... فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے" اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

فریدی صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ حسن خاموش بیٹھا تھا۔

"حسن میاں...... قدرت ان کا ساتھ دیتی ہے جو زندگی کی آنکھ میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں میرا خیال ہے آپ بہتر فیصلہ کریں گے۔" فریدی صاحب نے کہا اور باہر نکل آئے۔

قندیل اپنے باپ کے ہمراہ پہلے ہی جا چکی تھی۔

......❁......

(54)

گھر میں اب تنہائی کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور زیادہ تر وہ گھر میں ہی رہتا۔ اکثر کتابیں پڑھتا رہتا۔ تھک جاتا تو سو جاتا یا پھر واک کے لیے باہر نکل جاتا۔ زندگی کے کچھ دن تو اسی روٹین کی نذر ہو گئے۔ اس یکسانیت نے اسے تنگ کرنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ خود بھی گھبرا سا گیا...... اگر قندیل کے بارے میں سیریس ہو کر سوچتا تو ندا بھی نظروں کے سامنے گھوم جاتی اور یوں لگتا جیسے ایک خیال کے اوپر دوسرے کو مسلط کر کے دونوں کی ہیئت ہی کھو رہا ہو...... وہ تنگ پڑ جاتا...... اور ایک شام فریدی صاحب کے پاس چلا گیا۔

"انکل میں یکسانیت سے تنگ آ گیا ہوں......" وہ زچ ہو کر بولا۔

"میاں تو پھر کچھ ایسا کیجیے کہ بوریت نہ ہو......" فریدی صاحب مسکرا کر بولے۔

"لیکن کیا......؟"

"یہ تو آپ پر ہے کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں......"

"کچھ ایسا جس میں ذات کا اظہار بھی ہو اور مجھے سکون بھی ملے۔" حسن بولا۔

"تو اس کے لیے مشاہدہ بہت ضروری ہے......" فریدی صاحب نے پرسکون لہجے میں جوب دیا۔

"کیسا مشاہدہ......؟"

"خود کو جانچنے کا...... لوگوں کو سمجھنے کا...... کائنات کے بکھرے رنگوں کو سمیٹنے کا...... شعور کا...... اور...... شعور کے اندر چھپی بہت سی صلاحیتوں کا" حسن خلا میں گھورتا ہوا بولا۔

"میرا بھی دل چاہتا ہے...... دنیا کو دیکھوں...... کھلی آنکھوں سے...... اس کو پڑھوں...... اس کے ایک ایک حرف کا مطالعہ کروں......" حسن نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"ضرور...... جب کائنات کو پڑھ لو گے تو سارے اسرار سمجھ میں آ جائیں گے...... لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا جب بھی کائنات کا کوئی رنگ تمہیں متاثر کرے تو اس کی ایک کڑی اپنے اندر ضرور ملانا اور دوسری اس ذات کے ساتھ پھر تمام تصورات...... اور نظریات واضح ہوتے جائیں گے...... سنو یہ کائنات، خدا اور انسان تینوں مل کر مثلث بناتے ہیں۔ تینوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ تینوں ایک دوسرے کی شناخت ہیں۔ جو رنگ جو رمز جو پنہاں راز کائنات میں مضمر ہیں وہ انسان کے اندر بھی ہیں اور پھر وہی راز خدا کی ذات کا مظہر بھی ہیں...... تینوں میں بہت یکسوئی اور ہم آہنگی ہے...... بس ہر بات کو سمجھنے کے لیے شعور اور فہم چاہیے...... ہاں تم نے کیا فیصلہ کیا......؟" انہوں نے اچانک قندیل کے بارے میں پوچھا۔

"......ابھی کچھ نہیں...... اس کے لیے کچھ وقت چاہیے......؟" حسن نے جواب دیا۔

"دیکھنا اتنا وقت نہ گزار دینا کہ بعد میں وقت سے ہی شکوے کرتے پھرو۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"جی بہت بہتر...... لیکن میں پہلے ذہنی ہم آہنگی چاہتا ہوں...... اپنے ذہن کو کسی نقطے پر لا کر مطمئن ہونا چاہتا ہوں......" حسن نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے...... تمہاری سوچ بہت بہتر ہے...... تم جو بھی کرو گے یقیناً بہتر اور سوچ سمجھ کر کرو گے۔" فریدی صاحب بولے۔

"شکریہ...... میں اب چلتا ہوں......" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

انہوں نے اسے دعائیں دے کر رخصت کیا۔

اگلے روز وہ ضروری سامان لے کر نکل کھڑا ہوا...... جہاں بھی کوئی انوکھا درخت نظر آتا...... جس کی جڑیں، شاخیں اوپر نیچے مختلف زاویے بناتی نظر آتیں وہ نہ صرف ان کی تصویریں بناتا بلکہ ان کو اپنے مووی کیمرے میں بھی محفوظ کرتا...... اور پھر وہیں بیٹھ کر اس کی لوکیشن اور اس کی ہیئت پر تبصرہ بھی ڈائری میں نوٹ کر لیتا۔ عجیب قسم کی لذت اسے اس کام میں آ رہی تھی...... جہاں پر مختلف لوگ...... ان کے رسم و رواج ان کی باتیں ان کی حرکتیں نظر آتیں ان کو بھی کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیتا۔ سفر کرتا کرتا وہ آہستہ آہستہ دور نکل گیا تھا...... میدان سے سرسبز و شاداب وادیوں میں...... وہاں سے جھیلوں کی طرف...... کبھی کھنڈرات کا سفر کرتا ہوا سنگلاخ چٹانوں کی ابھرتی باہر نکلتی رنگ برنگی چٹانوں

کو...... کبھی ان کے اندر کھوکھلے غاروں...... حشرات اور...... وہاں کے جانوروں پر ہر چیز کو مشاہدہ کر کے وہ ان کی نہ صرف تصویریں بناتا رہا بلکہ ان کے اوپر پوری طرح تاثرات بھی قلمبند کرتا رہا۔

پورا مہینہ گزر گیا تھا اسے کائنات کا مشاہدہ کرتے ہوئے اور مختلف کڑیوں کو ملاتے ہوئے...... اس عرصے میں اس کا ذہن کتنا وسیع ہوا تھا...... اس کی سوچ کتنی بدلی تھی...... وہ خود حیران ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا ذہن کے بند کمرے کے روشن دان اچانک کھل گئے ہوں جن سے تازہ ہوا کے جھونکے اندر باہر آ رہے ہوں اور اس کے ذہن کو معطر کر رہے ہوں وہ کتنا مسرور ہو رہا تھا...... اس کا اندازہ صرف اسے ہی تھا...... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اندر کی تلخیوں پر آہستہ آہستہ قابو پاتا جا رہا تھا...... دل میں ایک لگن سی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ نئے نئے خیالات تصورات، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کا شوق...... اردگرد پھیلی وسیع کائنات کے رنگوں نے اس کے اندر کو بھی آہستہ آہستہ سرسبز کرنا شروع کر دیا تھا۔

جب وہ گھر لوٹا تو نہ صرف خوبصورت یادوں کا انبار اس کے ساتھ تھا بلکہ کینوس اور تصویروں سے لدے تھیلے بھی اس کے ہمراہ تھے۔ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے وہ دو تین دن سوتا رہا۔

نجانے کب سے بیل ہو رہی تھی اس کو کوئی ہوش نہ تھی۔ بالآخر اٹھ کر دروازہ کھولنے گیا تو اس کا یونیورسٹی کا ایک پرانا دوست عمیر اس کے سامنے تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

''عمیر...... تم یہاں کیسے......؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''ارے بھئی اندر تو آنے دو کہ ساری باتیں یہیں پوچھ لو گے......'' عمیر شوخ لہجے میں بولا۔

''ہاں...... ہاں...... آؤ......''

''بہت مشکل سے تمہارے گھر کا ایڈریس ملا ہے......'' عمیر اردگرد دیکھ کر بولا۔

''وہی تو میں حیران ہو رہا ہوں کہ میری یاد کیسے آئی......؟''

''یار یہاں میری پوسٹنگ ہوئی ہے......''

''پوسٹنگ کہاں......؟'' حسن نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں تو پتا ہی ہے میں نے ایک قومی اخبار جوائن کیا ہے اور یہاں خاص طور پر ایک اہم کام کے سلسلے میں بھیجا گیا ہوں...... جب یہاں آیا تو تمہارا ایڈریس نہیں تھا...... پھر ندا سے تمہارا ایڈریس لیا......''

''ندا سے...... اتنے عرصے کے بعد ندا کا نام سن کر وہ چونکا...... ہاں...... لیکن تم حیران کیوں ہو رہے ہو کیا ندا سے تعلقات ختم ہو چکے ہیں......؟'' عمیر نے لاپروائی سے پوچھا۔

''ہاں...... یونہی سمجھو...... لیکن تمہیں ندا ملی کہاں......؟''

''مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے شاید ندا کی شادی ہو گئی ہے۔ میں مارکیٹ جا رہا تھا تو اس کو کسی کے ساتھ گاڑی میں دیکھا۔ پھر میں نے اسے فون کیا اور پوچھا بھی مگر اس نے ٹال دیا...... ویسے اگر تم کہتے ہو تو پوچھ لوں گا اگلی دفعہ......''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''تم بتاؤ آج کل کیا کر رہے ہو؟'' عمیر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... آؤٹنگ کے لیے باہر گیا تھا...... ابھی دو دن ہوئے ہیں لوٹا ہوں...... تم یہاں کہاں ٹھہرے ہو......؟'' حسن نے سوال کیا۔

''میری رشتے کی ایک خالہ ہیں ان کے پاس......''

''دیکھو عمیر میرا گھر بالکل خالی ہے...... تم جاؤ اور فوراً سامان لے کر آؤ...... میں مزید کچھ سننے کے لیے تیار نہیں......'' اس نے فراخدلی سے آفر کی۔

''اچھا بابا...... لے آؤں گا پہلے چائے کا ایک کپ تو پلا دو''

''ہاں تم بیٹھو میں چائے لے کر آتا ہوں......'' حسن کچن کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''ارے یار خود چائے بناؤ گے......''

''ہاں تو اور کیا...... اس لیے تو کہتا ہوں ادھر ہی آ جاؤ تو مل کر بنایا کریں گے......'' وہ کھکھلا کر ہنسا۔

''ویسے ایک بات ہے حسن...... تم پہلے سے کچھ بہتر لگ رہے ہو؟'' عمیر نے

اس میں واضح تبدیلی دیکھ کر کہا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکا۔

''صحت بھی بہتر ہوئی ہے اور مزاج بھی......''

''یہ تو آپ کا حسن نظر ہے ورنہ بندہ کس قابل......'' حسن نے بھی قہقہہ لگایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے کر آ گیا...... اور دونوں چائے پینے لگے اور باتیں بھی کرنے لگے......

اگلے دن عمیر اپنا سامان لے کر اس کے ہاں آ گیا رفتہ رفتہ دونوں میں خوب بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔

''حسن...... یہ تم اتنا سامان اکٹھا کر کے لائے ہو اس کا کچھ کرو بھی......'' عمیر نے رائے دی۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکا۔

''بھئی ان کی ایڈیٹنگ کرو...... اس کی ڈاکومنٹری بناؤ پھر اس کو ٹی وی پر دیتے ہیں اور جو تصویریں اور انفارمیشن ہے اس کو ارینج کرو اس کو اخبار میں سفر نامے کی شکل میں دے دیتے ہیں......'' عمیر نے تجویز دی۔

''رئیلی...... گڈ آئیڈیا......'' وہ خوشی سے بولا۔

اس کو یوں لگا جیسے ایک Cause مل گیا ہو ایک ٹارگٹ اور وہ پوری محنت سے ہر وقت اس میں اتنا مصروف رہتا...... کہ عمیر ہی جھنجھلا جاتا۔

''یار تمہیں تو آئیڈیا دے کر میں خود ہی پھنس گیا ہوں۔ تم سے تو بات کرنے کو ہی ترس گیا ہوں...... سوچتا ہوں خالہ ہی بہتر تھی...... کمپنی تو تھی نا......''

''کس کی کمپنی...... خالہ کی...... یا کسی اور کی......؟'' حسن نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''عقلمند ہو خود ہی سمجھ لو......''

''پھر تو زیادتی ہوئی تمہارے ساتھ...... لیکن فکر نہ کرو صرف چند دنوں کی بات ہے۔'' حسن مسکرا کر بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے میں کچھ دنوں کے لیے گھر جا رہا ہوں اتنے دنوں میں تم کام مکمل کرو...... واپسی پر پھر بات کریں گے۔'' عمیر نے بتایا۔

''کب جا رہے ہو......؟''

''ابھی نکلنے والا ہوں......''

''اور آ ؤ گے کب......؟''

''ایک ہفتہ لگ جائے گا...... ایک عزیز کی شادی بھی ہے...... اب میں ذرا تیار ہو لوں۔'' عمیر واش روم کی طرف جاتا ہوا بولا۔

اور وہ اپنے کام میں لگ گیا......

تھوڑی دیر کے بعد وہ آیا تو وہ اسی طرح اپنے کام میں مگن تھا۔

''اچھا حسن اب میں چلتا ہوں...... ندا کے لیے کوئی پیغام ہو تو دے دو......'' عمیر نے لاپروائی سے کہا۔

اس نے بغور عمیر کی طرف دیکھا اور آہ بھری......

''کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں......''

عمیر چلا گیا اور وہ پھر اپنے کام میں لگ گیا، مگر اب ہر کام الٹا ہو رہا تھا...... ہر کام بگڑ رہا تھا...... ذہن آہستہ آہستہ بکھر رہا تھا...... سوچیں منتشر ہو رہی تھیں...... خیالات بگڑ رہے تھے...... اس کو غصہ آنے لگا۔ اس نے سب کچھ ایک طرف پھینک دیا اور خود گھر سے باہر نکل گیا۔ ویران سڑک پر۔

......✿......

(55)

عمیر کی واپسی تک اس نے مکمل ڈاکومنٹری بنالی تھی جس میں اس نے مختلف قسم کے پتھروں، چٹانوں اور ان کے اندر اگنے والی جڑی بوٹیوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں تھیں...... اس کی پکچرائزیشن اور کلوزاپ ایسے زبردست تھے کہ وہ خود حیران رہ گیا......اس نے عمیر کو آتے ہی وہ دکھائی تو وہ بھی بے حد خوش ہوا......

''حسن تم نے یقیناً بہت زبردست کام کیا ہے اور حسن جو بھی کام انسان جان توڑ محنت سے کرتا ہے وہ ضرور شاہکار ثابت ہوتا ہے۔'' عمیر خوشی سے بولا۔

''ہاں...... یار...... بس یہ تمہاری Inspiration ہی تھی۔''

''واقعی...... بعض اوقات تھوڑی سی حوصلہ افزائی بھی انسان کو کتنا پرامید بنا دیتی ہے اور وہ کتنے بڑے بڑے کام سرانجام دیتا ہے۔'' عمیر نے جواب دیا۔

''کل ہی انشاء اللہ میں اپنے دوست کو فون کروں گا...... وہ ٹی وی میں کام کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے اور سنو تمہارا سفر نامہ کہاں تک پہنچا......''

''اس پر ابھی میں نے کام شروع نہیں کیا...... ڈاکومنٹری پر ہی کام کرتا رہا ہوں۔ اب اس کے بعد اس کو شروع کروں گا......تم سناؤ شادی کیسی گزری؟''

''بہت اچھی...... خوب انجوائے کیا...... اور...... ہاں...... یاد آیا...... تمہارے لیے ندا نے خط بھیجا ہے......''

''میرے لیے......'' وہ حیرت سے چونکا۔

''ہاں بھئی حیران کیوں ہو رہے ہو......؟ زندہ انسانوں سے ہر قسم کی توقع رکھنی چاہئے...... یہ لو......'' اس نے ایک لفافہ اسے دیا۔

اس نے خط کھولا...... اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

''عمیر کی زبانی مجھے تمہارے حالات کا علم ہوا...... لیکن میں خود اتنی بے بس تھی کہ تم سے کسی قسم کا رابطہ نہ کر سکی...... ابو اچانک بیمار پڑ گئے ان کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ بستر مرگ پر ہی انہوں نے میری شادی میرے کزن سے کردی...... اس کے بعد کیا ہوسکتا تھا...... زندگی ہمیں گزار رہی ہے...... اب میں پیرس جا رہی ہوں...... تم وہ شخص ہو جس کو میں کبھی نہیں بھلا سکتی اور تم بھی شادی کر لینا...... زندگی کو خوشی خوشی گزارو اور زندگی میں ایسا ساتھی ڈھونڈنا جو تمہیں خوش رکھ سکے اور جسے تم وہ سارا کچھ دے سکو جو کبھی تم مجھے دینا چاہتے تھے...... حسن...... دیکھنا منافقت نہ کرنا۔ تمہارے لیے ہمیشہ کی طرح دعا گو۔

ندا''

خط پڑھنے کے بعد وہ پریشان سا ہو گیا۔

''یار یہ کیا بات ہوئی...... تم ندا کا خط پڑھ کر پریشان کیوں ہو گئے ہو...... ایسی بھی کیا بات ہے...... اب اس کی شادی ہو گئی ہے...... تم بھی گھر بساؤ کہ اب لکیر ہی پیٹتے رہ جاؤ گے۔ سچی بات ہے مجھے تم جیسے نامراد قسم کے عاشق لوگ سخت ناپسند ہیں۔ مردوں کی طرح ایک کے بعد ایک اور عشق کرو۔ شادی ہو گئی تو ٹھیک ورنہ اور سہی اور نہ تو اور سہی...... کمی تھوڑی ہے......'' عمیر نے یوں منہ بنا کر کہا کہ اس کی بھی ہنسی نکل گئی۔

''لائف انجوائے کرو...... کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے اور ایک بات ذہن میں رکھو...... جہاں عشق کرو وہاں شادی نہ کرو کیونکہ عشق کا فیوز دو دن میں اڑ جائے گا اور شادی تلخ ہو جائے گی بلکہ وہاں شادی کرو جہاں کوئی چکر نہ ہو دونوں کا بھرم رہ جاتا ہے۔'' عمیر نے پھر قہقہہ لگایا۔

''عمیر تم نہیں سدھرو گے...... یونیورسٹی میں بھی ایسے ہی تھے۔ ہر وقت قہقہے ہی لگاتے رہتے تھے...... اور اب بھی ذرا میچور نہیں ہوئے......'' حسن نے مسکرا کر کہا۔

''بری صورت بنانے کو تم میچور ہونا کہتے ہو تو بھائی میاں میں باز آیا ایسی میچورٹی سے۔ ویسے اگر تم آزمانا چاہتے ہو تو تم سے زیادہ میچور اپنے آپ کو ثابت کروں گا...... اب چائے لے آؤ کہ ویسے ہی دماغ خالی کر چھوڑو گے......''

''ایک تو تم اور تمہاری چائے...... دونوں ہی میرے لیے وبال جان بنتے جا رہے ہیں......'' حسن اکتائے لہجے میں بولا۔

"تو چائے والی لے آؤ......" عمیر جلدی سے بولا۔

"بکو نہیں......" اور تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے کر آیا۔

"حسن آج شام سینما نہ چلیں۔" عمیر نے رائے مانگی۔

"کیا مطلب......؟" وہ چونکا۔

"ارے بھئی سینما کا تمہیں کہا ہے کہیں جہنم تو نہیں لے کر جا رہا کہ یوں چونکے ہو۔"

"تو کیا سینما جنت میں ہے......؟" حسن نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل...... پریوں کے دیس کو تو سینما کہتے ہیں......" عمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شرم کرو...... بالکل ہی ڈھیٹ ہو......"

"جو مرضی سمجھو......ٹھیک ہے اگر تم سینما نہیں چلتے تو پھر قبرستان چلتے ہیں......"

"عمیر تم کیا بکواس کرتے رہتے ہو......؟"

"میں تنگ آ گیا ہوں تمہاری یہ رونی شکل دیکھ دیکھ کر...... یونیورسٹی میں بھی ایسے ہی تھے اور اب بھی...... جب تک تم ہنسو گے نہیں دانتوں کی اور مسوڑھوں کی ورزش نہیں کرو گے چہرے کا جغرافیہ نہیں بدلے گا۔" عمیر نے مصنوعی خفگی سے منہ بنا کر کہا۔

"یار...... یہ میری فطرت نہیں...... کہ بات بے بات قہقہے لگاؤں" حسن سنجیدگی سے بولا۔

"کیا تمہاری فطرت نہیں...... میں کب کہتا ہوں کہ ہر وقت بھانڈ بنے رہو لیکن مسکرا کر بات کرنے میں تمہیں کیا تکلیف ہوتی ہے...... ہر وقت اتنے سنجیدہ رہتے ہو کہ میں تم سے بات کرنے سے پہلے سوچتا ہوں کہ شاید تمہارا موڈ ٹھیک ہے کہ نہیں...... اگر تم اپنے آپ کو نہیں بدلو گے تو پھر میں یہاں سے خالہ کے گھر چلا جاؤں گا...... خالہ اور خالہ زادیاں تو آنکھیں بچھائے میرا انتظار کرتی رہتی ہیں......"

"وہ تو مجھے پہلے ہی پتا ہے...... خالہ کی یاد تمہیں کتنا تڑپاتی ہے" حسن نے ہنس کر کہا۔

"ہاں تو بس ٹھیک ہے ناں...... کسی دن تم نے زیادہ تنگ کیا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"ارے بابا ناراض نہ ہوا کرو...... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو میں اب جا رہا ہوں......"

"کہاں......؟"

"قبرستان نہیں سینما ہاؤس...... آج رومانٹک فلم دیکھنے کو دل مچل رہا ہے۔ رات کو لیٹ آؤں گا...... خالہ کے گھر سے ہو کر۔" عمیر مسکرا کر بولا۔

اور ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد حسن سوچ میں پڑ گیا...... عمیر کتنا خوش رہتا ہے وہ بھی تو دنیا میں تنہا ہے نا...... نہ ماں، نہ باپ...... نجانے کون سی خالہ رشتے میں ایجاد کر لی ہے...... لیکن پھر بھی زندگی کو کتنا انجوائے کرتا ہے...... عمیر اس کو واقعی قابل تعریف لگا...... اور وہ اس کی باتوں پر خود ہی مسکرانے لگا۔

......✿......

(56)

کچھ دنوں بعد عمیر کی کوششوں سے اس کی ڈاکومنٹری ٹی وی کے لیے منظور ہو گئی۔ وہ ان لمحوں کا شدت سے انتظار کرنے لگا جب اس کی محنت ٹی وی کی سکرین پر نمودار ہو گی اور اس دن وہ بہت مسرور تھا جب اس کی ڈاکومنٹری ٹی وی پر آ رہی تھی۔ وہ سر شام ہی عمیر کے ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا جیسے ہی اناؤنسمنٹ ہوئی اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا...... اسی خوشی میں نادانستہ وہ فون کی طرف بڑھا اور نمبر ملانے لگا۔ عمیر حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

''ہیلو...... قندیل...... میں حسن بول رہا ہوں...... ہاں...... ہاں حسن بول رہا ہوں...... ٹی وی آن کرو جلدی سے...... بعد میں بات کروں گا...... تم پہلے ٹی وی دیکھو...... خدا حافظ......'' وہ واپس مڑا تو عمیر اس کے چہرے پر پھیلی کرنوں کو بغور دیکھنے لگا......

''یار...... یہ کس کا ذکر زبان پہ آیا کہ چہرہ گل گلنار ہو گیا......'' عمیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بکومت......'' وہ خفیف سا ہو کر بولا۔

''پھر بھی کون تھی وہ...... جس کو خاص طور پر بتانے کے لیے دوڑے ہو؟''

''کیا مطلب......؟'' جیسے وہ ہوش میں آیا ہو۔

''اپنی خوشیوں اور دکھوں میں سب سے پہلے وہ لوگ یاد آتے ہیں جو دل کے زیادہ قریب ہوتے ہیں جو انسان کے لاشعور میں، سیپ میں بند موتیوں کی طرح محفوظ ہوتے ہیں...... یقیناً وہ کوئی ایسی ہو گی...... خیر اگر تم نہ بتانا چاہو تو وہ الگ بات ہے...... مگر مجھے سب سمجھ آ گیا ہے۔'' عمیر نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

وہ ساری بات توجہ سے سنتا رہا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''قندیل کو فون کیا ہے...... آپی کی سٹوڈنٹ تھی...... یہاں رہتی تھی...... بہت سارے دن ہم نے میرا مطلب ہے میں نے آپی نے اور قندیل نے ایک ساتھ اس گھر میں گزارے ہیں۔'' حسن نے اسے بتایا۔

عمیر خاموشی سے ٹی وی دیکھنے لگا...... تھوڑی دیر کے بعد اس کی ڈاکومنٹری شروع ہو چکی تھی۔ دونوں بہت خوش ہو رہے تھے...... خوشی سے حسن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے...... پینتالیس منٹ کی اس ڈاکومنٹری میں اس کو وہ منظر بڑا اچھا لگا جب ایک ہموار چٹان اچانک ایک جانب کو مڑ گئی تھی اور اس کا کونہ یوں باہر نکلا ہوا تھا جیسے کسی سانچے سے زائد حصہ باہر نکل جاتا ہے اور اس کے اندر ایک پرندے نے اپنا گھونسلہ بنایا ہوا تھا...... ڈاکومنٹری اس کی اپنی ہی آواز میں تھی...... اور اس گھونسلے پر اس کے ریمارکس بھی بہت خوبصورت تھے کہ ''انسان کی طرح حیوان اور چرند پرند بھی اس جگہ کو آشیانہ بنا لیتے ہیں جہاں دو قدم رکھنے کی جگہ ملتی ہے اور پھر سارے احساسات و جذبات اس جگہ کے ساتھ مخصوص کر کے اس کو عام سے خاص بنا لیا جاتا ہے...... اور معمولی سی جگہ بھی **Home Sweet Home** بن جاتی ہے۔''

ڈاکومنٹری ختم ہوئی تو عمیر نے خوشی سے اسے گلے لگا لیا۔

''مبارک ہو یار...... آج تمہاری محنت کامیاب ہوئی۔'' عمیر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

''ہاں شکر ہے......'' اور اسی لمحے فون کی بیل ہوئی۔

''ہیلو...... ہاں قندیل کیسی لگی تمہیں'' وہ فرطِ جذبات سے بولا۔

''حسن یہ تم ہی ہو......'' وہ حیرت سے بولی۔

''ہاں...... کیوں یقین نہیں آ رہا......'' حسن مسکرا کر بولا۔

''اٹس رئیلی ونڈر فل لیکن یہ سب کب اور کیسے ہوا......؟ مجھے تو واقعی یقین نہیں آ رہا......'' اس کی آواز میں بے پناہ خوشی و جذبہ تھا۔

''بس یہ عمیر کی کارستانی ہے۔''

''کون عمیر......؟''

''میرا دوست ہے...... لو عمیر سے بات کرو۔'' اور اس نے عمیر کو فون پکڑا دیا وہ

حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا اور پھر مجبوراً اس سے بات کرنا پڑی۔ کافی دیر وہ باتیں کرتے رہے...... وہ بار بار حسن کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا رہا اور مسکراتا رہا۔

''یار...... قندیل اچھی لگی ہے'' عمیر اس کی جانب مڑ کر بولا۔

''تم سے رائے تو نہیں مانگی......'' حسن منہ بنا کر بولا۔

''مگر میں رائے دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں''

''اچھا کیا باتیں کرتے رہے ہو اس سے......''

''بس یونہی...... کچھ خاص قسم کی...... اس کو یقین دلا رہا تھا کہ مان جاؤ حسن میں واقعی کچھ ہے...... مگر......''

''مگر کیا......؟'' حسن نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... اس نے یہ بات سنی ہی نہیں...... ادھر ادھر کی ہانکتی رہی۔ خیر چھوڑو اس بات کو...... اب بتاؤ کب ٹریٹ دے رہے ہو اور قندیل کو انوائیٹ کرو گے یا نہیں۔'' عمیر نے جلدی سے پوچھا۔

''تم اپنی خیر مناؤ اور چلو اب باہر چلتے ہیں......''

''کیا اس وقت......؟'' عمیر نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں...... بس میرا دل چاہ رہا ہے کھلی فضا میں سانس لینے کو...... آسمان کی تاروں بھری چھت کے نیچے کھڑے ہو کر خدا کا شکر ادا کرنے کو دل چاہ رہا ہے......''

''ویسے میرا دل تو نہیں چاہ رہا لیکن تمہاری خاطر چلتا ہوں...... چلو'' اور دونوں گھر سے باہر سڑک پر کافی دیر گھومتے رہے اور کافی دیر فطرت...... انسان اور خدا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ آج عمیر پہلے سے بالکل مختلف لگ رہا تھا ایسی سنجیدہ اور سلجھی ہوئی گفتگو کر رہا تھا کہ بالکل نہیں لگتا تھا یہ وہی عمیر ہے جو ہمیشہ غیر سنجیدہ گفتگو کرنے کا عادی تھا۔

''عمیر آج میں اتنا خوش ہوں کہ شاید زندگی میں کبھی بھی نہیں ہوا ہوں گا۔''

''حسن...... صرف ہم ہی خوشی اور آئیڈیل کی تلاش میں نہیں ہوتے بلکہ خوشی بھی ہماری تلاش میں ہوتی ہے اور بار بار ہمارے پیچھے بھاگتی آتی ہے بشرطیکہ ہم اپنی آنکھیں کھلی اور دل و دماغ بھی اس کے تعاقب میں رکھیں تمہاری طرح ٹیگور کو میں بھی پسند کرتا ہوں وہ کہتا ہے نا۔

''انسان خدا کی تلاش میں ہے اور خدا بھی انسان کی تلاش میں ہے۔ وہ زندگی کے طوفانوں میں خاموش قدموں کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ بات تو شناسائی کی ہے انسان خدا میں ہے اور خدا انسان میں ہے۔ اٹل حقیقت کی طرح......'' عمیر کہہ کر خاموشی سے چلتا رہا اور دونوں خاموش پانیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ بہتے چلے جا رہے تھے دونوں کے اندر طوفان تھا...... اک تلاطم تھا...... عمیق گہرائی میں سوچ تھی...... محرکات تھے...... اور پھر بھی دونوں خاموش تھے...... سب کچھ اندر چھپائے ہوئے...... اپنی ہی سوچوں میں مگن چلے جا رہے تھے...... جب رات رفتہ رفتہ گہری ہونے لگی...... اندر کی سوچیں بھی تاریکی کی طرح ان پر حاوی ہونے لگیں...... خیالات یوں جمع ہونے لگے جیسے...... شہد کی مکھیاں اپنے چھتے کے ساتھ چمٹتی ہیں۔ ظاہراً پرسکون مگر اندر ہی اندر کیسا بڑا کام سرانجام دیتی ہیں۔ تخلیق کا عمل جاری رکھتی ہیں......

......۞......

(57)

اس کی ڈاکومنٹری کو بہت زیادہ پذیرائی مل رہی تھی اور بہت سے خطوط اس کو بھی موصول ہو رہے تھے..... قندیل کا کارڈ اور بوکے بھی اس کو ملا تھا۔ جس میں اس نے بہت سی نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا..... اخباروں میں بھی اس کے بارے میں بہت تبصرے شائع ہو رہے تھے ایک دو اخبار والوں نے تو انٹرویو کے لیے اس سے ٹائم لے لیا تھا اور عمیر اس کام میں آگے آگے تھا۔ اس کے اخبار نے جتنی کوریج اس کو دی تھی اس کی وجہ سے تو وہ خود کو کوئی اور مخلوق سمجھنے لگا تھا..... اس کی ایک ہی ڈاکومنٹری اتنی کامیاب ہو گی اس کو یقین نہ تھا..... اب اس نے سفر نامے کو مرتب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے سامنے ایک وسیع میدان ہے جس کو اسے سر کرنا تھا..... اتنے بحران سے گزرنے کے بعد اب اس کو منزل کی طرف قدم اٹھانے کا موقع ملا تھا..... اب جو منزل کی نشاندہی ہوئی تھی..... تو وہ مطمئن سا نظر آنے لگا.....کبھی جو وہ خود پر نادم ہوا کرتا تھا اپنی ذات کے بارے میں پر اعتماد ہو گیا.....کبھی وہ کسی کے سامنے لب کھولنے سے گریز کرتا تھا اب بہت یقین اور اعتماد کے ساتھ انٹرویو دینے لگا.....لیکن ایسے لمحوں میں پرانی یادیں پھر جھنجھوڑتیں۔ کبھی ضحیٰ یاد آنے لگی تو کبھی ندا کا چہرہ سامنے آ جاتا۔ پرانی یادوں کے ساتھ ساتھ وہ مستقبل کی خوش آئند راہوں کی جانب قدم بڑھا رہا تھا..... اور اس سفر میں فریدی صاحب کی دعائیں بھی اس کے ساتھ تھیں..... اور عمیر کی مدد بھی.....

''عمیر.....کبھی کبھی میں سوچتا ہوں..... اگر تم نہ آتے تو میری زندگی اسی بند کمرے کی نذر ہو جاتی.....تم میرے لیے کتنی بڑی نعمت ثابت ہوئے ہو.....'' حسن نے عمیر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''بس یار..... یہ تو انسان کی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ باقی بات وسیلے کی ہے.....

اور مجھے خوشی ہے کہ خدا نے مجھے تمہارے لیے وسیلہ بنایا۔ یہ بھی بڑے کرم کی بات ہے کہ خدا کسی کو نیک کام کے لیے منتخب کرے۔ میں اکثر اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔''

''عمیر تم نے بھی تو ساری زندگی محرومیوں میں گزاری ہے۔ کیا تم کبھی افسردہ نہیں ہوئے.....تمہیں کبھی کسی کی کمی کا شدید احساس نہیں ہوا.....'' حسن نے حیرت سے پوچھا۔

''حسن ساری کمیاں سارے احساسات اپنی جگہ پر ہیں لیکن میں کبھی ان کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ کبھی کبھار بہت پریشان ہوتا ہوں لیکن..... پھر خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہوں..... جب انسان کچھ کر نہ سکتا ہو.....تو اس کے بارے میں بہت سوچ سوچ کر اپنے آپ کو پریشان کرنے سے فائدہ..... میں اپنی اس سوچ میں بہت پریکٹیکل ہوں اور ویسے اب تم کیا کرنا چاہتے ہو.....؟'' عمیر نے پوچھا۔

''عمیر میرا دل چاہتا ہے کہ ایک دفعہ ساری دنیا گھوموں..... کائنات کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں..... ہر ہر چیز کو..... اس کے اندر چھپے رازوں کو..... ان رازوں کے اندر چھپی مصلحتوں کو..... ان کڑیوں کو ملاؤں جو کہیں تو جا کر جڑتی ہیں.....'' وہ گہری سوچ میں ڈوب کر بولا۔

''ہاں یقیناً.....ضرور کرو جو تم چاہتے ہو.....لیکن اس کے لیے بہت ٹائم چاہئے اور سرمایہ بھی۔''

''سرمایہ کچھ تو ہے میرے پاس..... باقی بھی ہو جائے گا۔ میں اس کے بارے میں فکر مند نہیں ہوں..... اور وقت بھی بہت ہے۔'' حسن نے پُر امید لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ واقعی بہت وقت ہے.....؟'' عمیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں..... کیوں..... کیا بات ہے.....تم نے ایسا کیوں سوچا.....؟'' عمیر کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

''یونہی کہہ رہا تھا..... کیا تمہارا کوئی منتظر نہیں.....'' عمیر نے گویا اسے یاد دلایا۔

''کون.....؟'' وہ چونکا۔

''واقعی بھول چکے ہو یا پھر بھلانا چاہتے ہو.....؟''

جواباً وہ خاموش ہو گیا۔

''حسن تم..... اس کے بارے میں فیصلہ کیوں نہیں کرتے..... کیا اس کو یونہی بنا

بتائے چلے جاؤ گے...... کیا وہ خواہ مخواہ ہی انتظار کرتی رہے گی...... یونہی بے سود...... کچھ تو فیصلہ کرو۔ تم واقعی اس کے بارے میں نہیں سوچتے...... کیا بات ہے مجھے تم بتاؤ...... شاید میں کچھ تمہارے کام آسکوں......'' عمیر نے سنجیدگی سے کہا۔

''عمیر...... ہم دو الگ دنیاؤں کے لوگ ہیں...... اور جس بندھن کی تم بات کر رہے ہو...... مجھے سمجھ نہیں آ رہا...... کہ میں کیا کروں...... مجھے یوں لگتا ہے میں اس کو پابند کردوں گا...... اس کی سوچوں کو محدود کر دوں گا...... اور میں نے جب پروگرام بنایا ہے کہیں جانے کا تو واقعی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں'' حسن جھنجھلا کر بولا۔

''تم کیسی بے تکی باتیں کر رہے ہو...... بندھن مضبوط ہو تو کوئی پابندی باہر سے نہیں لگائی جاتی بلکہ انسان خود بخود پابند ہو جاتا ہے اور تم دونوں اگر ایک دوسرے کی حدود کو سمجھو گے تو ہر سفر آسان ہو جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ کوئی فیصلہ کر کے جاؤ...... ابھی کچھ دن ہیں تمہارے پاس، خوب سوچ سمجھ لو......'' عمیر یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ سوچنے لگا...... بہت زیادہ سوچیں...... نجانے کس کس کے بارے میں کیا کرے، کیا نہ کرے...... وہ سوچتا رہا...... اس سفر کے بارے میں...... جو اس کو طے کرنا تھا...... ان مسافتوں کے بارے میں جن کا اسے مسافر بننا تھا...... آدھی رات گزر چکی تھی جب عمیر واپس آیا اور آتے ہی وہ سو گیا۔

دوسرے دن وہ علی الصبح تیار کھڑا تھا...... سامان ہاتھ میں لیے۔

''عمیر میں جا رہا ہوں......'' وہ اسے نیند سے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''کہاں......؟'' عمیر نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔

''جہاں تم کہتے ہو......'' حسن سنجیدگی سے بولا۔

''اچھا......'' وہ بے دلی سے بولا اور پھر سو گیا۔

''اٹھو نا...... سنو تو سہی...... میں قندیل کے پاس جا رہا ہوں۔''

عمیر نے ایک دم آنکھیں کھول دیں......

''مبارک ہو جانا...... اور سفر کرنا...... مجھے معلوم ہے تم نے فیصلہ ٹھیک ہی کیا ہوگا...... میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔'' وہ خوشی سے بولا۔

سارے دن کی مسافت کے بعد جب وہ اس کے گھر پہنچا تو وہ سو رہی تھی......

شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل رہا تھا...... ڈیڈی کسی کام کے سلسلے میں باہر گئے تھے...... وہ اچانک اس کو دیکھ کر حیران رہ گئی......

''حسن تم یہاں......؟'' وہ چونک کر بولی۔

''کیا امید نہیں تھی......؟''

''شاید نہیں......''

''قندیل کیا تم میرا انتظار کر سکو گی......؟''

''تم کہاں جا رہے ہو......؟''

''سفر پر......''

''کون سے سفر پر......؟''

''بہت مشکل اور کٹھن...... مگر واپسی کا وعدہ کر کے جا رہا ہوں تو ضرور آؤں گا۔''

وہ مصمم ارادے سے بولا۔

''حسن میں صرف یہ پوچھنا چاہوں گی کہ ہم کس نقطے پر متحد ہوئے ہیں تاکہ مجھے اس کی بنیاد کا پتہ چل سکے...... اور میں بھی اس کے بارے میں سوچ سکوں......''

''انتہائے عشق......'' اس نے ایک گہری نگاہ اس کی جانب ڈال کر کہا۔

''سوچ لو...... یہ منزل بہت کٹھن اور مشکل ہے'' وہ حیرت سے بولی۔

''ناممکن تو نہیں......''

''گر بھی سکتے ہیں اور پھسل بھی......''

''گر کر اٹھتے بھی تو لوگ ہی ہیں نا''

''فنا بھی ہو سکتے ہیں......''

''بقا کے لیے فنا بھی ضروری ہے......''

''میں انتظار کروں گی...... زندگی کی آخری سانسوں تک...... ان لفظوں سے نکلتی مہک اور تمہارے وعدے کے سنگ جیوں گی......'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''اب میں چلتا ہوں......''

''رکو گے نہیں......''

''نہیں سفر بہت طویل ہے...... اور کٹھن بھی...... کائنات میں چھپی ذات سے

آشنائی کا سفر'' وہ بیگ اٹھائے خاموشی سے باہر نکلنے لگا۔

''میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گی...... دل کی گہرائیوں سے...... تمام نیک جذبوں اور ان کی شدت کے ساتھ......'' وہ مسکرا کر بولی۔

جواباً وہ بھی مسکرایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل آیا۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں یہ سفر میسر آتا ہے...... قابل عزت ہیں وہ جو اس راہ کے راہی بنتے ہیں...... مبارک ہیں وہ جن پر وجدان کے دروازے کھلتے ہیں...... اور جو شعور سے آگہی حاصل کرتے ہیں...... خوش نصیب ہیں جو اس راز کو پالیتے ہیں کہ خدا انسان میں ہے اور انسان خدا میں ہے...... جو کائنات کے ساتھ کڑیاں ملا کر مثلث مکمل کر لیتے ہیں...... جو زمین کے ذرّوں سے آسمان کی لامحدود وسعتوں تک سفر مکمل کرتے ہیں...... سلامتی ہو ان پر جن پر کائنات بھی فخر کرتی ہے اور جن پر خدا بھی نازاں ہوتا ہے اور راضی بھی...... فلاح پاتے ہیں وہ جو نفوس کو پاک کرتے ہیں...... اور جن پر ملائکہ سلامتی بھیجتے ہیں۔ ضحیٰ اس کے سامنے تھی پر وقار شخصیت لیے۔ مسکراتی ہوئی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

قندیل کے لبوں پر مسکراہٹ سی چھینکنے لگی۔

......❁......

حواشی

۱۔ یونانی دیوتا، موسیقی، گیت و نغمگی اور مردانہ وجاہت کا مکمل شاہکار، زیوس اور لیٹو کا بیٹا۔

۲۔ یونانی دیوتاؤں میں سب سے بڑا دیوتا، رومن جو پیٹر (Jupiter) کے مترادف، جو تمام دیو مالائی نظام کو کنٹرول کرتا تھا۔

۳۔ زیوس کی ملکہ جو Delos (تیرتا ہوا جزیرہ) پر حکمرانی کرتے تھے وہاں لیٹو نے اپالو اور آرٹیمس دو جڑواں بچوں کو جنم دیا۔

۴۔ محبت اور خوبصورتی کی دیوی۔

۵۔ چاند کی دیوی۔

۶۔ دیوی ڈیانا کا ایک اور نام جو اس کی جائے پیدائش سینتھس سے منسوب ہے۔

۷۔ دانشمندی کی رومن دیوی۔

۸۔ عقل کی یونانی دیوی۔

۹۔ چاند کی رومن دیوی، جو اپنی بے باک فطرت اور شکار کے شوق کے لیے مشہور تھی۔

۱۰۔ ایک بادشاہ جو جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتا وہ سونے کی ہو جاتی۔

۱۱۔ ہیسپریس کی خوبصورت بیٹی جن کے باغات سونے کے سیبوں کے لیے مشہور تھے۔

۱۲۔ ایک عورت جو اپنی برق رفتاری کی وجہ سے مشہور تھی۔

۱۳۔ رات کی دیوی، (انتشار کی بیٹی)۔

۱۴۔ تاریکی کا یونانی دیوتا۔

۱۵۔ صبح کی یونانی دیوی۔

۱۶۔ 1862ء میں تمام اخلاقی و مذہبی ضابطوں کو مسترد کر کے سائنس، مادیت اور انقلابات پر زور دیا گیا اور اس عقیدے کو اپنایا گیا کہ کچھ بھی حقیقی طور پر موجود نہیں۔

۱۷۔ اس فلسفہ کے حامی لوگوں نے انسانی وجود کی ''بقا'' پر انتہائی زور دیا۔ ان کے نزدیک انسان آزاد ہے اور یہ دنیا ایک بے معنی اور خطرناک تھیٹر ہے۔ اس لیے کسی بھی قسم کی مقصدیت اور خدا کے بغیر، انسان اس دنیا میں اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں اس لیے انسان کو اپنے

وجود کی بقا کے لیے اس دنیا میں بہتر اشیاء کا انتخاب کرنا چاہئے۔

۱۸۔ فرانسیسی ناول نگار (1840-1952ء)

۱۹۔ ایسا فلسفہ یا نظریات جو ان تمام توجیہات کی تردید کرتے ہیں جن کی بنیاد قدرتی وجوہات اور قوانین پر نہیں ہوتی۔

۲۰۔ اٹلی کی نیشنلسٹ اور اینٹی کمیونسٹ تحریک کا بنیادی نظریہ جس میں سیاسی نظام کی انتہائی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور ایسے رویوں پر جو مضبوط مرکزی قوت کی حمایت کرتے ہیں اور جس میں آزادیٔ اظہار رائے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

۲۱۔ ایسا سیاسی معاشرتی نظریہ جس میں ملک کی زمین، اس کے ذرائع، قدرتی وسائل اور تمام بڑی صنعتوں پر حکومت کا کنٹرول ہونا چاہیے اور تمام دولت لوگوں میں مساویانہ تقسیم ہونی چاہیے۔

۲۲۔ ایسا معاشی و معاشرتی نظام جس میں ریاست تمام ذرائع پیداوار اپنے کنٹرول میں رکھتی ہے اس کا مقصد ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہے جس میں ہر ایک کو اس کے کام اور صلاحیتوں کے مطابق ادائیگی کی جائے۔

۲۳۔ کارل مارکس (1818-83) کے اخذ کردہ سیاسی و معاشی نظریات جس میں ریاست ذرائع پیداوار کو کنٹرول کرے اور بغیر کسی طبقے و کلاس کے معاشرہ تشکیل دے۔

۲۴۔ ایسا فلسفیانہ نظام جو Middle Ages میں یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا تھا جس کی بنیاد مذہبی عقائد پر تھی اور مذہبی عقائد کو منطقی طور پر بیان کیا جاتا تھا۔

۲۵۔ فلسفہ کہ انسان کے وجود کی اٹل حقیقت ہے اور اسی کی فکر کرنی چاہیے۔

۲۶۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں امریکی دانشوروں اور مصنفین نے انسانی ذہن کی الہامی اور پر اسرار صلاحیت پر بہت زور دیا اور کسی انتہائی ارفع و اعلیٰ سلطنت کے وجود کو ممکن قرار دیا جو حواس کی دنیا سے بہت دور ہے۔

۞......۞......۞